جرائم اور مجرم

متضاد نظریات کی روشنی میں

رشید ملک

MashalBooks.org

مشعل
آر بی 5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور 54600، پاکستان

جرائم اور مجرم

رشید ملک

کاپی رائٹ(c)-2000 مشعل

MashalBooks.org

خواجہ حارث احمد

ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

کے نام

جن کی اعانت کے بغیر یہ مرحلہ سر نہیں ہو سکتا

MashalBooks.org

ہم سب جرائم کے شکار ہیں۔ کہیں بھی جائیں، کچھ بھی خریدیں، اپنے بچوں کی کیسی ہی تربیت کریں، ہم ہر وقت جرائم سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ شدید جرائم کا بھوت اور یہ احساس کہ ہم پر بغیر کسی اطلاع کے اچانک حملہ ہوسکتا ہے، ہمیں اپاہج کیا جاسکتا ہے، لوٹا جاسکتا ہے یا قتل کیا جاسکتا ہے، ہمارے شعور پر سوار رہتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر وقت مجرموں کی موجودگی نے یہاں غریب لوگوں کو غریب تر اور امیروں کو دہشت زدہ بنادیا ہے۔ ان کی آزادی سلب کرلی ہے، انہیں خوف میں مبتلا کردیا ہے اور وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے۔

MashalBooks.org

ترتیب

جواز 7
تعارف 13
نظریاتی مباحث 17
علم جرمیات 18
علم جرمیات کا ارتقا 39
مزید مباحث 102
ابتدائیہ 103
جرائم کی وجوہات 104
طرز زندگی۔استحصال 115
حیاتیاتی عوامل 120
ضابطہ اخلاق کی کمزوری 130
تھرل کی جستجو 137
نتیجہ 139
سزائیں 142
ابتدائیہ 143
جیل میں سزا بھگتنا ضروری ہے 144
جیلوں کا متبادل 150
انسداد 170

MashalBooks.org

جرائم میں خوف کا عنصر	171
جیل بھیجنا علاج نہیں	177
بے روزگاری اور جرائم	187
ہماری پولیس	198
کتابیات	

MashalBooks.org

جواز

MashalBooks.org

یہ میری تربیت کا دوسرا سال تھا اور میں ضلع کی تربیت(District Training) حاصل کرر ہا تھا۔ میرا ایس پی نجف خاں تھا جو سب انسپکٹر یا انسپکٹر کے عہدے سے ترقی پا کر ایس پی بن گیا تھا۔ جب میں مشرقی بنگال سے ایک سال کی ٹریننگ لے کر واپس لوٹا تو اس وقت کے انسپکٹر جنرل پولیس قربان علی خاں سے ملاقات کے دوران درخواست کی کہ مجھے ضلع کی ٹریننگ کے لیے کسی اچھے ایس پی کے ماتحت تعینات کر دیا جائے تاکہ میں پولیس کے کام سے اچھی طرح واقف ہو جاؤں۔ چنانچہ مجھے راولپنڈی میں ایس پی نجف خان کے ماتحت تعینات کر دیا گیا۔ اس وقت تو نہیں لیکن بعد میں بلکہ بہت دیر کے بعد مجھ پر یہ راز کھلا کہ جناب نجف خاں صاحب قربان علی خاں کے کتنے قریب تھے۔ قربان علی خاں، نجف خان کو بڑا قابل ایس پی خیال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ڈی آئی جی جناب ایس این عالم کا تبادلہ ہوا تو کوئی نیا ڈی آئی جی راولپنڈی رینج میں تعینات نہ ہوا اور جناب نجف خاں کو ہی ڈی آئی جی کا کام کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ جب نوزائیدہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ پیش آیا تو اس وقت نجف خاں راولپنڈی ضلع کے ایس پی کے ساتھ ساتھ راولپنڈی رینج کے ڈی آئی جی کا عہدہ بھی سنبھالے ہوئے تھے۔

16 اکتوبر 1951ء کو مجھے حکم ملا کہ میں وزیراعظم پاکستان جناب لیاقت علی خان کو سرکٹ ہاؤس سے پائلٹ کر کے کمپنی باغ لاؤں جہاں انہیں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ جب میں وزیراعظم کو کمپنی باغ لے کر پہنچا تو جلسہ گاہ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ سٹیج کے بائیں طرف شہر کی مسلم لیگ کے قائدین کرسیوں پر براجمان تھے۔ ایس پی صاحب سٹیج کے پچھلے دائیں کونے پر

موجود تھے اور مسلح تھے۔ سٹیج کے دونوں طرف پولیس کے مسلح گارڈ جلسہ گاہ کی طرف منہ کر کے کھڑے تھے۔ میں نے ایس پی سے پوچھا کہ وزیراعظم کے سٹیج پر پہنچ جانے کے بعد میرے لیے مزید کیا حکم ہے۔ ایس پی نے دور جلسہ گاہ کے بائیں کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہاں لوگ زیادہ ہیں اس لیے وہاں چلے جاؤ اور دیکھو کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ جب میں سٹیج سے روانہ ہوا تو اس وقت جلسے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی اور راولپنڈی شہر کی مسلم لیگ کے صدر سپاس نامہ پیش کر رہے تھے۔ تقریباً 50 یا 60 قدم چل کر میں اپنے مقام پر پہنچ کر دائیں ہاتھ کو مڑا۔ اس وقت میں نے سنا کہ مسلم لیگ کے صدر فرما رہے تھے ''اوپر اللہ تعالیٰ ہے اور نیچے آپ ہیں۔ آپ کے حکم پر ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔'' میرے ذہن میں خیال آیا کہ سیاسی قوت بھی کیا چیز ہے۔ کہاں خداوند تعالیٰ اور کہاں ہم اس کے حقیر بندے۔ دونوں کا نام ایک ہی سانس میں لیا جا رہا ہے۔ خیر ان کی تقریر ختم ہوئی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا کہ سٹیج سے دور ہو کر میں آرام سے سگریٹ پی سکتا ہوں۔ ابھی میں سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں وزیراعظم کی آواز گونجی ''برادران ملت'' اور ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں نے خیال کیا کہ اس علاقے میں خوشی منانے اور خوش آمدید کہنے کا یہی طریقہ ہے، اس لیے کسی نے خوشی میں گولی چلائی ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی گولی کی دوسری آواز آئی۔ اب خیال گزرا کہ راولپنڈی سازش کیس میں کئی فوجی پکڑے گئے ہیں۔ شاید اس وجہ سے کوئی گڑبڑ کر رہا ہو۔ میں واپس سٹیج کی طرف مڑا۔ اس وقت دھڑا دھڑ گولیاں چل رہی تھیں۔ اب میں نے دیکھا کہ مسلم لیگ کے قائدین جلسہ گاہ سے بھاگ رہے ہیں۔ ساتھ ہی باقی لوگ بھی بھاگ رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں کو روکنا ضروری ہے تا کہ تفتیش کے دوران ان سے پوچھ گچھ کی جا سکے۔ چنانچہ میں نے اپنا پستول نکالا اور زور سے کہا ''اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں گولی چلا دوں گا۔'' لیکن میری دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ لوگ جو خون کا آخری قطرہ بہانے کے لیے تیار تھے، گھٹنوں اور پیٹ کے بل رینگتے ہوئے۔ یا جھکے جھکے اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ اس دوران میں نے سٹیج کی طرف دیکھا تو سبز وردیوں میں ملبوس مسلم لیگ کے گارڈ برچھیوں سے کسی شخص کو مار رہے تھے۔ میں تیزی سے سٹیج کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں عجیب منظر تھا۔ سٹیج پر انگریز ڈپٹی کمشنر ہارڈی بیٹھے تھے جنھوں نے وزیراعظم کا سر اپنی گود میں لیا ہوا تھا

MashalBooks.org

اور ساتھ ہی وزیراعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں پریشانی اور بے بسی کے عالم میں تھے۔ جلسہ گاہ خالی ہوچکی تھی۔ پولیس والے گولیاں چلاکر تتر بتر ہو چکے تھے اور ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ چند سپاہی ادھر ادھر موجود تھے لیکن حیران اور پریشان۔ سیکرٹری نے مجھے دیکھ کر کہا فوراً گاڑی کا انتظام کرو۔ لیکن جلسہ گاہ کے قریب کوئی گاڑی نہیں تھی۔ میں اسی گومگو کے عالم میں تھا کہ سارجنٹ بلنٹ نظر آیا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اس سے گاڑی کا انتظام کرنے کو کہا۔ چند منٹ لگے ہوں گے کہ بلنٹ ایک بڑی سی کار لے کر سٹیج کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں پر موجود چند لوگوں نے وزیراعظم کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ ہارڈی اور وزیراعظم کا پرائیویٹ سیکرٹری اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اتنے میں جناب مشتاق احمد گرمانی بھی وہاں پہنچ گئے اور گاڑی میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ چونکہ گاڑی میں جگہ نہیں تھی اور گرمانی صاحب قدرے فربہ اندام تھے اس لیے وہ اندر داخل نہیں ہو پا رہے تھے۔ میں پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ میں نے دھکیل کر ان کو گاڑی کے اندر کیا اور گاڑی سی ایم ایچ روانہ ہوگئی۔ اس وقت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وزیراعظم زندہ ہیں کہ نہیں۔ قیاس آرائیاں تھیں کہ وہ زخمی ہیں اور جاں بر ہو جائیں گے۔

وزیراعظم کی گاڑی روانہ کرنے کے بعد میں نے ادھر ادھر دیکھا تو مجھے سٹیج سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ایس پی نجف خاں نظر آئے۔ میں ان کے پاس پہنچا اور بتایا کہ میں نے وزیراعظم کو سی ایم ایچ روانہ کر دیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا ''اس حرام زادے کو بھی تو لے جاؤ۔'' ان کا اشارہ قاتل کی لاش کی طرف تھا۔ شاید انہوں نے مزید یہ ہدایت دی ہو کہ میں وہ لاش پولیس لائنیز لے جا کر کوارٹر گارڈ میں رکھوا دوں۔ لیکن مجھے یاد نہیں۔ تاہم میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایسا اپنے ایس پی کی ہدایت پر کیا۔

میں نے پولیس کی گاڑی منگوائی اور سٹیج کے قریب پڑی لاش اٹھوا کر اس میں ڈالی اور پولیس لائنیز لے گیا۔ لائنیز افسر سے لاش کو کوارٹر گارڈ میں رکھنے کے لیے کہا اور پہرہ سخت کرنے کا حکم دیا۔

جب میں اس کام سے فارغ ہو گیا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب میں کیا کروں کیونکہ مجھے کوئی مزید ہدایت نہیں دی گئی تھی۔ چنانچہ میں کالج روڈ پر اپنے گھر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد خیال آیا کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ معلوم کرنا چاہیے کہ آئندہ لائحہ عمل

MashalBooks.org

کیا ہوگا اور اس میں میرا کردار کیا ہوگا۔ یعنی تفتیش کے دوران مجھے کیا کہنا ہے۔ اس خیال سے میں ایس پی صاحب کے بنگلے پر پہنچا۔ وہاں ان کے ڈرائنگ روم میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کا نوٹس لیے بغیر جناب نجف خان سے پوچھا کہ تفتیش کے دوران مجھے کیا کہنا ہے؟ ان کا سادہ سا جواب تھا ''جب وقت آئے گا تو بتا دیا جائے گا۔'' چنانچہ میں وہاں سے لوٹا اور گھر چلا آیا۔ لیکن مجھے پھر گھر سے بلایا گیا اور یہ خدمت سونپی گئی کہ جو لیڈر یا افسر باہر سے راولپنڈی پہنچ رہے ہیں انہیں پائلٹ کر کے سی ایم ایچ لے جاؤں۔ میں اس کام میں شام تک مصروف رہا۔ اسی دوران معلوم ہو چکا تھا کہ وزیر اعظم پاکستان انتقال کر گئے ہیں۔

یہ 16 اگست 1951ء کا واقعہ ہے۔ میں نیا نیا پولیس افسر بنا تھا، لیکن آج تک میرے ذہن میں کئی سوالات کلبلا رہے ہیں۔

جب وزیر اعظم کو گولی لگی تو جناب نجف خاں کہاں تھے؟ اگر وہ سٹیج کے پاس ہی تھے تو اس وقت وہ نظر کیوں نہیں آئے جب ہارڈی اور وزیر اعظم کے پرائیویٹ سیکریٹری سراسیمگی اور بے بسی کے عالم میں سٹیج پر بیٹھے تھے؟

اگر وہ سٹیج کے قریب موجود تھے اور انہوں نے قاتل کو گولی چلاتے ہوئے دیکھا تھا تو اس وقت انہوں نے کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟

اگر وہ سٹیج کے قریب موجود نہیں تھے تو پھر کہاں تھے اور کس وقت اور کیوں وہ سٹیج سے ہٹ گئے تھے؟ جبکہ وزیر اعظم کی حفاظت کی ساری ذمہ داری پولیس کی تھی جس کے وہ ایس پی بھی تھے اور ڈی آئی جی کا کام بھی سنبھالے ہوئے تھے؟

پھر وہ اس واقعے کے بعد اتنی دور کیوں چلے گئے تھے؟ کیا انہیں اپنی جان کا خطرہ تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر وہ کوئی اچھے پولیس افسر نہیں تھے۔

وزیر اعظم کا قتل، ساتھ ہی ان کے قاتل کا قتل، نہایت سنگین واردات تھی۔ وزیر اعظم کی حفاظت کے سلسلے میں پولیس بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کسی بھی پولیس افسر کے خلاف کوئی محکمانہ کارروائی نہیں ہوئی اور نہ کسی کو اس سارے واقعے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس کے برعکس نجف خاں کو ترقی ملی اور وہ ڈی آئی جی ہو کر ریٹائر ہوئے۔

قاتل سید اکبر تھا جو ہزارہ پولیس کی نگرانی میں تھا اور راولپنڈی کی پولیس بھی اس کی نگرانی

MashalBooks.org

کرتی تھی کیونکہ وہ کارتوس خریدنے کے لیے اکثر راولپنڈی آیا جایا کرتا تھا۔

وہ جلسہ گاہ میں کیسے پہنچا اور اسے سٹیج کے اتنے قریب بیٹھنے کی اجازت کیوں دی گئی؟

یہ کیسا اتفاق ہے کہ اس شخص کی پیٹھ کے عین پیچھے دو مسلح پولیس افسر موجود تھے جن کے سامنے اس کے وزیراعظم پر گولیاں چلائیں۔ پھر پولیس نے اس دبلے پتلے شخص کو قتل کر دیا حالانکہ اس پر آسانی سے دو آدمی قابو پا سکتے تھے کیونکہ وہ تقریباً نہتا ہو چکا تھا اس کے پستول کی تیسری گولی کا خول پستول کے چیمبر میں پھنس گیا تھا۔ تفتیش کے لیے اس کا زندہ پکڑا جانا اشد ضروری تھا۔ اسے کیوں قتل کیا گیا؟ وہ دونوں افسر یعنی سب انسپکٹر محمد شاہ اور سی آئی ڈی کا حلقہ افسر انسپکٹر شیخ ابرار واقعے کے بعد جلسہ گاہ میں کیوں نظر نہیں آئے؟ سید اکبر کے مرنے کے بعد انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ سٹیج پر پڑے وزیراعظم کی مدد کے لیے کیوں نہ پہنچے اور تتر بتر کیوں ہو گئے؟ ان میں محمد شاہ تو بطور سب انسپکٹر ہی ریٹائر ہوا اور شیخ ابرار ترقی کر کے ایس پی کے عہدے تک پہنچے اور شاید ابھی تک حیات ہیں۔ اس وقت ان کے خلاف قتل کا مقدمہ چلنا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیوں؟

سید اکبر کو قتل کر کے جلسہ گاہ سے ان کا غائب ہو جانا بڑی معنی خیز بات ہے۔

واقعے کے بعد ایس پی نجف خان سٹیج سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر پائے گئے۔ کیا انہوں نے وزیراعظم کو قتل ہوتے دیکھا اور پھر وہاں سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ نکلے؟ اگر ایسا ہے تو وہ پولیس میں رہنے کے قابل نہیں تھے اور ان کے خلاف محکمانہ کارروائی کے بعد انہیں پولیس سے نکال دینا چاہیے تھا۔

اور اگر وہ وزیراعظم کو گولی لگنے سے پہلے موقع سے ہٹ گئے تھے تو اس کی وجہ کیا تھی؟ اور پھر انہیں کیسے معلوم ہوا کہ قاتل بھی مر گیا ہے اور اس کی لاش ٹھکانے لگانی چاہیے؟ انہوں نے مجھ سے کیسے کہہ دیا کہ ''اس حرام زادے کو بھی تو وہاں سے لے جاؤ''۔ کیا وہ سید اکبر کو جانتے تھے اور اگر ایسا ہے تو انہوں نے اسے جلسہ گاہ میں آنے سے روکا کیوں نہیں اور سٹیج کے اتنے قریب بیٹھنے کیوں دیا؟

اور پھر سب سے اہم ترین سوال یہ ہے کہ ہارڈی اور پرائیویٹ سیکریٹری کے بعد اس واقعے کا تیسرا چشم دید گواہ میں تھا۔ مجھے شامل تفتیش کیوں نہیں کیا گیا اور میرا بیان کیوں نہیں لیا گیا؟ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس واقعے میں ملوث سارے صوبائی افسر تھے۔ تفتیش کے لیے بھی ایک ڈی ایس پی کو قصور سے بلایا گیا تھا۔ یہ بھی معنی خیز بات ہے کہ وزیراعظم کے قتل کے

MashalBooks.org

چوبیس گھنٹے کے بعد آئی جی قربان علی خاں موقع پر پہنچے۔ وہ پہلے کیوں نہیں آئے؟ جبکہ محکمہ پولیس کے سارے وسائل انہیں میسر تھے۔ پھر عام قتل پر تو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ متعلقہ علاقے کا گزٹیڈ افسر جلدی سے جلدی موقعہ پر پہنچ کر تفتیش کی نگرانی شروع کر دیتا ہے، یہاں تو ملک کا وزیر اعظم قتل ہو گیا تھا اور پورا ملک لرز گیا تھا لیکن آئی جی کو موقعہ پر پہنچے میں چوبیس گھنٹے لگے؟

یہ ہیں وہ سوالات جن پر اس وقت تو میرا ذہن نہیں گیا تھا کہ میں کم عمر تھا اور نیا نیا پولیس میں آیا تھا، لیکن عمر کی پختگی اور ملک کے اندر پیش آنے والے پیچ در پیچ سیاسی حالات و واقعات کے ساتھ ان سوالوں نے میرے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا کئے رکھا اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ یہی سوالات اس کتاب کے محرک اور جواز بنے ہیں۔

رشید ملک......لاہور

MashalBooks.org

تعارف

جرمیات نسبتاً ایک نیا علم ہے۔ اس کا مقصد جرائم کی وجوہ تلاش کرنا اور ان کے تجزیے اور تحلیل کے بعد انسدادی تدابیر تجویز کرنا ہے اور ساتھ ہی مجرموں کی اصلاح کے لیے اور انہیں معاشرے کا ایک مفید رکن بنانے کے لئے اقدامات تجویز کرنا ہے۔

جرم مذہب اور اخلاقیات اور فلسفے کا موضوع بھی رہا ہے لیکن ان علوم کی نظر جرائم کی سائنسی وجوہات کی طرف نہیں گئی۔ ابتدا میں جرم کی وجوہات کو اقتصادیات میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس تحریک کا سربراہ ایک اطالوی دانشور تھا جس کی کتاب نے پورے یورپ میں دھماکہ کر دیا۔ اس کے خیالات کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اس کے حامیوں نے چونکہ سائنسی طریق کار نہیں اپنایا تھا اس لئے اسے کلاسیکی مکتب فکر کا نام دیا گیا۔ اس کے بعد نفسیات کے ماہرین نے اس علم کو موضوع گفتگو بنایا۔ اس نظریے کا مبلغ ایک دوسرا اطالوی دانش ور لومبراسو تھا۔ اس نے پیدائشی مجرم کا تصور پیش کیا لیکن اس موضوع پر بڑھتی ہوئی تحقیق نے اسے پسپائی پر مجبور کر دیا اور اسے کہنا پڑا کہ مجرموں میں سے ایک تہائی پیدائشی مجرم ہوتے ہیں اور دوسرے دیگر محرکات کی بنا پر جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں چونکہ اس مکتب فکر کا طریق کار سائنسی تھا اس لئے اسے پوزیٹوسٹ (Positivist) سکول کا نام دیا گیا۔

اس اثنا میں دوسرے معاشرتی علوم بھی بالغ ہو چکے تھے چنانچہ انہوں نے بھی علم جرمیات میں وافر حصہ ڈالا۔ قانون کے ماہرین اور فلسفی حضرات نے اس موضوع پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ 1967ء تک یہ علم منتشر صورت میں رہا اور ماہرین اپنے آپ کو اس علم سے وابستہ

کرنے سے کتراتے رہے۔ جرمیات کے متعلق جرائد، بین الاقوامی کانفرنسوں، مزید تحقیق اور بڑھتے ہوئے جرائم کی بنا پر ماہرین جرمیات نے اپنا مقام پیدا کرلیا۔ چنانچہ یہ کلیہ قائم ہوا کہ جرم بھی معاشرے کا ایک تفاعل ہے اور معاشرے کی اقدار، اعمال، اقتصادیات، نفسیات سب اس معاشرے کے جرائم میں منعکس ہوتے ہیں۔

کافی عرصے تک جرم کو غریب طبقوں اور اجنبیوں کی سرگرمی سمجھا جاتا رہا لیکن تیس کی دہائی میں امریکی ماہر جرمیات سدرلینڈ(Sutherland) نے وائٹ کالر جرم (White collar crime) کا تصور پیش کر کے ایک دھماکہ کردیا۔ ایسے جرائم میں کسی بھی معاشرے کا تاجر اور صنعت کار طبقہ، سرکاری ملازمین، بنک کار، انشورنس سے وابستہ لوگ، حصص کا کاروبار کرنے والے یعنی معاشرے کے امیر طبقے کے غیر قانونی افعال شامل ہوگئے۔ جرم کے اس تصور نے ماہرین کو جرم کو نئی روشنی میں دیکھنے پر مجبور کردیا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جرم دوسرے اعمال کی طرح معاشرے ہی کا ایک عمل ہے اور معاشرے کا جزو لاینفک ہے۔

دوسرے علوم کی طرح علم جرمیات کے بھی کئی حصے ہیں۔ ابتدا جرائم اور مجرم سے ہوتی ہے۔ اس حصے میں جرم کا تصور، جرائم کی وجوہات اور مجرم کی شخصیت زیر بحث آتے ہیں۔ دوسرے حصے کا تعلق معاشرے کے نظام عدل سے ہے جس میں پولیس اور عدالتیں شامل ہیں۔ تیسرے حصے کی توجہ مجرم کی اصلاح اور اسے معاشرے کا ایک کارآمد رکن بنانے پر مرکوز ہوتی ہے۔ اس میں نظام تعزیرات، جیلیں اور مجرم سے سلوک وغیرہ شامل ہیں۔

یہ کتاب اس علم کے صرف پہلے حصے پر مشتمل ہے، اگرچہ اس میں پولیس، نظام عدل، تعزیرات بھی جستہ جستہ زیر بحث آئے ہیں۔ اس حصے میں جرائم کے تصورات اور ان کی وجوہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں اس علم کے دیگر موضوعات پر باہم متصادم نظریات پیش کئے گئے ہیں۔

جرائم ہر معاشرے کا حصہ ہیں۔ ہر معاشرے میں جرم ہوتا ہے، کہیں کم اور کہیں زیادہ، اور ہر معاشرے میں مجرم موجود ہوتے ہیں۔ ان میں پیشہ ور مجرم بھی ہوتے ہیں، کبھی کبھار ضرورت کے تحت جرم کرنے والے مجرم بھی ہوتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو موقعہ ملنے پر جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان مجرموں میں نابالغ بچے، بالغ لوگ اور عمر رسیدہ لوگ بھی ہوتے ہیں۔

MashalBooks.org

لیکن اس موضوع پر سب سے زیادہ کام امریکہ میں ہوا۔اس ملک کی شرح جرائم بلند ترین ہے بلکہ یہ کہنا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ وہ معاشرہ ہی مجرم معاشرہ ہے۔ دانشوروں اور ماہرین نے وہاں کے جرائم کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں ان کے خیالات وتصورات بکثرت نظر آئیں گے۔ برطانیہ میں بھی شرح جرائم کافی بلند ہے۔ وہاں کے ماہرین نے بھی اس موضوع پر کافی کام کیا ہے۔ یہ کتاب اگر چہ سراسر نظریاتی ہے تاہم ضرورت پڑنے پر انہی دوممالک کے اعداد وشمار پر انحصار کیا گیا ہے۔ دوسرے ممالک کے اعداد وشمار آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے اور ہمارے لئے ان ممالک کی زبانیں بڑی رکاوٹ ہیں اس لئے جو کچھ انگریزی میں دستیاب ہوتا ہے پہلے اسی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان کے جرائم کے اعداد وشمار آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔حکومت بوجوہ ان کو شائع کرنے سے کتراتی ہے۔علم جرمیات بھی اس ملک میں پوری طرح رائج نہیں۔اردو زبان میں اس موضوع پر شاید ہی کوئی کتاب نظر آئے۔تاہم پاکستان کے جرائم کی اپنی خصوصیات ہیں۔ فرقہ پرستی،نسل پرستی،کاروکاری وغیرہ جو دوسرے ممالک کے جرائم میں نظر نہیں آتے یہ پاکستان سے ہی مخصوص ہیں اوران پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اُمید ہے کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے جن کا تعلق براہ راست جرائم سے ہے، جیسے پولیس،عدالتیں اور انتظامیہ کے لئے مفید ثابت ہوگی۔اس سے جرائم اور مجرم کے متعلق صدیوں پرانے خیالات کو تبدیل کرنے میں کافی مدد ملے گی۔عام آدمی جس میں اس کتاب کا قاری بھی شامل ہے، جرائم سے متاثر ہوتا ہے اور اسے بھی جرائم کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ جرائم کی قیمت معاشرہ ہی ادا کرتا ہے اس لئے یہ کتاب عام آدمی کے لئے بھی مفید ہو سکتی ہے۔

اس کتاب کی حیثیت جرائم اور مجرموں کے متعلق ایک ابتدائی تعارف کی ہے۔ آگے
''ہمت کو شناوری مبارک...... پیدا نہیں بحر کا کنارہ''

راقم کو اس کتاب میں پیش کئے گئے خیالات،تصورات اور نظریات کی ایجاد کا کوئی دعویٰ نہیں۔ یہ سب مختلف مصنفین سے مستعار لئے گئے ہیں اور قاری کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔

دیگر مصنفین کے علاوہ راقم ڈاکٹر مبارک علی، جناب مسعود کھدر پوش کی ہاری کمشن رپورٹ

MashalBooks.org

سے ان کے اختلافی نوٹ اور اپنے ہمدم دیرینہ اور رفیق کار جناب ایم۔اے۔ کے چوہدری کی کتاب ''پولیسنگ ان پاکستان'' (Policing in Pakistan) وین گارڈ، لاہور 1997ء سے استفادے کے لئے تہہ دل سے مشکور ہے۔

MashalBooks.org

نظریاتی مباحث

جرم

جرمیات کا ارتقا

پاکستان میں جرائم کے خاص پہلو

MashalBooks.org

علم جرمیات

MashalBooks.org

علم جرمیات کا آغاز اس سوال سے ہوتا ہے کہ جرم کیا ہے؟

قانون اور جرمیات کے حوالے سے تعریف کی گرفت میں نہ آنے والا واحد لفظ جرم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے مفاہیم کا تعین اکثر قانون کے حوالے سے کیا جاتا ہے اور قانون بذات خود کوئی جامد چیز نہیں۔ ہر معاشرے کی اپنی اخلاقیات اور اپنا قانون ہوتا ہے جو کسی اور معاشرے کی اخلاقیات اور قانون سے مختلف ہوسکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بچوں سے مشقت لینا جائز سمجھا جاتا ہے لیکن مغربی معاشروں میں اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں سے کام لینا جرم ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں والدین کے ہاتھوں مار پٹائی سے بچوں کی اصلاح کوئی جرم نہیں لیکن مغربی معاشروں میں ایسا کرنا جرائم کی ذیل میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں مردوں کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے لیکن مغربی معاشروں میں یہ جرم ہے۔ سرعام بوس و کنار مغربی معاشرے میں جرم نہیں۔ رخصت ہوتے وقت اگر شوہر بیوی کا بوسہ نہیں لیتا تو وہ طلاق کے لئے عدالت کی طرف رجوع کرسکتی ہے۔ یہی فعل اگر کسی مشرقی ملک میں کیا جائے تو وہ اخلاق اور قانون کی نظر میں قابل گرفت ہے۔

معاشرہ بدلتا رہتا ہے۔ سو سال پہلے کے پنجاب کا معاشرہ اب اس حد تک بدل چکا ہے کہ اس زمانے کے لوگوں کو معاشرتی اعتبار سے موجودہ پنجاب ایک بالکل مختلف ملک نظر آئے گا۔ انیسویں صدی میں یہاں انگریز آئے اور معاشرہ بڑی تیزی سے بدلنا شروع ہوا۔ پہلے ہر مقدمے میں ایک مدعی ہوتا تھا اور ایک ملزم۔ منصف کی مدد سے ان کے معاملات کو سلجھا دیا جاتا

تھا۔اب صورتحال مختلف ہوگئی ہے۔ ہرفوجداری مقدمے میں مستغیث سرکار ہوتی ہے۔ مدعی کی حیثیت محض ایک گواہ کی رہ گئی ہے ہرفوجداری جرم ریاست یا سرکار کے خلاف جرم مانا جاتا ہے ۔چنانچہ عدالت میں طلبی کے وقت عدالت کا کارندہ مقدمے کی اطلاع ان الفاظ مین دیتا ہے۔ ''چلو سرکار بنام فلاں فلاں''۔ یہ محض ایک آواز نہیں ہے بلکہ ایک زبردست تبدیلی ہے۔ قانون دانوں اور قانون سازوں نے ابھی تک اس کے مضمرات کا جائزہ نہیں لیا۔

پاکستان کے بننے بعد یہاں تبدیلیاں آئیں اور انگریزوں کے قانون پر تنقید شروع ہوگئی اور اس قانون میں اتنی چھوٹی سی چھوٹی تبدیلیاں کی گئیں کہ موجودہ قانون اب وہ قانون ہی نہیں رہ گیا۔ یہ اپنے مخالفوں سے بدلہ لینے کا ایک طریقہ بن گیا ہے۔ مسلسل مارشل لاؤں کے تحت تو فوجداری قانون کا حلیہ ہی مسخ ہوگیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرون وسطیٰ میں رہ رہے ہیں۔اس وقت پاکستان میں تین تعزیرات رائج ہیں۔اول انگریزی کی یادگار تعزیرات پاکستان، دوسری مارشل لاء کے قوانین اور تیسرے شریعت کے تحت وجود میں آنے والے ''اسلامی قوانین''۔

جرم کی تعریف

گرفت میں نہ آنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ معاشرے کی طرح خود قانون بھی بدلتا رہتا ہے۔ایک دفعہ پھر مغرب کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ آج سے بیس برس پہلے مغرب میں جو افعال جنس کے حوالے سے قابل گرفت تھے، آج نہیں ہیں۔اسقاط حمل ہمارے ہاں اب بھی جرم ہے لیکن بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر مغرب والوں نے اسے ضرورت کے تحت قبول کرلیا ہے اور اب وہاں اسے جرم نہیں سمجھا جاتا۔

پاکستان کے ابتدائی دور میں شراب نوشی پر کوئی پابندی نہیں تھی اور یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ شراب نوشی پر پابندی عاید ہوئی اور آج شراب فروشی اور اس کو رکھنا جرم قرار پائے۔یہی حال چرس افیون اور دوسرے مخدرات کا ہے۔

ہر معاشرے میں انسانی قتل ایک گھناؤنا جرم سمجھا جاتا ہے مگر حالت جنگ میں انسان کا انسان کو قتل کرنا بہادری شمار کیا جاتا ہے۔اسی طرح مغرب میں ''ڈیوئل''(Duel) میں قتل جائز سمجھا جاتا تھا اور جرم شمار نہیں ہوتا تھا۔شراب کے نشے کی حالت میں کسی کو قتل کردینا قتل عمد کے مترادف

MashalBooks.org

نہیں اور ایسے مجرم کو وہ سزا نہیں ملتی جو قتل عمد کے مجرم کو دی جاتی ہے۔

گناہ اور جرم

گناہ اور جرم کے درمیان رشتہ تلاش کرنے کی کوششیں بھی کی گئی ہیں جن سے اس موضوع پر کافی ضخیم لیکن مبہم مواد تخلیق ہو چکا ہے۔ جرم کے مطالعہ کا یہ ایک اہم پہلو ہے لیکن اس کی نوعیت علمی ہونے سے زیادہ تاریخی ہے۔ دنیوی قانون سازی کے مقابلے میں اخلاقیات کے نظام اور اس کی تعلیمات کا ارتقاء ایک مختلف اور طویل المدت پیمانے پر واقع ہوا ہے۔ اوپر وضاحت ہو چکی ہے کہ کسی فعل کے جرم سے عدم جرم ہونے کے درمیان تبدیلی کا سراغ لگانا آسان ہے۔ کوئی فعل جو آج جرم ہے قانون میں تبدیلی کی بنا پر کل جرم نہیں رہے گا۔ مغرب میں ہم جنسی تعلقات جرم تھے لیکن قانون میں تبدیلی ہونے سے اب وہ جرم کی ذیل میں نہیں آتے۔ ایسی تبدیلیوں کی ہم وضاحت بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ان قلیل المدت تبدیلیوں اور مذہب اور اخلاقیات کے طویل المدت ارتقا اور تبدیلیوں کے درمیان کوئی مطابقت پیدا نہیں کر سکتے۔ اس موضوع میں دلچسپی صرف فلسفی اور درس و تدریس سے منسلک لوگوں تک محدود ہے۔

جرم بطور مرض

جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے انیسویں صدی اور بیسویں کے آغاز میں جرم کو ایک بیماری سمجھا جاتا تھا جو معاشرے کے ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور افراد کو لاحق ہو جاتی ہے اور ان سے وہ افعال سرزد ہوتے ہیں جو قانون کی نظر میں جرم قرار پاتے ہیں اور ان پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہ نظریہ جرم کے ارتکاب کی تھوڑی بہت تشریح کرتا ہے لیکن قانونی موشگافیوں، جیسے نیت اور بدنیتی یا ارادے وغیرہ کا احاطہ نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے جرم اور سزا کے درمیان کسی تعلق کا تعین نہیں ہوتا اور یہ تعین قانونی تعقل کے لیے بڑا اہم ہے۔

جرم اور سماجی تنظیم

اگر جرم کو معاشرے کا تفاعل یا خرابی تفاعل سمجھا جائے تو جرم کی ایسی تعریفیں ہو سکتی ہیں کہ جو ڈرخایم، مارکس، شکاگو (Chicago) سکول اور سدرلینڈ، اور اس کے تابعین کے خیالات اور نظریات سے مطابقت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ سب جرائم کے مظہر کی مبہم تعریفیں ہیں۔ کیا جرم ایسی

MashalBooks.org

قانون شکنی ہے جس کی سزا لازمی ہے؟ کیا یہ معاشرے کے مقبول سماجی اور سیاسی اصولوں کو دانستہ اور عمداً نا کام بنانے کی کوشش ہے؟ کیا یہ ایسی روش ہے جس کے ذریعے کچھ لوگوں یا طبقوں کو سماجی سرگرمیوں سے محروم یا خارج کرنے کی غرض سے ایک حیلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے؟ ایسی تعریفیں جرم اور سزا کے درمیان رشتے کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ وہ صرف اس حد تک مفید ہیں کہ وہ سزا کی اہمیت پر قانون دانوں ہی کی طرح زور دیتی ہیں۔ یہ پابندیاں ہیں جو جرم کو عیاں کرتی ہیں اور اس کی تعریف کرتی ہیں۔

جرم بطور ایک معاشرتی عمل

جرم کی حیثیت کا تعین کرنے والے مختلف گنجلک افکار کو سلجھانے کی کوششوں میں سے ایک کا آغاز خود تعریف کے عمل سے ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے یہاں ایک دفعہ پھر جرم کو ایک مرض فرض کرنا ہوگا۔ کوئی مرض اس وقت تک موجود نہیں سمجھا جاتا جب تک اس کے متعلق شکایت نہ کی جائے یا اس کی علامات ظاہر نہ ہوں۔ گردوں کے مرض کا صرف اس وقت پتہ چلتا ہے جب درد ہو۔ چنانچہ جب تک علامات ظاہر نہ ہوں مرض کا موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

یہی صورتحال جرم کی ہے۔ راہزنی، نقب زنی یا زنا بالجبر کے شکار جب تک ان کی شکایت نہ کریں یا کسی اور طریقے سے یہ متعلقہ حکام کے علم میں نہ آئیں، اس وقت تک یہ وارداتیں جرم کے زمرے میں نہیں آئیں گی۔ اگرچہ پہلے نظریہ ساز جو جرائم کو ایک معاشرتی عمل سمجھتے تھے، ظاہر نہ ہونے والے تمام افعال یا ترک افعال کو جرم کے دائرے میں لے آتے تھے۔ لیکن جب تک جرم کا شکار ہونے والا خود یا کوئی دوسرا اس کی شکایت نہ کرے جرم سرزد ہونا تصور نہیں کیا جاتا۔ ایسے جرائم کو جن کی شکایت درج نہیں کرائی جاتی یا جو درج نہیں ہوتے، ڈارک فگر (Dark Figure) کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسے جرائم درج ہونے والے جرائم کے تقریباً پچاس سے نوے فی صد یا اس سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

جرم کی موجودگی کا پتا چلانے کا دوسرا معیار متعلقہ حکام کے پاس اس جرم کی شکایت کا اندراج ہے۔ اگر اندراج نہیں کرایا جاتا یا پولیس اس کو درج نہیں کرتی تو اس کا مطلب ہے کہ جرم سرزد نہیں ہوا۔ جرائم کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جو لوگوں یا پولیس کی نظر میں نہیں آتی۔ ایسے

MashalBooks.org

واقعات جرائم کے زمرے میں نہیں آتے۔

چنانچہ جرم کے تصور میں تعاملات کا ایک سلسلہ موجود ہے۔جسم یا املاک پر حملے کا شکار ہونے والے کا ردِعمل اور پھر پولیس کا ردعمل، خواہ ان کے پاس شکایت درج کرائی گئی ہو یا انہوں نے ازخود اس کا پتا چلا ہو۔

جرم کی موجودگی کا آخری مرحلہ مجسٹریٹ یا منصف ہے جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس فعل یا ترک فعل میں مجرمانہ اجزائے ترکیبی ہیں کہ نہیں۔ یہ سب تعریفیں سماجی اور سیاسی تنظیموں کی اس پیچیدہ بافت کا حصہ ہیں جس کے اندر انسانی سرگرمیاں واقع ہوتی ہیں، منظّم ہوتی ہیں، زیرنگرانی رکھی جاتی ہیں اور ان کی تعریفیں وضع کی جاتی ہیں۔ جرم کی ہیئت اور اس کی تعریف میں الجھنیں ''وائٹ کالر'' جرائم کے تحت ایک دفعہ پھر زیر بحث آئیں گی۔

پوزیٹوسٹ (Positivist) سکول نے جرم کی اس تعریف کو اس بنا پر رد کر دیا کہ یہ سائنسی بنیاد پر مبنی نہیں۔ان کی نظر میں سماجی تعلقات کی تہہ میں کوئی فطری رو ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جرم یا سرکشی غیر فطری اور مریضانہ طرزِعمل ہے۔

قانون پر مبنی تعریفیں نہ تو اتنی تنگ ہیں اور نہ ہی اتنی غیر مناسب ہیں جتنی کہ وہ نظر آتی ہیں۔ ان میں سزائیں ہیں اور وہ ان سزاؤں کو محدود بھی کرتی ہیں۔ اخلاقی نقطہ نظر سے وضع کی ہوئی تعریفیں بڑی عمیق اور عرصے پر محیط مقبول عقاید پر مبنی ہیں اور وہ جرم اور سزا پر مختلف رنگ چڑھا دیتی ہیں۔ میڈیکل اور سماجی تشریحات اور مثالیں جرائم کی تعریف میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں اور جرم کو سماجی عمل کا ایک جزو خیال کرتی ہیں۔اسی عمل کی وجہ سے جرم وجود میں آتا ہے اور شناخت ہوتا ہے۔ اس شناخت کے لئے جرم کا شکار ہونے والے کا ردعمل اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کا ردعمل معلوم کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ وہ فاعل جس سے وہ فعل سرزد ہوا جس پر جرم کا لیبل چسپاں کیا جاتا ہے۔

ان تمام وقتوں کے باوجود لفظ جرم کی تفہیم قانون سازی اور قانون شکنی کے لئے مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور سزا کا تعین بھی جرم کی سنگینی کی مناسبت سے ہوتا ہے۔

قانون اور فلسفہ قانون (Jurisprudence) کی نظر میں ہر فعل یا ترک فعل جو سزا کا مستوجب ہو جرم ہے۔ جرم کی اس تعریف سے جرم اور سزا میں رشتے کا تعین ہو جاتا ہے۔ کسی

MashalBooks.org

قانون دان کی نظر میں یہی رشتہ جرم کے تصور میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ''ہسٹری آف کریمنل لا'' کے مصنف سر جیمز سٹیفن (1829-1894) نے اپنے زمانے میں جرم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ''جرم ایسا فعل یا ترک فعل ہے جس کے سرزد ہونے پر سزا لازمی ہے''۔ اس تعریف سے ہم یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ کسی فعل یا ترک فعل یا فردگزاشت میں مجرمیت کی نوعیت کا انحصار اس تعزیر پر ہے جو جرم کے ارتکاب کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر تعزیر کا اطلاق کرتے وقت مجرم کی عمر اور اس کی ذہنی حالت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر قاتل کم عمر ہے، یا وہ بالغ ہے مگر اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے، تو اسے قتل یا تشدد کا مجرم قرار نہیں دیا جائے گا کیونکہ اس کے ذہن میں جرم کا ارتکاب کرنے کی نیت یا ارادہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قانون دان کی نظر میں جرم کے تین عناصر ہیں ......ممنوعہ فعل یا عدم فعل، ارادہ، جرم اور سزا۔ عدالتوں میں مباحث اور فیصلے جرم کے اسی تصور پر مبنی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا ناگزیر ہے کہ جرم ایک ارادی فعل ہے۔

چودہ سو سال پہلے اسلام نے وضاحت کر دی تھی کہ : **الاعمال بالنیات** یہ آج بھی اتنی ہی بڑی سچائی ہے جتنی کہ اس زمانے میں تھی۔ اس کی عالمگیریت الم نشرح ہے۔

تمام ممالک میں جرم اپنے وسیع ترین معنوں میں کسی قانون کی خلاف ورزی پر مشتمل فعل ہے جس کے سرزد ہونے پر عدالت پہلے سے مقرر شدہ مختلف قسم کی تجویز کردہ سزا دیتی ہے۔ موت، قید، جرمانہ، عہدے سے برخاستگی کے علاوہ اور سزائیں بھی ہو سکتی ہیں جیسے عبور دریائے شور (کالا پانی) یا جلا وطنی وغیرہ وغیرہ۔

صف بندی کی غرض سے جرائم کو دو زمروں میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک میلا ان سی (Melain se) ہے یعنی ایسے جرائم جو ہر حالت میں جرم ہیں اور دوسرا زمرہ میلا پروہیبٹا (Mela prohibita) ہے جو افعال ممنوعہ پر مشتمل ہے۔ قتل ایسا جرم ہے جو اپنی ذات میں ہی جرم ہے۔ یہ میلا ان سی کی مثال ہے اور شر پر مبنی ہے۔ دوسری طرف ایسے افعال ہیں جنہیں معاشرہ اپنا توازن قائم رکھنے کی خاطر ممنوع قرار دیتا ہے جیسے قمار بازی اور منشیات وغیرہ کا استعمال، ٹریفک کے اُصولوں کی خلاف ورزی وغیرہ وغیرہ۔ یہ جرائم افعال ممنوعہ ہیں۔ ایسے جرائم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر معاشرے میں مختلف ہوتے ہیں اور اکثر ایک ہی معاشرے میں رائے عامہ، رواج اور مذہبی معیاروں میں تبدیلیوں کی بنا پر بدلتے بھی رہتے ہیں۔ مثال پھر وہی شراب نوشی ہے۔ ایک

MashalBooks.org

زمانے میں جب کچھ ممالک میں اس پر پابندی عاید کردی گئی تو شراب نوشی جرم بن گئی۔مگر جب یہ پابندی ناکام ہوگئی تو شراب نوشی جرائم کی فہرست سے خارج ہوگئی۔ایسی صورت پاکستان کوبھی پیش آئی ہے۔ پہلے شراب نوشی جرم نہیں تھی لیکن اس پر پابندی کے بعد یہ جرائم کی فہرست میں شامل ہوگئی۔کسٹمز ایکٹ کے تحت بھی اس قسم کی مثالیں مل سکتی ہیں۔آج کسی چیز کی درآمد ممنوع ہےاوراس کا شمار جرائم میں ہوتا ہےلیکن کل کو اسے درآمد کرنے کی اجازت مل جاتی ہےتو یہ جرم نہیں رہتا۔ایسے تمام افعال میلا پروھیبٹا کے تحت آتے ہیں۔

فرانسیسی ماہرعمرانیات ایمل ڈرخایم جرم کومعاشرے کاایک لازمی جزوسمجھتا تھا کیونکہ ایک قدیم عرصے سے جرائم تمام معاشروں میں موجود تھے۔کوئی معاشرہ بھی جرائم سے کبھی خالی نہیں رہا۔اس کی رائے میں میلا پروھیبٹا جرائم معاشرے کے لئے قابلِ قبول رویوں کی حدبندی کرتے ہیں اور معاشرے کی حدود کوآزما کراس میں تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں۔مثال کےطور پر مغرب میں جنسی آزادی ایسے زمانے میں ظاہر ہوئی جب کئی طرح کے جنسی رویوں کو جرم خیال کیا جاتا تھا۔اسقاط حمل ایسا ہی فعل ہے جو کسی زمانے میں قتل کے مترادف تھا لیکن امریکہ میں اب یہ خواتین کے بنیادی حقوق میں شامل ہے۔1973ء میں روبنام ویڈ(Roe vs Wade) کے مقدمے میں امریکہ کی عدالت عظمیٰ نے اسے عورت کا آئینی حق قرار دیا۔

ہرملک اور ہر معاشرے میں جرائم کی سزائیں مقرر ہیں۔ یہ سزائیں،سزائے موت سے لے کر جرمانے تک ہوسکتی ہیں۔ان کی مدت عمرقید سے لے کر تا برخاست عدالت ہوسکتی ہے۔ مثالی سزا ہمیشہ جرم کی سنگینی کے مطابق ہوتی ہے۔جیسے قتل کی سزا موت،عمرقید یا کسی زمانے میں عمر قید بہ عبور دریائے شور ہوتی تھی۔مگر ایسے بھی گھناؤنے جرائم ہیں جن کی سزا ان کی سنگینی یا گھناؤنے پن کے مطابق نہیں ہوتی۔اس ذیل میں وہ جرائم آتے ہیں جنہیں وائٹ کالر جرائم اور کمپیوٹر جرائم کہا جاتا ہے۔

وائٹ کالر یعنی سفید پوش لوگوں کے جرائم میں بڑے تاجروں،صنعت کاروں،سرکاری ملازموں اور بینک کے کارندوں کی غیرقانونی سرگرمیاں شامل ہیں۔اس اصطلاح کو سب سے پہلے امریکی ماہر جرمیات اور امریکن سوشیولاجیکل سوسائٹی کے صدر ایڈون سدرلینڈ نے1939ء میں استعمال کیا۔اس وقت تک جرم کو ہمیشہ نچلے طبقے کی سرگرمی سمجھا جاتا تھا اور تاجروں،صنعت

کاروں، سرکاری ملازمین اور بینک کاروں کو، جو پوری مامونیت سے قانون شکنی کے مرتکب ہوتے تھے، نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ لیکن سدرلینڈ کے اس تصور نے واضح کر دیا کہ انحراف یا جرم کا ارتکاب امیر اور درمیانے درجے کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ اس تصور نے جرم کو معاشرے کے معمولات میں شامل کر دیا۔ اقتصادی محرومی، غیر متوازن ذہن یا منتشر خاندان سفید پوشوں کے جرائم کی تشریح کرنے سے قاصر ہیں۔ اس تصور نے ماہرین کو ان جرائم کو بھی اسی روشنی میں دیکھنے پر مجبور کر دیا جس روشنی میں وہ نچلے طبقے کی مجرمانہ سرگرمیوں کو دیکھتے تھے۔ سدرلینڈ کی نظر میں امریکہ کا سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمشن، نیشنل لیبر ریلیشنز بورڈ، فیڈرل ٹریڈ کمشن میں شریک کارندوں کی قانون شکن حرکات کو جرائم میں شامل کرنا چاہیے۔ کچھ لوگ اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں یہ خیال مجموعہ تعزیرات سے متصادم ہے۔

چنانچہ اونچے طبقے اور اونچے پیشوں سے وابستہ لوگوں کے مجرمانہ افعال جیسے رشوت ستانی، مخالفوں یا ممکنہ مخالفوں پر غیر قانونی طریقے سے اثر انداز ہونا (ہمارے ہاں ہارس ٹریڈنگ) غیر قانونی طور پر چندہ اکٹھا کرنا' کالے دھن کو سفید کرنا، خیانت کا مرتکب ہونا، کمپیوٹر کے ذریعے غیر قانونی واردات کرنا وائٹ کالر جرائم کے ذیل میں آتے ہیں۔

وائٹ کالر جرم بڑے وسیع پیمانے پر لوگوں کے خسارے، نقصان اور بربادی کا سبب بنتے ہیں مگر ایسے جرائم کا ارتکاب کرنے والے کو بہت تھوڑی سزا ملتی ہے۔ اس کی وجہ معاشرے میں مجرم کا مقام ہے۔ اس کے مقابلے میں ڈاکہ زنی معاشرے کے لئے اتنے نقصان کا باعث نہیں بنتی مگر اس کی سزا مقابلتاً بہت زیادہ ہے۔ کسی بنک کے پریذیڈنٹ کو، جس نے بڑی بڑی رقموں کی خیانت کا ارتکاب کیا ہو، عموماً ایک عام سا مجرم نہیں سمجھا جاتا۔ یوں رائے عامہ اور معاشرے میں مجرم کا مقام اس کو ملنے والی سزا پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پاکستان میں اس کی کئی گھناؤنی مثالیں موجود ہیں۔ مہران بینک اس کی ایک بڑی عمدہ مثال ہے۔ وہ لوگ جو بینکوں سے اربوں روپیہ قرض لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ دوسری مثال ہے تاج کمپنی اور جگہ جگہ کھلنے والی فینانس کمپنیاں اور کوآپریٹو سوسائٹیاں جو کروڑوں افراد کی عمر بھر کی پونجی ہضم کر گئیں۔ چند اور مثالیں ہیں۔ بی سی سی آئی کے ملازمین بھی وائٹ کالر جرائم کی زد میں آئے۔ پاکستان میں رشوت وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے لیکن آج تک سوائے ایک شخص کے کسی اور سرکاری ملازم کے خلاف کبھی کوئی کارروائی

MashalBooks.org

نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی سرکاری افسر کو جیل جانا پڑا ہے۔

معاشرے میں سفید پوشوں کے جرائم کی اہمیت کے پیشِ نظر آئندہ صفحات میں یہ موضوع ایک دفعہ پھر زیر بحث آئے گا۔

نوعیت کے اس تنوع کے باوجود جرائم کے مظہر میں ایک وحدت ہے۔

قانون دان جرائم کو دو زمروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ فیلینی (Felony) یعنی سنگین جرائم جن کی سزا موت یا عمر قید ہو سکتی ہے اور مس ڈیمینز (misdeameanour) (بداطواری یا جرم خفیف)۔ اس زمرے میں کم سزا والے جرائم آتے ہیں۔

ایک اور تقسیم کے تحت بھی جرائم کو دو زمروں میں بانتا جاتا ہے، اشخاص یعنی انسانی جان کے خلاف جرائم اور املاک کے خلاف جرائم۔ پہلے زمرے میں وہ جرائم آتے ہیں جن میں کسی شخص پر تشدد کیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں مجرم کسی کو قتل کرتا ہے، ڈراتا دھمکاتا ہے، یا اسے کوئی اور جسمانی گزند......ضرب شدید یا ضرب خفیف...... پہنچاتا ہے۔ اغوا اور زنا بالجبر بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

املاک کے خلاف جرائم میں ڈاکہ، سرقہ بالجبر، نقب زنی، آتش زنی، گاڑیوں، موٹر سائیکلوں اور مویشیوں کی چوری وغیرہ قسم کے جرائم آتے ہیں۔

اس ذیل میں دو اور قسم کے جرم بھی شامل ہو گئے ہیں۔ وائٹ کالر جرائم اور کمپیوٹر کے ذریعے جرائم کا ارتکاب۔ ان دونوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

کمپیوٹر جرائم

یہ وہ جرائم ہیں جن کا ارتکاب کمپیوٹر کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کے غلط استعمال سے خیانت، چوری، نقب زنی، تخریب کاری، جعل سازی، جاسوسی اور یہاں تک کہ قتل بھی ممکن ہو گئے ہیں۔ ان جرائم کا ارتکاب غلط پروگرام تیار کر کے کیا جاتا ہے یا کمپیوٹر میں غلط ڈیٹا یا اعداد و شمار داخل کر کے کیا جاتا ہے۔ ان جرائم کا ارتکاب کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ماہرین یا کمپیوٹر سے شوقیہ شغف کرنے والے لوگ کرتے ہیں۔ ایسے جرائم بڑی بڑی فرموں اور کمپنیوں میں ہوتے ہیں۔ ان کا شکار ہونے والے ایسے جرائم پر پردہ ڈال دیتے ہیں تاکہ ان کی ساکھ کو کوئی گزند نہ پہنچے کیونکہ اس

MashalBooks.org

صورت میں کمپنی کو جرم کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کے مقابلے میں کہیں زیادہ خسارے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

منظّم جرائم

منظّم جرم ایسی مجرمانہ سرگرمی ہے جس میں بہت سے افراد شریک ہوتے ہیں۔ شریک ہونے والوں کا انتخاب بڑے کڑے معیار پر کیا جاتا ہے۔ ہرا ایرا غیرا اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ ارکان کو علیحدہ علیحدہ ذمے داریاں سونپی جاتی ہیں۔ ایسے گروہوں کا مقصد حصول دولت اور اس کے ذریعے سیاسی اقتدار کا حصول ہوتا ہے۔ ان کی وارداتوں پر اکثر قانونی سرگرمیوں کا پردہ پڑا ہوتا ہے جس کی آڑ میں یہ اپنا غیر قانونی دھندا جاری رکھتے ہیں۔ اس طرح سے اکٹھی کی گئی دولت کو اکثر غیر مجرمانہ سرگرمیوں میں لگایا جاتا ہے تا کہ کالا دھن سفید ہو جائے اور ان کی مجرمانہ سرگرمیوں پر پردہ پڑا رہے۔ ایسے گروہوں کا مقصد مختلف اشیاء کی خرید و فروخت پر پورا کنٹرول حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں منشیات کا دھندہ اسی ذیل میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ سونے کی سمگلنگ، الیکٹرونک اور دوسری اشیا کی شمگلنگ بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ پھر ان مجرمانہ سرگرمیوں سے حاصل کی ہوئی دولت کو وہ صاف ستھرے کاروبار میں لگا دیتے ہیں اور اسی کے بل بوتے پر وہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں اس کی وافر مثالیں مل سکتی ہیں۔

پاکستان کو شامل کر کے دنیا کے کئی ممالک میں منظّم مجرمانہ گروہ موجود ہیں۔ جاپان میں یاکوزا، چین میں ٹرائیڈ، سسلی میں مافیا، کولمبیا اور میکسیکو میں مجرم خاندان، امریکہ میں اطالوی۔ امریکی خاندان اور موٹر سائیکلوں والے جرائم پیشہ نوجوانوں کے گروہ جیسے ہیل اینجلز (Hell Angels) اور ان کے علاوہ سفید اور سیاہ فام اور ایشیائی گروہ شامل ہیں۔

جرائم کے مظہر کو سمجھنے، اس کا تجزیہ کرنے، ان کا سدباب کرنے اور پھر جرائم کی روک تھام کرنے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کارکردگی کو جانچنے پرکھنے کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ جرائم کے صحیح اعداد و شمار اکٹھے کئے جائیں۔ یہ بڑا الجھا ہوا، پیچیدہ اور وقت طلب معاملہ ہے۔

MashalBooks.org

اس الجھاؤ کو سمجھنے کے لیے دو تین اصطلاحوں کی وضاحت ضروری ہے۔

- متاثرہ شخص کی مسروقہ املاک اسے واپس مل جائیں یا مل گئی ہوں۔

شرح جرائم

کسی خاص علاقے میں ایک مخصوص دورانئے میں جرائم کی بڑھتی یا گھٹتی ہوئی رفتار کو شرح جرائم کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ معاشرے کے لئے یہ تصور اور یہ رجحانات بڑے مفید ہو سکتے ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جرائم کے اعداد و شمار انتہائی ناقابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ ان کی بنیاد صرف وہ جرائم ہوتے ہیں جن کی اطلاع پولیس کی دی جاتی ہے یا انہیں از خود ان کا پتا چل جاتا ہے۔ کچھ جرائم کو پولیس خود بھی بوجوہ نظر انداز کر دیتی ہے۔ جرائم کی اطلاع نہ دینے کی وجوہات اوپر زیرِ غور آ چکی ہیں۔

بعض دفعہ جرائم کی تعداد کو محکمے دانستہ مسخ کر دیتے ہیں تا کہ اس محکمے یا برسر اقتدار پارٹی کی کارکردگی کو نمایاں کیا جا سکے۔

بعض اوقات کسی ایک زمانے یا ملک کی شرح جرائم کا موازنہ کسی دوسرے زمانے یا ملک سے کیا جاتا ہے لیکن ایسے موازنے باطل ہوتے ہیں کیونکہ ہر ملک کا قانون جدا جدا ہے اور ایک ہی ملک میں قانون بھی بدلتا رہتا ہے۔

ماہرین اقتصادیات نے اپنی اور انتظامیہ کی راہنمائی کے لئے کاسٹ آف لونگ انڈکس (Cost of living index) اور کئی دوسرے اشارے تیار کر لیے ہیں۔ جرمیات کے ماہرین بھی چاہتے ہیں کہ جرائم کا بھی کوئی انڈکس ہوتا کہ انتظامیہ اور محققین کی حسب ضرورت ہو سکے۔ لیکن ایسا کرنا سر دست محال نظر آتا ہے کیونکہ جرائم کے اعداد و شمار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

مندرجہ بالا وجوہات کے علاوہ ایسا نہ کرنے کی دوسری وجوہات بھی ہیں۔

اول: قوانین کے مختلف مجموعوں کے تحت جرم کی تعریفیں مختلف ہیں اور دوئم اعداد و شمار کے ماخذ بڑے مختلف ہیں یعنی محکمہ پولیس، عدالتوں، جیلوں اور اصلاحی اداروں کے اعداد و شمار۔

پولیس بھی جرائم کا اندراج یکساں طریقے سے نہیں کرتی۔ چنانچہ جرائم کے اعداد و شمار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کارکردگی کا اشاریہ ہیں۔ بہرحال

کوشش جاری ہے کہ ایسا کوئی اشاریہ مرتب ہو سکے جو انتظامیہ اور محققین کے لئے سودمند ہو۔

تاہم جتنے اعداد و شمار جمع ہو جائیں ان پر مختلف جہات سے نظر ڈالی جاتی ہے۔

پہلا کام جرائم کی مجموعی تعداد کا جائزہ لینا ہے۔ ان کا تجزیہ کرتے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ جرائم کی نوعیت کیا ہے۔ اشخاص کے خلاف جرائم: قتل، تشدد، زنا بالجبر وغیرہ املاک کے خلاف جرائم ڈاکہ، سرقہ، سرقہ بالجبر، نقب زنی وغیرہ۔ ان جرائم کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ مجرمانہ سرگرمیاں کیا رخ اختیار کر رہی ہیں۔ پھر کھوج لگایا جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور اس کا تدارک کیسے کیا جا سکتا ہے۔

مجموعی جرائم کا تجزیہ کرتے وقت یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ یہ سب جرائم کتنے عرصے میں ہوئے اور پچھلے انہی دنوں میں ہونے والے جرائم سے ان کا موازنہ کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مجرمانہ سرگرمیوں میں کس قسم کی تبدیلی آئی ہے۔

علاقے کے اعتبار سے بھی جرائم کا موازنہ اور مقابلہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک صوبے، ضلعے، تھانے میں ہونے والے جرائم کا کسی اور یا ملحقہ صوبے، ضلعے یا تھانے میں ہونے والے جرائم سے موازنہ تاکہ پوری صورت حال سامنے آ جائے۔

جرائم کے اعداد و شمار سے یہ اندازہ بھی لگایا جاتا ہے کہ کتنے لوگ مجرمانہ سرگرمیوں کا شکار ہوئے ہیں یعنی کتنے آدمی قتل ہوئے، کتنے تشدد کا شکار ہوئے، کتنوں نے بلوہ کیا، املاک کی مالیت کیا تھی جن پر مجرموں نے ہاتھ صاف کئے۔ پھر اس تجزیے سے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ڈاکوں میں کتنا مال لوٹا گیا، نقب زنی میں کتنا، سرقے میں کتنا، راہزنی میں کتنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تجزیہ بھی مجرمانہ سرگرمیوں پر مفید روشنی ڈالتا ہے اور اس سے جرائم کا انسداد کرنے والوں کی اچھی راہنمائی ہوتی ہے۔

اگلا مرحلہ جرائم میں ملوث افراد کا تجزیہ ہے۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان مجرموں میں سے کتنے سابقہ سزایافتہ ہیں اور وہ کتنی دفعہ سزا پا چکے ہیں۔ کتنے مجرم ایسے ہیں جو پہلی دفعہ جرم کے مرتکب ہوئے۔ ان کی عمریں کیا تھیں۔ ان کی تعلیمی سطح کیا ہے اور ان کی اصلاح کی کتنی گنجائش ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ اکیلے واردات کرتے ہیں یا گروہوں کی شکل میں۔ اس سے بھی جرائم کا انسداد کرنے والی تنظیموں کی راہنمائی ہوتی ہے۔

MashalBooks.org

وائٹ کالر کرائم

جیسا کہ کتاب کے آغاز میں بتایا جاچکا ہے وائٹ کالر کرائم کی اصطلاح پہلی دفعہ سدر لینڈ نے امریکہ میں استعمال کی تھی۔ انہوں نے اس جرم کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی:

''معاشرے میں بلند مقام رکھنے والے معزز لوگوں کا جرم، جس کا ارتکاب وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کرتے ہیں۔''

انہوں نے امریکہ کے اینٹی ٹرسٹ قوانین کی خلاف ورزی، غلط اشتہارات، تجارتی راز ون کی چوری اور رشوت ستانی کو بطور مثالیں پیش کیا۔ اس قسم کے جرائم میں وہ لال، جو اندرونی اطلاعات کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرتا ہے، بنک کا وہ پریذیڈنٹ جو لوگوں کا پیسہ خود بطور قرض لے لیتا ہے، کے علاوہ اور بہت سے جرائم بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ اصطلاح جلد ہی عمرانی سائنس دانوں اور عوام میں مقبول ہوگئی۔ ایسے جرائم کا ارتکاب کارپوریشنیں، کمپنیاں اور افراد کرتے ہیں جن میں رشوت خور، اپنے عہدے اور اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے سرکاری کارندے، اہل کار اور افسر شامل ہیں۔

مختلف ممالک میں وائٹ کالر جرائم میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور اس میں کوئی کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔ معاشرے کو ان جرائم کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ نقصان ان تمام مجموعی نقصانات سے کہیں زیادہ ہے جو دوسرے جرائم سے ہوتا ہے۔ مثلاً

''بھوپال (ہندوستان) میں 1984ء میں جب مہلک گیس چھوڑی گئی تو دو ہزار سے پانچ ہزار افراد موت کی آغوش میں چلے گئے اور تیس سے چالیس ہزار افراد شدید زخمی ہوئے۔

☆ دنیا بھر میں 1986ء میں ایک ملین نوزائیدہ بچے مرگئے کیونکہ انہیں خراب بوتلوں سے دودھ پلایا جاتا تھا۔

☆ امریکہ میں ناقص گاڑیوں کی وجہ سے روزانہ 120 افراد کی موت واقع ہوجاتی ہے۔

☆ امریکہ ہی میں تمباکو نوشی سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے 800 افراد روزانہ مرجاتے ہیں۔

☆ ایسبسٹس (Asbestos) سے پیدا ہونے والے کینسر سے آئندہ تیس برسوں میں ہر سال

MashalBooks.org

8000افراد مرا جائیں گے۔

☆ ضبط تولید کے لئے استعمال ہونے والی دالکن شیلڈ کے استعمال سے ہزاروں عورتیں بیمار ہو چکی ہیں۔

☆ 1,80,000امریکنوں کو کاٹن ٹیکسٹائل انڈسٹری میں کام کرنے کی بنا پر براؤن لنگ (Brown lung) بیماری کی وجہ سے سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے۔

جب جرم کا نام آتا ہے تو لوگوں کو اجارہ داری کی بجائے نقب زنی، مضر یا جعلی ادویات کی فروخت سے پہلے مجرمانہ حملے اور کارپوریٹ جرائم کی بجائے عام جرائم کا خیال آتا ہے۔

یہاں جرم کی نوعیت کے متعلق بالعموم اور وائٹ کالر جرائم کی نوعیت کے بارے میں بالخصوص یہ سوال پیدا ہوتا ہے:

جب کوئی کارخانہ زہریلا مادہ کسی ندی یا نالے میں پھینکتا ہے جہاں سے لوگ پینے کا پانی لیتے ہیں، اور اس کی کوئی ممانعت نہیں کرتا، تو کیا کوئی جرم سرزد ہوا ہے؟

یا ممانعت کے باوجود وہ کارخانہ ایسا ہی کرتا ہے اور پولیس اس کو نظر انداز کر دیتی ہے، تو کیا کسی جرم کا ارتکاب ہوا؟

یا پولیس سول عدالت میں جا کر ندی میں اس زہریلے مادے کو پھینکنے کے خلاف حکم لے آتی ہے تو اس صورت میں کیا کوئی جرم سرزد ہوا؟

ان تمام سوالات کا جواب جرم کی تعریف پر منحصر ہے جس پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔ تعریف کا خود اپنا انحصار اس فرد پر ہے جو تعریف پیش کر رہا ہے۔ یہ بھی ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ کوئی فعل صرف اسی وقت جرم بنتا ہے جب فوجداری عدالت اسے جرم قرار دے۔ بہت کم ایسے غیر قانونی کارپوریٹ(Corporate) افعال یا غلط کاریاں ہیں جو اس تنگ قانونی تعریف پر پوری اتر سکیں۔

اگر ہزاروں انسانی جانوں کا سوال درپیش نہ ہوتا تو جرم کی اس تعریف کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا لیکن لفظ جرم کی تعبیر بذات خود بڑی دھماکہ خیز ہے۔ کارپوریٹ نظام انصاف کا ارتقا بھی ایسی ہی جہت میں ہوا جس سے کارپوریشنوں یا کمپنیوں کو اس تعبیر سے بچایا جا سکے اور اس کے ساتھ جو مجرم کے خلاف عدالتی کارروائی کا کلنک لگا ہوا ہے اسے مٹایا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کاروباری اداروں کے خلاف عدالتوں میں چارہ جوئی کی بات ہوتی ہے تو وہ فوجداری کی بجائے

MashalBooks.org

صرف دیوانی عدالتوں میں ہوتی ہے۔ ''اثبات جرم'' کی بجائے ''قبول کرنے'' اور مقدمے میں ''فردِ اقرار جرم'' کی بجائے ''نہ قبول اور نہ ہی انکار کرتے ہیں'' کے الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے۔

کاروباری اداروں کی کئی غلط حرکات جو مندرجہ بالا تعریف پر پوری نہیں اترتیں، اصل میں لفظ جرم کے بنیادی مفاہیم میں شامل ہیں کیونکہ اس میں جرم کے وہ تمام اجزائے ترکیبی موجود ہیں جن کی نشاندہی سدرلینڈ نے ان الفاظ میں کی تھی: ''ایسا عمل جسے ریاست ممنوع قرار دے یا آخری حربے کی صورت میں جس پر سزا نافذ کرے۔''

سفید پوشوں کے جرائم کے نقصان کا تخمینہ

اس معاملے میں اعداد و شمار کی اشد ضرورت کے باوجود ان جرائم کی مجموعی لاگت یا نقصان کا تخمینہ نہیں لگایا گیا۔ اس کی وجہ مندرجہ بالا فلسفیانی اور سیاسی موشگافیاں ہیں۔ سوالات یہ ہیں: آخر کارپوریٹ جرم ہے کیا؟ لفظ جرم کی تعریف خواہ کتنی ہی ناقص کیوں نہ ہو، ایک اور سوال اٹھاتی ہے کہ اس جرم کا شکار کون ہیں؟ اگر ایک دفعہ شکار کی شناخت ہو جائے تو نقصان کا تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔

کئی تغیر پذیر عوامل میں ایک ہلکی سی تبدیلی کے ساتھ ان جرائم کی لاگت میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ جرم ہی کی تعریف کو لیں۔ موٹر گاڑیاں بنانے والی کمپنیاں ایسی گاڑیاں فروخت کر رہی ہیں جن میں جان بچانے کی ایک مخصوص ترکیب نہیں ہے۔ یہ ایک خطرناک کام ہے۔ اس ترکیب کے نہ ہونے سے ہر سال ہزاروں جانیں حادثوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر قانون ایسی گاڑیاں بنانا ممنوع قرار دے دے تو ہزاروں لاکھوں لوگ جو اس ترکیب کے نہ ہونے کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، اس جرم کا شکار تسلیم کیے جائیں گے۔ لیکن انڈسٹری نے ایسا قانون بنانے ہی نہیں دیا۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے واضح جرائم میں بھی ان کا شکار ہونے والوں کی تعداد اور حقیقی معنوں میں لاگت کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ مذکورہ بالا کیمیاوی کارخانہ جو زہریلا مادہ دریا میں پھینکتا ہے، جس سے لوگ پینے کا پانی لیتے ہیں، اگلے بیس برسوں میں کتنے لوگوں کے لئے کینسر کا باعث بنے گا؟ اور کیا اس کینسر کی وجہ صرف یہ پینے کا پانی ہوگا یا اس کی وجہ تمباکو نوشی یا ہوا کی آلودگی بھی ہو سکتی ہے؟

سفید پوش کاروباری لوگوں کی غیر قانونی حرکات کے تجزیے میں ان مشکلات کے باوجود ایسے فارمولے کی تلاش جاری ہے جو سفید پوش جرائم کی لاگت کا تخمینہ لگا سکے۔ایک ماہر جرمیات کیلسنارڈ(Clinard) نے اندازہ لگایا ہے کہ صرف امریکہ میں ان جرائم سے کئی بلین ڈالرز کا نقصان ہوتا ہے۔وہ اس کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرتے ہیں:

☆ اجارہ داری اور اینٹی ٹرسٹ کے لئے قائم کی گئی جوڈیشری کمیٹی نے اجارہ داری کی خلاف قانونی سرگرمیوں سے ہونے والے نقصان کا سالانہ تخمینہ 14 سے 231 ملین ڈالرز لگایا ہے۔

☆ محکمہ انصاف نے وفاقی قوانین کی خلاف ورزیوں کی لاگت کا اندازہ دس سے بیس ملین ڈالرز لگایا ہے۔

☆ سیسے کی نالیاں بنانے والے بڑے بڑے اداروں کی سازشوں سے نقصان کا اندازہ سو ملین دالر ہے۔

☆ لاک ہیڈ کارپوریشن نے اعتراف کیا ہے کہ ستر کی دھائی مین اس نے غیر ملکوں میں اپنا سامان بیچنے کے لیے وہاں کے متعلقہ لوگوں کو 320 ملین ڈالر ادا کیے۔

کیمیاوی، موٹر کار انڈسٹری اور تیل کی کمپنیوں کے ہاتھوں، کارکنوں اور شہریوں کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے لیکن شہادت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس نقصان کی نسبت سے عام جرائم میں ہونے والا نقصان بے معنی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفید پوش جرائم اموات کا بہت بڑا سبب ہیں۔خطرناک مصنوعات کے استعمال سے 28000 سے لے کر 130,000 افراد ہلاک ہو جاتے ہیں۔لیکن کارخانوں میں یہ تعداد اور بھی زیادہ ہے۔ یہاں کام کے دوران ساڑھے پانچ ملین کارکن زخمی ہو جاتے ہیں اور انہیں ہسپتال میں زیرِ علاج رہنا پڑتا ہے۔ ہر سال کم از کم ایک لاکھ افراد کیمیکلز اور دوسرے پیشہ ورانہ حادثات کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پیشہ ورانہ بیماریوں میں مبتلا لوگوں میں ہر سال تین لاکھ نوے ہزار نئے مریضوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔صنعتوں میں 28 ملین افراد کام کرتے ہیں۔ان میں سے ہر سال 10 ملین افراد کو کارسینوجن میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے۔کینسر سے مرنے والوں میں سے 22 سے 38 فی صد افراد کام کے دوران کارسینوجن سے متاثر ہوئے۔

لیکن مسئلے کی بے اندازہ سنگینی کی طرف یہ سب مبہم اشارے ہیں۔ اس موضوع پر تحقیق نہ ہونے کی بنا پر، ہم سفید پوش لوگوں کے جرائم کی اصلی لاگت کے متعلق ایک غیر حقیقی سا قیاس ہی کر سکتے ہیں۔

اس مسئلے کا دوسرا رخ بھی ہے۔

مارگن اور رینالڈ (Margon O Renold) اقتصادیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کی رائے میں سفید پوشوں کے جرائم کوئی سنجیدہ مسئلہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب جرم کا ذکر آتا ہے تو لوگوں کی نظر سڑکوں اور بازاروں میں ہونے والے جرائم کی طرف جاتی ہے جس سے وہ خوف زدہ ہیں۔ وہ ان مالیاتی ساز باز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جسے سفید پوشوں کا جرم کہا جاتا ہے۔ اس تصور سے کچھ لوگوں نے درمیانے طبقے کے اس مفروضے کو بدلنے کی کوشش کی ہے کہ جرائم صرف نچلے طبقے کی سرگرمی ہے۔ واٹر گیٹ سکینڈل اور کارپوریشنوں کی طرف سے بیرون ملک دی جانے والی رشوت کے جرائم کے نفرت کو کچھ دانشوروں نے بڑی ہوشیاری سے استعمال کر کے یہ خیال پیش کیا ہے کہ اونچے طبقے میں ہونے والے جرائم کے مقابلے میں دوسرے جرائم بے معنی ہو جاتے ہیں۔

سفید پوشوں کے جرائم میں خیانت، ٹیکس فراڈ، کمپیوٹر جرائم، زمینوں کی سکیمیں، سرمایہ کاری کی فریب کاریاں، قیمتوں کا مارکیٹ کے برعکس تعین کرنا، خطرناک مصنوعات کی تیاری اور فروخت، آلودگی، غلط سرمایہ کاری، دکانوں سے چوری اور کریڈٹ کارڈ کے فراڈ وغیرہ سب شامل ہیں۔

صارفین کی طرف داری کرنے والوں کے خیال میں قیمتوں کے تعین، زہریلی ہوا، زمین اور پانی اور سرکاری افسروں کی بد دیانتی کی بنا پر امریکی معاشرے کو ہر سال 200 ملین ڈالر کے برابر قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

وائٹ کالر جرائم کی اس متنوع نوعیت کے پیشِ نظر ان جرائم، میں جن کے متعلق سب اتفاق کرتے ہیں جیسے دھوکہ دہی اور فراڈ سے دوسروں کی املاک کو اپنا لینا اور دوسرے جرائم میں جن کی نوعیت واضح نہیں ہے، ہمیں فرق کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ میڈیا نے کارکنوں کی چوریوں کے سلسلے میں کمپیوٹر جرائم کو بہت اچھالا ہے۔ امریکہ کے ویلز فارگو بینک (Wells Fargo Bank) کے کمپیوٹر سسٹم سے 21.3 ملین لے اڑنے والے تین افراد کو میڈیا نے خوب ہوا دی۔ اعداد و شمار کی ترسیل کرنے والی لائنیں روزانہ چار سو ملین ڈالر بنکوں میں ادھر سے ادھر کرتی ہیں۔

MashalBooks.org

یہ ہدف بڑا پرکشش ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ کمپیوٹر جرائم کاروبار کی لاگت میں اضافہ کرتے ہیں (1982ء میں کمپیوٹروں کی حفاظت پر 150 ملین ڈالر خرچ کئے گئے) تاہم نجی کاروبار کی اہلیت کار اور اس متفقہ رائے نے کہ کاروباری املاک کا تحفظ قانون نافذ کرنے والے سرکاری اداروں کا نہیں بلکہ نجی تحفظ کا مسئلہ ہے، اس معاملے کو حدود کے اندر ہی رکھا۔ یہ درست ہے کہ نقصان کے بعد پشیمانی کی بنا پر کاروباری ادارے پولیس کے ساتھ تعاون نہیں کرتے۔ وہ اپنے کارندوں کو خاموشی سے نکال دینے کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنے کاروبار کے ضابطوں پر نظرِ ثانی کرتے رہتے ہیں کہ مزید قانونی کارروائیاں مسئلے کی شدت کو کم کردیں گی۔ نجی اداروں کو مجموعی مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں۔ دکانوں سے کارندوں کے ہاتھوں چوری کی مختلف صورتیں، دھوکہ دہی وغیرہ کا زیادہ تعلق اندرونی ضابطوں سے ہے۔

وائٹ کالر جرائم کی دوسری قسم کا تعلق زمین، ٹیکس کی چوری یا اخفا، سرمایہ کاری میں دھوکہ دہی اور دھوکہ بازوں کے ہاتھوں سرمایہ کاری ہے۔ اس کا حل زیادہ تر صارفین اور سرمایہ کاری کرنے والوں کی دانشمندانہ روش پر ہے جو اس تنبیہہ کو پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ ''مشتری ہوشیار باش'' اور بااعتماد اداروں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ایسے جرائم دیوانی اور فوجداری قوانین کی حدود کو مسخ کردیتے ہیں۔ امریکہ میں سال 1970 کے انفلوائنس اینڈ کرپٹ آرگینائزیشنز ایکٹ (Influence and corrupt Organisation Act) نے دیوانی اور فوجدار قوانین کو ملا کر ایک طاقتور پیکج بنایا ہے لیکن اس کا نفاذ متنازعہ ہے کیونکہ اس قانون کی رو سے قانون پابندی کرنے والی تمام فرمیں معمولی تجارتی تنازعوں پر بھی قانون کی زد میں آسکتی ہے۔

سرکاری ضوابط

امریکہ میں وائٹ کالر جرائم کے متعلق زیرِ سماعت بہت سے مقدمات ایسے جرائم پر مشتمل ہیں جو سرکاری ضابطوں کے پیدا کردہ ہیں۔ ہر سال کانگرس میں بیس ہزار بل پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہزار بل پاس ہو کر قانون بن جاتے ہیں۔

افسروں کی کتابوں میں موجود تمام ضابطوں کو نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ جب قوانین ضرورت سے زیادہ ہو جائیں تو ان کا نفاذ بھی مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ قانون سے ناواقفیت بھی ایک موثر

MashalBooks.org

ہتھیار بن جاتا ہے۔ مداخلت پسند معاشرہ لازمی طور پر بددیانت ہوجاتا ہے۔ دیانت داری کے خاتمے سے امریکہ ایک دھوکے باز قوم تیار کررہا ہے۔ پوری قوم کو دھوکے باز کہنا جرم کی تعریف کو بھی ذلیل کردیتا ہے۔

وائٹ کالر جرائم کی مشکوک نوعیت

امریکہ میں بیشتر کاروبار قانون کی حدود کے اندر ہوتا ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ سنگین قانون شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سال 1981ء میں سب سے بڑی تیل کمپنیوں میں سے 25 کو 50 ہزار ڈالر جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ وہ مجرم قرار دی گئیں یا انہوں نے الزامات سے انکار نہیں کیا۔ گیارہ کمپنیوں پر جرم ثابت نہیں ہوا۔ تیل کمپنیوں میں جرائم کا ارتکاب سب سے زیادہ ہوا۔ اس کی وجہ حکومت کے غلط احکام تھے۔ دوسرے نمبر پر اینٹی ٹرسٹ قوانین کی خلاف ورزیاں تھیں۔ ان جرائم کی بنیاد مشکوک اور قابلِ اعتراض اقتصادی نظریات تھے۔

نجی شعبے میں بددیانتی کی وبا بڑی قدیم ہے۔ اکثر وائٹ کالر جرائم کی اصطلاح عوام کی توجہ جرائم کے اصلی مسئلے سے ہٹانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس سے کاروبار کی لاگت میں اضافہ ہوتا ہے، تجارت اور پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہے۔ نجی کاروبار کی اہلیت اسے حدود سے تجاوز نہیں کرنے دیتی۔ بہت سے وائٹ کالر جرائم مصنوعی ہوتے ہیں کیونکہ یہ ریگولیٹری حکومت کی توسیع سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی حکومت کے ایسے قوانین جن کا خود حکومت کو پاس نہیں کاروباری لوگوں اور عوام کے احترام کو ختم کردیتے ہیں۔ ٹیکس کی چوری بھی ٹیکس قوانین کے جال کی پیدا کردہ ہے جس نے تعمیل کو کھوکھلا کردیا ہے۔

سزا کا مسئلہ

ان جرائم کے مرتکب افسروں کے لئے سزا لازمی ہے۔

ایک امریکی عدالت نے چاندی صاف کرنے والی ایک کمپنی کے تین اہل کاروں کو مقدمہ قتل کا فیصلہ سناتے ہوئے پچیس پچیس سال قید اور ایک ایک ہزار ڈالر جرمانے کی سزا سنائی۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے حفاظتی تدابیر اختیار کئے بغیر کارکنوں کو ان بھٹیوں پر کام پر لگایا جہاں سے سائنائڈ کی مہلک بھاپ خارج ہوتی تھی۔

قانون دان شاید اس فعل کو قتل قرار نہ دیں کیونکہ سزا پانے والے ان اہل کاروں کی نیت ان کارکنوں کو قتل کرنے کی نہیں تھی۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ ان کی غفلت اور نااہلی کی بنا پر مجوزہ حفاظتی تدابیر اختیار نہیں کی گئی تھیں۔

باقی پیشوں کے مقابلے میں کاروبار میں بددیانتی زیادہ نہیں لیکن کمپنی کی کارکردگی یعنی زیادہ آمدنی کا لالچ موجود ہے۔ اس طرح کمپنی کے اہل کار اصولوں کو توڑ موڑ کر کمپنی کی کارکردگی بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ابھی تک امریکی عدالتیں مجرمانہ کارروائیاں کرنے والے اہل کاروں سے نرمی کا برتاؤ کرتی آ رہی تھیں لیکن اب وہاں حالات بدل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جنرل الیکٹرک کے تین افسروں کو جعلی قیمتیں مقرر کرنے پر جیل بھیج دیا گیا۔ حال ہی میں ایک صنعت کار کو محکمہ دفاع کو پیراشوٹ کی ناقص ڈوریاں فروخت کرنے پر جیل جانا پڑا۔

بڑے اداروں کے سربراہ اکثر یہ کہہ کر بچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انہیں اپنے کارکنوں کی قانونی خلاف ورزیوں کا علم ہی نہیں تھا اور سرکاری وکیل بھی اس کی تردید کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

بعض اوقات کاروباری اداروں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جرم تو سرزد ہوتا ہے لیکن اس کا ارتکاب کرنے والے یا والوں کا پتا نہیں چلتا۔ ایسی صورت میں کمپنی کو جرمانہ کر دیا جاتا ہے۔ امریکہ کی سیمی کنڈکٹر کارپوریشن کو بغیر جانچ پرکھ کئے فوج کو مال بیچنے پر 1.75 ملین ڈالر جرمانہ ہوا لیکن کمپنی کے کسی اہل کار کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکا۔ اسی طرح نیویارک کے چار بنکوں کو کرنسی کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر جرمانہ ہی ادا کرنا پڑا اور اس کے افسر سزا سے بچ گئے۔ تیسری مثال ہٹن اینڈ کمپنی کی ہے۔ یہ امریکہ کے بڑے دلال اداروں میں سے ایک ہے۔ اسے بنکوں کو دھوکہ دہی کے جرم میں دو ملین ڈالر جرمانہ ادا کرنا پڑا لیکن عدالت کسی فرد کو قابل مواخذہ قرار نہ دے سکی کیونکہ ذمہ داری اس ادارے کی بلند سطح پر پہنچتی نظر نہیں آتی تھی۔

وائٹ کالر جرائم کے خاتمے کے لئے لازمی ہے کہ ادارے کے ذمہ دار افراد کو سزا دی جائے تا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ سزا کا ایک مقصد عبرت بھی ہے تا کہ دوسرے یہ جرم نہ کریں۔ یوں سزا انسداد جرائم میں بھی معاون ہوتی ہے۔ کمپنی کو تو قید نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر جرمانہ ہی عاید کیا جا سکتا

MashalBooks.org

ہے یا اسے بند کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک بڑے اداروں کا تعلق ہے تو جرمانے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ پھر یہ جرمانے بھی تو آخر کمپنی کی مصنوعات کو استعمال کرنے والوں کی جیب ہی سے جاتے ہیں کیونکہ ان جرمانوں کو ادارے کے اخراجات میں شامل کرلیا جاتا ہے۔

دفاع کے محکمے غلط کار اداروں کو آئندہ ٹینڈر دینے کے لیے نااہل قرار دے سکتے ہیں۔عملاً یہ سارا بوجھ چھوٹے اداروں پر ہی پڑتا ہے جو ایسے محکموں کو مال سپلائی کرتے ہیں۔لیکن بڑی کمپنیوں، جیسے امریکہ کی جنرل ڈائنامکس(General Dynamics) پر کیسے پابندی لگائی جاسکتی ہے؟ یہ واحد ادارہ ہے جو امریکی محکمہ دفاع کو ٹرائیڈنٹ آبدوز ایف16 جنگی طیارے اور ٹاماہاک میزائل بیچتا ہے۔

اگر اس قسم کے جرائم کا خاتمہ مقصود ہے تو واحد راستہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے ان اداروں میں ایسے جرائم کا ارتکاب کرنے والے افراد کو قانونی چارہ جوئی کے بعد جرم ثابت ہوجانے پر جیل بھیج دینا ہے۔

یہ اعتراض کہ جیلوں میں پہلے ہی گنجائش نہیں ہے کوئی وزن نہیں رکھتا کیونکہ گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے۔جیلوں میں توسیع ہوسکتی ہے۔

ابھی تک جج صاحبان ایسے مجرموں سے نرمی برتتے آئے ہیں۔ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ان کو ہتھکڑی لگانا اور عدالتوں میں خوار کرنا ان کے لئے کافی سزا ہے۔اس سے ایسے لوگ سبق سیکھ لیتے ہیں اس لئے انہیں جیل بھیجنا ضروری نہیں۔ممکن ہے کچھ لوگوں کے لئے یہ درست ہو لیکن سزا کا اصل مقصد تو انسداد جرائم اور دوسروں کے لئے عبرت کا سامان فراہم کرنا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب عام مجرموں کی طرح انہیں ہتھکڑی لگا کر کچھ عرصے کے لئے جیل کی ہوا کھانے کے لئے بھیج دیا جائے۔

MashalBooks.org

علم جرمیات کا ارتقاء

روایت کے مطابق جرم کا آغاز حضرت آدم کے بیٹوں ہابیل اور قابیل سے ہی ہو گیا تھا جب ایک بھائی نے دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ جرم اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسانی معاشرہ۔

قواعد وضوابط اور ان سے انحراف انسانی فطرت میں ہیں۔ اس بنا پر جرم ایک معاشرتی عمل ہے۔ خیر وشر کی داستانوں میں جرم اور مجرموں کے متعلق گناہ، بدکرداری، بدمعاشی اور انحراف وغیرہ پر بحث اور کردار کی وضاحت کے لئے بڑی بڑی تعمیمات وضع کی گئیں جو اساطیر، کونیات، الہیات اور مابعد الطبیعیات میں کج رو اور انحراف کرنے والے انسانوں کے متعلق قضیوں کی صورت میں ملتی ہیں۔ کچھ مصنفین نے قانون شکن لوگوں سے متعلق مسلسل واقع ہونے والے موضوعات سے جرمیات پر آزادانہ بحث کی ہے۔ اس قسم کی جرمیات کی ابتدا انسانی تہذیب کے آغاز سے ہی ہو جاتی ہے۔ ان مباحث سے خواہ وہ سائنسی طریق کار پر مبنی ہوں یا نہ ہوں یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جرائم کے مظہر کو مختلف طریقوں سے زیر بحث لایا جا سکتا تھا اور ان مباحث میں خود جرمیات کا علم بھی شامل تھا۔ متقدمین اور قرون وسطی کے فلسفیوں کی کتابوں میں پیش کئے گئے قصیے، رومن کلیسا اور پروٹسٹنٹ چرچ کی روایات، جادو پر مبنی قرون وسطی کی کونیات اور جدید دور کی قانونی فکر کو اگرچہ علم جرمیات ہونے یا بننے کا کوئی دعویٰ تو نہیں مگر ان کے مرکزی خیالات انہی موضوعات سے متعلق تھے جن پر موجودہ علم جرمیات بحث کرتا ہے۔ لیکن جب ہم ان پرانے مباحث کی تفصیل میں جاتے ہیں تو ازمنہ وسطی کی فکر اور موجودہ جرمیات میں مشابہتیں کمزور نظر

MashalBooks.org

آنے لگتی ہیں۔ تقدیر یا قسمت، اولین گناہ، بھوت پریت، انسانی بدکرداری، حرص و ہوس اور لالچ ایسے موضوعات ہیں جو اسی زمانے کے ذہنوں کی پیداوار ہیں مگر ان کا کوئی تعلق ہمارے زمانے کی جرمیات سے نہیں بنتا۔

تاہم اس موضوع پر یہ روایتی فکر ہمارے اپنے زمانے کی فکر سے کوئی زیادہ دور نہیں ہے۔ ہمارے پرانے اور جدید ادب میں جرم اور مجرم، نیکی اور بدی، خیر و شر کے موضوعات بڑے عام تھے۔ ہندوستان کا پنج تنتر، ہتوپادیش، کتھا سرت ساگر اور سب سے بڑھ کر مہابھارت اور رامائن، مشرقِ وسطیٰ کی الف لیلہ، کلیلہ دمنہ، شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان اور حالیہ دور کی توبۃ النصوح، امراؤ جان ادا، طرحدار لونڈی اور فسانہ آزاد وغیرہ خیر و شر کے معاملات سے پر اور پند و نصائح سے معمور ہیں۔

دورِ جدید کا انگریزی ادب، مجرموں کی سوانح عمریوں، نشاۃ الثانیہ میں جرائم کی دنیا کے متعلق بیانات، جیسے ٹیوڈر دور کے روگ پمفلٹ (Itabis Pamphlets) الزبتھ کے زمانے کے ڈراموں، جیکو بن کامیڈیوں، ٹامس مور کی یوٹوپیا (Utopia) اور ڈیفو کے ناولوں میں جرائم پر مبادیاتی بیانات ملتے ہیں جو انحراف کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جیسے بری صحبت، عادت کی مجبوری، حرص، غفلت کا شکار بچے، محبت نہ کرنے والے والدین، شراب کی لت، کاہلی، کام چوری، بدنامی، بری شہرت، ملازمت کے حصول میں دشواریاں، غربت، نااُمیدی، لالچ اور ہوس اور ان وجوہات کی بنا پر جرائم کی طرف رجوع۔ یہ وہ مواد ہے جس سے جدید نظریات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مواد میں خالص دنیوی معاملات اور مادیت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کا اصلی نقص یہ تھا کہ ان میں اختلافی وضاحتوں یا علیات کی کمی تھی۔ یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ جرم ہمہ وقت موجود تحریص کی وجہ سے ہے اور پوری انسانیت اس کی زد پر ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کچھ لوگ تو اس تحریص سے مغلوب ہو جاتے ہیں مگر باقی کیوں محفوظ رہتے ہیں؟ یوں یہ ساری وضاحتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور قسمت، تقدیر، خدا کی مرضی، مشیت ایزدی کے سوا اور کوئی جواب بن نہیں پڑتا۔ چنانچہ جب بطور علم کے جرمیات کا آغاز ہوا تو بنیادی سوال یہی تھا ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ تو جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن بیشتر معاشرے کے قوانین کی پابندی کرتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں علم جرمیات مختلف نظریات وضع کرتا ہے۔

MashalBooks.org

قرون وسطیٰ کے دوران سزائیں بڑی شدید اور من مانی ہوتی تھیں۔ جرائم اور ان کی سزاؤں میں کوئی تناسب نہیں تھا۔ اکثر یہ دیکھا جاتا تھا کہ مدعی کون ہے اور ملزم کون اور سزائیں انہی کی مناسبت سے ہوتی تھیں۔ قرون وسطیٰ کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ مختلف جرائم پر سزائے موت دینے کا رواج عام تھا۔ یورپ کے کئی ممالک میں چھوٹے سے چھوٹے جرائم کی پاداش میں مجرم کو زندگی سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ انگلستان میں چھوٹے چھوٹے ایسے بیس جرم تھے جن کی سزا موت تھی۔ اگر کسی شخص نے قرض واپس نہ کیا ہوتو اسے اس وقت تک قید کر دیا جاتا تھا جب تک قرض ادا نہ ہو جائے۔ ہمارے ہاں بھی پچاس ساٹھ سال پہلے ایسا ہی قانون تھا۔ یہ سزائیں اکثر من مانی اور گھناؤنی ہوتی تھیں اور ان میں کمی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ ان میں تشدد اور مجرم کو اذیت دینے کا سامان وافر ہوتا تھا۔

یورپ میں اٹھارویں صدی خرد افروزی کا دور تھا۔ اطالوی دانشور بیکاریا (Beccaria)(1728-1791) جو ماہر اقتصادیات بھی تھا، اسی تحریک سے متاثر تھا۔ اسے فوجداری نظام انصاف کا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا لیکن چھبیس سال کی عمر میں اس نے اس موضوع پر ایک کتاب (Dei Delittie Delle Pene) کے عنوان سے 1761 میں شائع کی۔ اس موضوع پر یہ پہلی منظّم دستاویز تھی اور اس نے قانون اور انصاف کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا۔ تقریباً پورے یورپ میں اس کا اثر محسوس کیا گیا۔ چھ ماہ کے عرصے میں اس کتاب کے سات ایڈیشن شائع ہوئے۔ یورپ کی کئی زبانوں ......انگریزی، جرمن، پولش، ہسپانوی اور ولندیزی......میں اس کے تراجم شائع ہوئے۔ جے۔اے۔ فریر نے انگریزی ترجمہ ''آف کرائم اینڈ پنشمنٹ'' (of Crime and Punishment) کے نام سے 1780ء میں شائع کیا۔ فوجداری نظام انصاف کے اصولوں پر اولین منظّم اور عظیم تصنیف ہونے کی بنا پر اس کتاب نے پوری ممالک کے فوجداری نظام ہائے انصاف کو اس حد تک جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ اس کا اثر آج بھی محسوس کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب میں پیش کئے گئے کئی خیالات سے بیکاریا کے کچھ ہم عصر علمی حلقے واقف بھی تھے۔ بیکاریا نے انھی سے استفادہ کیا اور اس کا اظہار بھی کیا۔ تاہم اس کی یہ کتاب جرمیات کے موضوع پر بہت بڑی پیش رفت تھی۔ اس کے دلائل کا محور افادیت پسند فلسفہ تھا جس کا ہدف ''زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ بھلائی'' ہے۔ ممکن ہے کہ یہ فلسفہ خود اسلامی

MashalBooks.org

نظریہ ''حکمت خیر کثیر'' سے متاثر یا ماخوذ ہو۔

اس زمانے میں مجرموں کو دی جانے والی ظالمانہ اور وحشیانہ سزاؤں، خفیہ عدالتی کارروائیوں، منصفوں اور ججوں کی بے ایمانیوں اور رشوت ستانیوں پر بیکاریا نے بڑی بے رحم مگر حقیقت پر مبنی تنقید کی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ فوجداری نظام انصاف کا محور سزا کی ناگزیری ہے نہ کہ اس کی شدت۔ اس نے پرزور اصرار کیا کہ جرائم اور سزاؤں میں کوئی منطقی تناسب ہونا ضروری ہے۔ وہ دور جدید کا پہلا مصنف ہے جس نے سزائے موت کے خلاف احتجاج کیا اور اس کے مکمل خاتمے کا مطالبہ کیا۔ مغربی ملکوں میں آج کل چلنے والی سزائے موت کے خلاف تحریک کا وہ پیش رو تھا۔

بیکاریا کے خیالات سے سارا یورپ متاثر ہوا۔ انگلستان میں افادیت پسند فلسفی جرمی بینتھم (Bentham) نے اس کے خیالات کی وسیع پیمانے پر تبلیغ کی۔ بینتھم کے شاگرد اور پارلیمنٹ کے ممبر سیموئل رومیلی (Samual Romilee) نے اپنی سیاسی زندگی کے دوران سزائے موت کو چند جرائم تک محدود کرنے کی کوششیں کیں۔ روس، سویڈن اور ہیپسبرگ سلطنت میں بھی اس کتاب کا اثر محسوس کیا گیا اور وہاں بھی قانون اصطلاحات ہوئیں۔ کئی امریکی ریاستوں میں بھی قانون سازی کے وقت بیکاریا کے وضع کردہ اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا۔

بیکاریا کی اس بااثر اور بارسوخ کتاب اور اس کے پیروکاروں کی کاوشوں سے جرمیات کا علم تو وجود میں نہ آیا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس موضوع کے علمی ارتقا کے لئے انہوں نے ایسے حالات اور ماحول پیدا کر دیا جس کے اثرات کے تحت اس علم کے لئے آئندہ راہ کافی حد تک ہموار ہوگئی۔ بیکاریا، بینتھم اور اس کے شاگرد رومیلی، آسٹن اور ان کے پیروکاروں کی کوششوں سے ایک نئے شعبہ علم کی طرف پیش قدمی ضرور ہوئی اور ان لوگوں نے اس علم کے لئے پیش آہنگ کا فریضہ سرانجام دیا۔

شہروں میں مارکیٹیں وجود میں آچکی تھیں اور انہیں جرائم کے خطرات درپیش تھے۔ بیکاریا اور اس کے ساتھیوں نے ان خطرات کا جواب ذہنی سطح پر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ان نئے مسائل کا حل تلاش کر رہے ہیں جو پرانے روایتی معاشرے میں موجود نہیں تھے۔

یہ امر بڑا اہم ہے کہ بیکاریا، بینتھم اور ہاورڈ جیسے مفکروں نے خالص دنیوی اور مادی تجزیات پیش کئے اور اس موضوع پر الہیاتی طریق استدلال کو بیکار قرار دیا۔ انہیں یقین تھا کہ ان

کی سوچ بڑی معروضی ہے اور وہ اس موضوع پر بڑے سائنسی طریقے سے اظہار خیال کر رہے ہیں جس پر پہلے توہمات، غیر منطقی استدلال اور تعصّبات سایہ فگن تھے۔

مثبت فکر کے پیرکاروں نے ان کی کارکردگی کو مشاہدات کی بجائے قیاسات پر مبنی ''غیر سائنسی'' قرار دیا اور اس لئے اسے کلاسیکی مکتب کا نام دیا گیا۔

بیکاریا کی کتاب اور اس کے ہم نواؤں کی کوششوں سے انیسویں صدی میں اصلاحات کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ جیلوں اور فوجداری نظام انصاف میں اصلاحات ہوئیں۔ اس دوران اس موضوع پر اور بھی بہت کچھ لکھا گیا جو اگر چہ جرمیات کی تاریخ کا حصہ تو ہے مگر اس علم کے موجودہ تصور سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔ بیکاریا کے خیالات پر ہونے والی تنقید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مکتب فکر پر آزاد ارادے کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کی بجائے لاک(Lock) کی تجرباتی نفسیات اور سکاٹش این لائیٹن منٹ(Scotish Enlightenment) کے پروردہ علم الانسان، (Science of Man) کے سائے زیادہ گہرے تھے۔

انیسویں صدی میں انسانی کردار اور رویوں کے نئے تصورات قائم ہوئے۔ ان کی زیادہ تر ترقی طبی شعبے اور نفسیاتی طب میں ہوئی۔ فزیانوی (علم قیافہ) کا فن ترقی پر تھا۔ یورپ میں یہ سترھویں صدی مین شروع ہو چکا تھا۔ یہ فن ہمارے علم قیافہ سے بہت مشابہ تھا جس کے ذریعے انسان کے چہرے مہرے اور نقوش سے علامات خیر وشر کو پہچانا جا سکتا ہے اور اس کے کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں اس فن کی نشوونما میں جے۔سی۔ لیویٹر کا مقام بڑا اہم ہے جس نے اپنے مقالات میں اس فن کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی۔ اس صدی کے آغاز میں ہی ایف۔ جے۔ گال(F.J.Gaul) نے کرینومیٹری(Cranometry) اور جے۔سی۔ سپرھیم(J.C.Superuheim) نے قصفیات (فرینولوجی) کے متعلق یہی دعوے پیش کئے۔ ان کی توجہ انسانی کھوپڑی پر مرکوز تھی جو ان کے خیال میں انسانی کردار اور رویوں کا بیرونی اظہار تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ ایک فرد کی ذہنی طاقتیں ان جداگانہ صلاحیتوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک دماغ کے ایک متعین خطے میں اپنی جگہ رکھتی ہے اور اس خطے کا حجم جو کھوپڑی کی شکل میں مفروضہ طور پر ظاہر ہوتا ہے، اس مخصوص خطے کی نشوونما سے متناسب ہوتا ہے۔1830ء تک یہ دونوں علوم اپنی کشش اور سائنسی اعتماد کھو چکے تھے اور صرف شعبدہ بازوں

MashalBooks.org

تک محدود ہو گئے تھے۔ مگر جسمانی ساخت اور نفسیاتی کردار کے درمیان روابط کی تلاش نے تحقیق کو ایک نیا رخ دے دیا۔ اس تبدیلی سے سائیکیٹری کے علم کی ابتدا ہوئی۔

اٹھارویں صدی میں اصلاحات کے لیے نئے نئے قائم شدہ دارالامان اور پناہ گاہوں کی بنا پر نئی طبی تخصیص کو ترقی ملی۔ اسے پہلے ایلین ازم (Alienism) کہا جاتا تھا۔ پھر اس کا نام سائیکولاجیکل طب (نفسیاتی طب) رکھا گیا اور بعد میں یہ سائیکیٹری کہلانے لگا۔

دماغی امراض کے اداروں کے کارندوں نے مریضوں پر اپنے مشاہدات قلم بند کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ان اداروں میں داخل مریضوں کے کردار، پاگل پن سے پہلے کے کوائف اور کارگر علاج کے طریقوں پر مشاہدات شامل تھے۔ اس سے ایک نئی سائنسی تحقیق کی روایت کا آغاز ہوا اور ساتھ ہی بعد میں آنے والے علم جرمیات کے لئے بہت سارا خام مواد اکٹھا ہو گیا۔

تحقیق کی اس نئی روش کی بدولت نفسیاتی رجحانات اور جسمانی ساخت کے درمیان روابط نے ایک پائیدار روایت کی صورت اختیار کر لی۔ ان پناہ گاہوں میں طویل المدت قیام کرنے والوں پر مشاہدات کے ذریعے بہت وافر مواد اکٹھا ہو گیا جس میں کیس ہسٹریز اور ان کی دیوانگی کے متعلق بے قاعدہ اور طبی علاج کے ردعمل کے تجزیات بھی شامل تھے۔

ایسے مطالعات کو مارکیٹ، اخلاق یا غربت کے متعلق مطالعات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب کا مقصد رعایا پر حکومت کی گرفت مضبوط کرنا تھا۔ لیکن جب تخصص کا دور دورہ ہوا تو حکومتی معاملات جرائم کے معاملات سے الگ ہو گئے۔ انیسویں صدی کے ماہرین فرینولوجی اور سائیکیٹری کے کام کو بھی اسی تناظر مین دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ علوم سائنسی اصطلاحات میں انسانی کردار کے تجزیے کر رہے تھے، انسانی کردار کے مختلف نمونوں کو پہچان رہے تھے اور مریضانہ کردار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ لیکن ابھی تک مجرم پر بطور ایک مخصوص انسانی نمونے کے توجہ مرکوز نہیں ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں انتظامیہ اور طبی شعبوں سے جرمیات کا مطالعہ الگ ہونے لگا۔

اس فکر کے دوسرے اہم مرحلے کا آغاز ایک دفعہ پھر اطالوی دانشور سے ہی ہوا۔ اس کا نام لومبراسو (Lombroso) (ویرونا 1835۔ ٹیورن 1909) تھا۔ وہ بنیادی طور پر ماہر نفسیات تھا۔ اس کی کتاب ''دی کریمنل مین'' (The Criminal Man) 1876 میں شائع ہوئی۔ اپنی پہلی اشاعت میں اس کتاب کے صرف 252 صفحات تھے لیکن 1895 میں اس کا پانچواں ایڈیشن تین

جلدوں پر مشتمل تھا اور صفحات کی تعداد 1202 ہوگئی تھی۔ چونکہ لومبراسو بنیادی طور پر سائی کیٹرسٹ تھا، اس لئے اس کا نظریہ تھا کہ مجرم پیدا ہوتے ہیں یا وہ افراد ہوتے ہیں جن کی ذہنی نشوونما رک جاتی ہے۔ وہ ذہنی طور پر معاشرت کی ارتقا کا ساتھ نہیں دے سکتے اور پیچھے رہ جاتے ہیں اور اس ذہنی سطح پر نہیں پہنچ پاتے جہاں معاشرہ پہنچ چکا ہوتا ہے۔

اس کے نظریے کے مطابق مجرموں کو ان کے خدوخال اور چہرے کی بناوٹ سے پہچانا جاسکتا ہے۔ اس دانشور کی علمی اور عملی زندگی کا بیشتر حصہ ٹیورن یونیورسٹی میں گزرا جہاں وہ کریمل سائیکالوجی کا پروفیسر رہا۔ وہ مجرموں کے ساتھ انسانی سلوک اور اصلاح کا قائل تھا۔

جرمیات کے مخصوص علم کا خیال خاص ذہنی کاوشوں اور ایک خاص سماجی سیاق وسباق کے درمیان عمل اور ردعمل سے پیدا ہوا۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے جب یہ معلوم ہوا کہ کچھ تصورات اور تحقیق کا تعلق ایسے شعبوں سے ہے جنہیں پہلے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے تو اس وقت تصورات کی تاریخ میں ایک بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ وہ سائنسی تحقیق جس نے لومبراسو کی ''سائنس آف کریمینالوجی'' کی بنیاد رکھنے میں راہنمائی کی تھی اور جو موجودہ جرمیات میں ایک کلیدی حیثیت رکھنے والا موضوع تھا، اصل میں کسی طرح بھی جرمیات سے متعلق نہیں تھا۔

لومبراسو کے نظریے انسانی تن پیمائی (این تھروپومیٹری) (Antheropometry) اور قحفیات یا علم الراس (کرینالوجی) کے طریق کار سے انسانوں کے جسمانی خدوخال کو ناپ کر بشریاتی نقطہ نظر سے انسان اور اس کی انواع کا مطالعہ کرنا تھا۔ وہ پال بروکا اور ارتقا میں ڈارون کے خیالات سے متاثر تھا۔ اس کا اطالوی فوجی رنگروٹوں اور دارالامانوں میں بند مریضوں کا مطالعہ دراصل مختلف نسلی نمونوں پر معلومات اکٹھی کرنے اور انسانوں کو مختلف زمروں میں بانٹنے کی کوشش تھی۔

لومبراسو کے ہاتھوں علم جرمیات کا انکشاف ایک اتفاقیہ امر تھا۔ ''نابغہ، مراقی اور پاگل'' جیسی اصطلاحوں یا نمونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسلی بشریات نے 1870 میں طاقتور سماجی معاملات پر چھانا شروع کر دیا تھا۔ یہ انسانی نمونے ارتقائی عمل سے کہیں زیادہ معاشرتی معاملات سے متعلق تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انکشاف پہلے سے موجود ایک مستحکم تحقیقی روایت ہی کی توسیع تھی اور ماڈزلے جیسے ماہر سائی کیٹرسٹ اور جیل کے ڈاکٹر بروس ٹامسن کے مشاہدات کا زیادہ

واضح اور صریح اظہار تھا۔

اگرچہ لومبراسو کی ''دریافت'' ایک پرانی خبر تھی لیکن اس کی اہمیت حیرت انگیز تھی۔ مجرم ٹائپ کی الگ شناخت نے ایک ایسے خیال کی طرف راہ نمائی کی جو پہلے کسی کو نہیں سوجھا تھا۔ یہ تھا مجرموں کے متعلق ایک علیحدہ علم۔ اس خیال نے کہ مجرم قدرتی طور پر پیدا ہونے والا وجود ہے۔ لومبراسو کی سائنس کی طرف راہنمائی کی جو اپنی توجہ اس وجود پر مرکوز کرے، اس کی نمایاں صفات کا پتا چلائے، اس کے کلنک کا سراغ لگائے، اس کے غیر معمولی پن کی نشان دہی کرے، اور آخر میں ان وجوہات کو تلاش کرے جو ایک شخص کو تو مجرم بنا دیتی ہیں اور دوسرے کو قانون کی پابندی کرنے والا نارمل انسان۔

اس نظریے میں خامیاں تو تھیں لیکن اس کی بنا پر سائنسی طریقوں سے مجرم کو شناخت کرنے کا امکان بہت جلد مقبول ہو گیا۔ لومبراسو کی کتاب (L'Uomo Delinquente) 1876 میں شائع ہوئی تھی اور بیس سال کے اندر ہی اس نظریے نے بین الاقوامی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ نئی انجمنیں تشکیل ہونے لگیں، بین الاقوامی کانگرسیں منعقد ہونے لگیں، خصوصی جریدے شائع ہونے لگے اور یورپ کی مختلف اقوام میں جرائم سے متعلق نئے مکاتب فکر وجود میں آنے لگے۔ یورپ اور امریکہ میں متعلقہ افسروں کے مطالعے کے لئے بنیادی مواد اکٹھا ہونے لگا۔

کتاب کے منظر عام پر آنے کے چند سال کے بعد ہی لومبراسو کے شاگردان رشید نے اس نئی تحقیق اور اس کے عملی مضمرات کی اشاعت کے لئے ایک جریدہ لاسکولا پوزیٹیوا (Le Scolla Positiva) جاری کیا۔ لیکن دوسرے شاگرد ایز یکو فیری، رافیلے گوروفالو صرف اپنے استاد کے ابتدائی خیالات کی تبلیغ پر ہی قانع نہیں رہے۔ انہوں نے ابتدائی اطالوی مکتب فکر میں خاصے تنوع اور اصطفائیت کا اظہار کیا۔ قانونی پہلوؤں اور بشریاتی کردار کا جائزہ لینے کے لئے جرمیات کے تجربات میں توسیع ہوئی۔ اس تحقیق کی اندرونی تفریق کو وسیع کیا گیا اور دوسرے حریفانہ مکاتب فکر وجود میں آنا شروع ہوئے۔ دو مکتب فکر زیادہ نمایاں تھے۔ پہلا فرانسیسی مکتب فکر تھا جس نے جرائم کے ماحولیاتی اور معاشرتی تعین کنندگان (determinents) پر زور دیا اور انسانی جسم میں غیر متغیر صفات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ دوسرا جرمن سکول تھا جس نے کریمینلسکس (Criminalistics) کا مطالعہ اور فورنزک (Forensic) تیکنک کو ترقی دی۔

MashalBooks.org

1882ء میں منعقدہ بین الاقوامی کانگرس نے ان تنازعات کو بڑی ہوادی۔ اس سے فریقین میں خاصی تلخی بھی پیدا ہوئی اور لومبراسو کے دعووں میں ترامیم بھی کی گئیں۔ پیدائشی مجرم اور اصلاح کے نقطہ نظر سے اس کے قائم کردہ مضمرات میں بھی ترمیم کی گئی۔

ان سرگرمیوں سے اور خصوصاً پرنز سیلیلیس اور فان ہیمر کی کوششوں سے وہ تحریک پیدا ہوئی جو دراصل مجرمانہ بشریات کے مقابلے میں کہیں زیادہ اصطفائی اور کہیں زیادہ عملی تھی۔ یوں لومبراسو کے خیالات میں ترامیم، ان پر نظر ثانی اور ان کی تشکیل نو کے بعد جرمیات کی ترویج زیادہ قابلِ قبول طریقے سے ہوئی۔ یہ واقعہ 1890ء میں پیش آیا۔ اس کے بعد جرمیات کا یہ علم مجرمانہ بشریات کے مترادف نہیں رہ گیا تھا بلکہ یہ ایک غیر جانبدار جزک اصطلاح بن گئی تھی جس نے اصلی اصطلاح کی جانبدارانہ روش کو ترک کر کے مجرمانہ معاشرتی علم، مجرمانہ حیاتیات اور مجرمانہ نفسیات جیسے شعبوں سے اپنے آپ کو الگ کر لیا تھا۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں پیدا ہونے والے علم جرمیات کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں:

- ☆ یہ ایک سائنسی روش تھی۔ اس کا مقصد مجرموں کے متعلق مثبت اور استقرائی منطق پر مبنی حقائق، معلومات، مشاہدات اور پیمائشیں جمع کرنا تھا۔
- ☆ نظام عدل کو متاثر کرنے والے انسانی کردار کے متعلق قیاساتی فکر کو مسترد کرنا تھا۔
- ☆ لومبراسو کے نظریات کے مطابق اس جرمیات نے اپنی توجہ انفرادی مجرم اور اس کی نمایاں خصوصیات پر مرکوز جو اسے قانون کی پابندی کرنے والے افراد سے الگ کرتی تھیں۔
- ☆ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اس وقت تک کی سائنسی تشریحات بے قاعدہ تشریحات تھیں اس لئے جرائم کے اصل اسباب کا کھوج لگانا چاہیے۔ لفظ وجوہات کے وسیع تر مفاہیم میں کافی تنوع تھا۔ دوسروں کے مقابلے میں ان میں زیادہ تعین کنندگان کے علاوہ مجرموں کی مختلف اقسام میں جسمانی نقائص سے شروع ہو کر حادثاتی اور معاشرتی حالات تک شامل تھے۔
- ☆ سب سے اہم بات یہ تھی لومبراسو نے اس نئے مریضانہ مظہر، یعنی جرمیت پر تحقیق کا آغاز کیا جو اس کی نظر میں مجرمانہ روش کا سرچشمہ تھا اور عملی تجاویز کے پیش نظر یہی اس کے وجود کا جواز اور مقصد تھا۔

اس دانشور اور اس کے پیروکاروں کے افکار کو جرمیات کے پوزیٹیوسٹ

MashalBooks.org

(Positivist) مکتب فکر کا نام دیا جاتا ہے۔

کلاسیکی اور پوزیٹیوسٹ مکاتب فکر پر کافی تنقید ہوچکی ہے اور یہ اب بھی موضوع بحث ہیں۔ ان دونوں دانشوروں کی کاوشوں سے جرمیات کا علم تو وجود میں نہیں آیا لیکن اس سمت پیش رفت ضرور ہوئی۔ کلاسیکی مکتب نے اپنی توجہ جرم اور سزا پر مرکوز کی اور پوزیٹیوسٹ سکول کے مباحث کا محور جرم کی بجائے مجرم تھا۔ دونوں کا طریق کار بھی مختلف تھا۔ بیکاریا کا طریق کار قیاسی تھا۔ اس نے معاشیات اور جرم میں رشتے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ بیکاریاں کے مقابلے میں لومبراسو کا طریق کار تجرباتی تھا۔ اس لئے وہ سائنسی طریق کار سے زیادہ قریب تھا۔ ان دونوں مکاتب فکر کے بیشتر نتائج مسترد ہوچکے ہیں لیکن جرمیات میں یا کم از کم اس کی تاریخ میں ان کی اپنی اہمیت ہے۔ سزائے موت کے خلاف بیکاریا کے احتجاج کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے اور لومبراسو کی حیاتیاتی تحقیقات کو آج کل کے حکما اور زیادہ باریکی سے دیکھ رہے ہیں۔

علم جرمیات کے ابتدائی ارتقا میں یہ دونوں اہم اقدام تھے۔ جیسے کہ اوپر ذکر آچکا ہے ان دانشوروں کی کتابوں سے اس موضوع پر وسیع پیمانے پر مباحث کا آغاز ہوا اور اس میں دوسرے علوم ......عمرانیات، بشریات، اقتصادیات، حیاتیات، شماریات، اخلاقیات، نفسیات اور قانون وغیرہ سے مباحث داخل ہونے لگے۔ لیکن اس ادغام کے باوجود جلد ہی اک نیا شعبہ، علم وجود میں آگیا جو جرم پر دیگر مباحث سے مختلف تھا۔ اس کے بنیادی سوالات یہ تھے، جرمیات کا علم کیا ہے؟ اس کے مرکزی خدوخال کیا ہیں؟ اور اس کے مطالعہ کے سیاسی اور ثقافتی سیاق وسباق کیا ہیں؟

مذکورہ بالا تاریخی حقائق کے پیش نظر جرمیات کا علم جرم اور مجرم کے متعلق مباحث اور تحقیق پر مشتمل ہے۔ انسانی علوم کا یہ تازہ ترین شعبہ زمانہ حال ہی میں وجود میں آیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ تجرباتی علم ہے۔ اگرچہ اس کا مرکزی خیال بھی جرم ہی ہے مگر دوسرے سماجی، معاشرتی، اخلاقی اور قانونی مباحث سے اس کی حیثیت بالکل الگ ہے کیونکہ ان دیگر علوم کے مطالعہ کے مقاصد وسیع تر ہیں اور فوجداری قوانین ان کا احاطہ نہیں کرتے۔ کئی ماہرین اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے۔

ان دانشوروں کے خیال میں تمام معاشرتی علوم کسی نہ کسی حد تک فوجداری قانون کے غیر لچکیلے پن کے خلاف ہیں لیکن ابھی تک وہ قانون کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم نہیں کرسکے۔ سائی کیٹری، نفسیاتی تجزیات اور کسی حد تک سائیکالوجی بھی اپنی اپنی توجہ فرد پر مرکوز کرتی ہین لیکن علوم

عمرانیات اور بشریات کا موضوع معاشرہ اور اس کے ادارے ہیں۔ان تمام شعبوں کے موضوعات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کے طریقہ ہائے کار بھی جدا جدا ہیں۔ ان کی اصطلاحات بھی اپنی اپنی ہیں اور یہ تمام اختلافات اس حد تک ہیں کہ ایک شعبے کا طالب علم دوسرے شعبے کو سائنس کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ جرمیات کا مقصد ان تمام علمی شعبوں کے لئے مباحث، مسائل اور ان کے حل کے لئے ایک غیر جانبدار ماحول مہیا کرنا ہے لیکن مذکورہ بالا تمام شعبوں کے ماہرین متحد ہونے کے لئے تیار نہیں۔ تاہم اداروں کے قیام، بین الاقوامی کانفرنسوں اور جرمیات سے متعلق خصوصی جراید کے اجراسے بیسویں صدی میں جرمیات کے حق میں حالات کچھ بہتر ہو رہے ہیں۔ کئی ممالک میں اس سے وابستہ لوگوں کی اہمیت ترجمانوں اور رابطہ کاروں سے بلند تر ہوگئی ہے اور اب وہ نظریہ سازوں، محققوں اور اپنے علم کو ترقی دینے والوں میں شمار ہونے لگے ہیں۔

یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تعزیرات کے علم(Penology) کے ساتھ ساتھ جرمیات کے شعبے میں بھی تحقیق کی نوعیت عملی ہے۔ کئی طریقوں سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ جرمیات میں تحقیق کے نتائج ججوں، مستغیثوں، استغاثوں سے متعلق دوسرے لوگوں، قانون دانوں اور جیل کے کارندوں کے لئے بڑے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ اب وہ انسانی اقدار کو پیش نظر رکھ کر سزائیں دیتے ہین اور جیل میں مجرموں کے ساتھ بہتر اور انسانی سلوک کرتے ہے۔ اس طریق کار میں ماہرین جرمیات کا کردار غیر جانبداری سے حقائق اکٹھے کرنا تھا۔ ان سے عملی نتائج اخذ کرنے کا کام وہ سرکاری کارندوں پر چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن یہاں بھی تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ ماہرین جرمیات اب ان حقائق سے نتائج اخذ کرنے کی ذمہ داری خود اٹھانے لگے ہیں۔ مثلاً اپنے اخذ کردہ نتائج کے پیش نظر اب یہ ماہرین سزائے موت کے خلاف مہم چلانا چاہتے ہیں مگر سزائے موت کو ختم کرنے کے لئے ان کے حقائق کو سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور سماجی تناظر میں بھی دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے اور پھر اس کا فیصلہ ان لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیئے جو سیاسی اداروں سے متعلق ہیں۔

جرمیات کے شعبے کی وسعت کے ساتھ ایک اور سوال جڑا ہوا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا سراغ رسانی، فوٹوگرافی، فنگر پرنٹس اور علم سموم (زہر) وغیرہ جیسے عملی یا مقصدی علوم کو بھی جرمیات میں

MashalBooks.org

شامل کرنا چاہئے؟ ان مضامین کو کریمنل اسٹکس (Criminalistics) کہا جاتا ہے۔ آسٹریا، بلجیم اور امریکہ کی کیلیفورنیا یونی ورسٹی میں یہ مضامین جرمیات ہی کا حصہ ہیں۔

اس شعبہ علم سے ان عملی فنون کے اخراج سے اگر چہ جرمیات کا علم ایک پورے علمی شعبے کے طور پر سامنے آتا ہے لیکن اس کے اصلی سرچشمے جیسے عمرانیات، نفسیات اور دوسرے علوم پر اس کا جزوی انحصار علمی نصاب میں اس کے مقام کے متعلق کافی ذہنی انتشار کا باعث بنتا ہے۔ یورپ کی دانش گاہیں اگر چہ اس کے علمی مقام سے پوری طرح آگاہ ہیں لیکن وہ سب اسے دوسرے علوم کا حصہ شمار کرتی ہیں۔ برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی میں بھی جرمیات کی انسٹیٹیوٹ قانون کے شعبے کا ہی ایک حصہ ہے۔ برطانیہ کی دوسرے دانش گاہوں میں اسے عمرانیات، سوشل ایڈمنسٹریشن، قانون یا سائی کیٹری کا حصہ شمار کیا جاتا ہے۔ جنوبی امریکہ میں اس پر بشریات اور طبی سانسوں کا غلبہ ہے۔ امریکہ میں چند مستثنیات ضرور ہیں لیکن اکثر اور بیشتر جرمیات کو وہاں بھی قانون کا حصہ قرار دیا جاتا ہے۔

اس صورتحال کے پیشِ نظر جس کے مطابق جرمیات کا علم دوسرے علوم میں مدغم ہوتا نظر آتا ہے، یہ حیرانی کی بات نہیں کہ اس کے ماہرین اپنے آپ کو پہلے دوسرے علوم کا ماہر سمجھتے ہیں اور بعد میں جرمیات کے ماہرین کہلانا پسند کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں جرمیات کی حیثیت ثانوی ہے۔ یہ علم بھی پوسٹ گریجوایٹ تعلیم کا حصہ ہے۔

دوسرے علوم جیسے نفسیات، سائی کٹیری، تاریخ، سوشیالوجی اور سوشل انتھروپالوجی کو بھی شروع شروع میں ایسی ہی صورتحال کا سامنا تھا اور وہ بھی اسی راستے سے گزر کر اس علمی مقام پر فائز ہوئے جہاں وہ آج ہیں۔

تحقیق علم کو زندگی عطا کرتی ہے۔ جس علم میں تحقیق ختم ہوجائے وہ متحجر ہوجاتا ہے اور اس کی ترقی مسدود ہوجاتی ہے۔ جرمیات میں بھی تحقیق جاری ہے۔ اس کے تین مقاصد ہیں: بیانیہ، علیاتی اور معیاری۔

بیانیہ تحقیق کا مقصد ضروری اور قابل اعتماد حقائق اکٹھا کرنا، ان کا تجزیہ کرنا اور پھر ان سے نتائج اخذ کرنا ہے۔ حقائق کو ایک باقاعدہ طریقے سے جمع کیا جاتا ہے۔ پہلے ایک مفروضہ یا قضیہ قائم کیا جاتا ہے تا کہ محقق کو نتائج کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ یہ مفروضہ تحقیق میں نظم وضبط پیدا کرتا

MashalBooks.org

ہے۔ جیسے جیسے حقائق سامنے آتے ہیں محقق کو اندازہ ہوتا جاتا ہے کہ اس کا مفروضہ درست ہے کہ نہیں۔ اگر حقائق مفروضے کے حق میں ہوں تو تحقیق آگے بڑھتی جاتی ہے ورنہ مفروضے میں ترامیم اور تبدیلیاں کر دی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو مفروضے کو ترک بھی کر دینا پڑتا ہے یا اسے کسی بہتر مفروضے میں بدل دیا جاتا ہے۔ جرمیات کی پوری تاریخ سے ایسی تبدیلیوں کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہے۔ لومبراسو نے اپنی تحقیق کا آغاز ''پیدائشی مجرم'' کے مفروضے سے کیا تھا لیکن اپنی زندگی ہی میں اسے کئی بار اس کو بدلنا پڑا اور آخری وقت اسے یہ کہنا پڑا کہ مجرموں کی ایک تہائی پیدائشی مجرم ہوتی ہے اور باقی دو تہائی مجرم دوسرے عوامل جیسے افلاس، اخلاقی کمزوری، غلط پرورش اور مجرمانہ ماحول وغیرہ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ آج کل کوئی ماہر جرمیات پیدائشی ملزم کی ترکیب استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں۔

علیاتی تحقیق میں جرائم کی وجوہات کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اس میں حقائق کے ایک مجموعے کی حقائق کے دوسرے مجموعے سے نسبت پر غور کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک مجموعہ علت اور دوسرا معلول کہلاتا ہے۔ اگر چہ یہ مقصد اب کسی حد تک پس پشت چلا گیا ہے تاہم یہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوا۔ جرائم کے اسباب کے متعلق نظریات جرائم کے سدباب کے لئے کافی مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

جرمیات میں معیاری تحقیق کا مقام ذرا مشکوک ہے۔ جرائم کے مظہر کے متعلق قوانین کے اکتشاف کی تمام کوششیں تاحال بوجوہ ناکام رہی ہیں اور آئندہ بھی کامیابی کی اُمید کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ جسے ماہرین کسی وقت قانون قرار دیتے ہیں وہ بعد میں رجحان ثابت ہوتا ہے۔ قانون اور رجحان میں بڑا فرق ہے۔ چنانچہ جرمیات میں معیار قائم کرنے والی تحقیق کی گنجائش کم ہی نظر آتی ہے۔

علم جرمیات کی تعریف ہم ان الفاظ میں کر سکتے ہیں: جرمیات زیر بحث لاتا ہے۔ ان مباحث میں جرم کا تصور، اس کی اقسام، اس کے محرکات، انسداد، سزا، سزا کی مدت پر مقدار، اس کے طریقے اور مختلف جرائم میں ملوث افراد سے سلوک، اور نظام عدل شامل ہیں۔

بنیادی سوال تو وہی ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور دوسرے لوگ معاشرے کے قوانین کی پابندی کرتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں علم جرمیات مختلف ماہرین کے نقطہ ہائے نظر پیش کرتا ہے۔ مختلف دانشوروں نے اس سوال کے مختلف جواب

MashalBooks.org

دیئے ہیں اور جرائم کی مختلف وجوہات پیش کی ہیں۔ان پر بحیثیت مجموعی غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جرمیات پر تحقیق تین متوازی خطوط پر چل رہی ہے: حیاتیاتی،نفسیاتی اور عمرانیاتی۔

حیاتیاتی تحقیق کو لومبرا سو کے شاگردوں نے آگے بڑھایا۔ انہوں نے نہ صرف لومبراسو کے نظریات پر تنقید کی بلکہ انہیں غلط بھی قرار دیا۔انہی خطوط پر انہوں نے مزید پیش قدمی کی۔ گوروفالو(1852-1939) نے نیچرل جرائم اور پولیس جرائم میں تفریق پیدا کی۔ پولیس جرائم میں وہ سب جرائم آتے ہیں جو نیچرل جرائم کے زمرے میں نہیں آتے تھے۔اس کی نظر میں نیچرل جرائم دو بنیادی جذبات کی خلاف ورزی کرتے ہیں: بے غرض یعنی دوسروں کو دانستہ نقصان پہنچانا اور راست بازی یعنی دوسروں کے مالیاتی حقوق کی پامالی۔اس کی نظر میں نیچرل جرائم کی اہمیت اس امر میں تھی کہ وہ سنگین تھے اور یہ فوجداری قوانین اور فطری معاشرتی عملوں کو متحد کرنے والا زمرہ تھا۔اس نے اپنی کتاب کریمینالوجی(1885) میں لومبراسو کے نظریات کو ناکافی قرار دیا کیونکہ وہ نیچرل جرائم کی تشریح نہیں کرتے تھے۔

ایزیکوفیری(1856-1934) نے حیاتیاتی خطوط سے قدرے ہٹ کر سوچا۔اس کے خیال کے مطابق سماجی، اقتصادی اور سیاسی عوامل کے درمیان ردعمل جرائم کی بنیادی وجوہات ہیں۔اپنی کتاب کریمنل سوشیالوجی میں اس نے یہ اظہار خیال کیا کہ جرائم کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں جن میں بشریاتی، جسمانی اور سماجی عوامل بھی شامل ہیں۔انہی عوامل کی بنا پر مجرم پیدا ہوتے ہیں جنہیں مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پیدائشی......دیوانے......جذباتی......کبھی کبھار جرم کا ارتکاب کرنے والے اور عادی مجرم۔

اس کے خیالات میں کلاسیکی رنگ کافی پھیکا نظر آتا ہے۔

اختصار کے پیش نظر ہم دوسرے ماہرین جیسے ہوٹن (Hooton) اور شیلڈن (Shelden) کو اس لئے نظرانداز کردیتے ہیں کہ کئی حکما ان کی طرز تحقیق سے مطمئن نہیں ہیں اور اسے غیر سائنسی قرار دیتے ہیں۔نفسیاتی اور عمرانی خطوط پر مرتب ہونے والے نظریات آگے زیر بحث آئیں گے۔ان پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی جائے گی جیسے کہ انسانی فطرت کے متعلق انہیں وضع کرنے والے کے خیالات سماجی تنظیم کے متعلق ان کا نقطہ نظر، انسانی فطرت کی نشوونما کے متعلق خیالات، انحراف یا جرائم کی وجوہات اور اس انحراف کا تدارک اور مجرموں کو راہ راست

MashalBooks.org

پرلانے کے لئے تجاویز۔

غلط صحبت (یعنی Differential Association): عمرانیات پر مبنی اس نظریے کا وضع کرنے والا امریکہ کا مشہور ومعروف ماہر جرمیات ایڈون سدر لینڈ ہے جس کا ایک مختصر سا تعارف وائٹ کالر جرائم کے سلسلے میں اوپر آچکا ہے۔ سدر لینڈ نے اس نظریے کو پہلے 1939ء میں شائع کیا لیکن ضروری ترامیم کے ساتھ یہ چند برس بعد دوبارہ منظر عام پر آیا۔

اگر اس نظریے میں اصطلاحات کو نظر انداز کر دیا جائے تو فارسی میں اسے کہیں گے:

صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالع ترا طالع کند

اس کی دوسری مثال وہ چھوٹی سی کہانی ہے جس میں گلاب کے پودے کی جڑوں میں پڑی مٹی سے پوچھا گیا کہ تم میں یہ خوشبو کہاں سے آئی تو اس نے جواب دیا کہ:

جمال ہم نشیں درمن اثر کرد
وگرنہ من ھماں خاکم کہ ہستم

کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ دوسرے علوم اور جرمیات کئی دوسرے نظریوں کی طرح کوئی نیا خیال یا تصور نہیں ہے۔

ایک فرانسیسی دانشور گیبریل ٹارڈے (Gabriel Tarde) نے 1912 میں یہ خیال پیش کیا کہ جرم بھی باقی پیشوں کی طرح ایک پیشہ ہے اور اسے بھی ویسے ہی سیکھنا پڑتا ہے جیسے کہ دوسرے پیشے۔ اس نظریے میں مجرموں کی صحبت یا رفاقت ایک اہم عامل ہے جو انیسویں صدی کی جرمیات میں اسباب پر مباحث کا ایک مرکزی موضوع تھا۔ سدر لینڈ نے اس خیال کو زیادہ نفاست اور شائستگی سے پیش کیا۔ اس نے کہا کہ مجرمانہ کردار قانون شکن اشخاص کی صحبت میں رہ کر اخذ کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ تعلیم میں نہ صرف طریق واردات کا سیکھنا شامل ہے بلکہ اس میں روش، حرکات اور ایسی تفصیلات بھی شامل ہیں جو سماج دشمن سرگرمیوں کے لئے بڑی موافق ہوتی ہیں۔ سدر لینڈ کے خیال کے مطابق مجرمانہ کردار وراثت میں نہیں ملتا کیونکہ انسان کے تمام رویے صرف اس کے کلچرل ماحول میں ہی بامعنی ہوتے ہیں اور سارے رویے اپنے اطراف موجود کلچر سے ہی اخذ کئے جاتے ہیں۔ مجرمانہ روش یا کردار ویسا ہی کسبی ہے جیسے کہ قانون کی پابندی کرنے والی روش اور اسے دوسروں کے ساتھ میل جول سے ہی اخذ کیا جاتا ہے۔ مجرمانہ تشخص یا پیشے کا

حصول ایک لمبے تجربے پر منحصر ہوتا ہے۔تاہم بعض اوقات ایک واحد تجربہ بھی انسانی زندگی میں ایک ڈرامائی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔

امریکی ماہرین جرمیات میں اپنی تکرار معنی اور تکرار لفظی کے باوجود یہ نظریہ کافی مقبول ہوا مگر اس پر تنقید بھی خاصی ہوئی۔

☆ ولسن اور ہیرنسٹائن کے خیال میں یہ نظریہ اس امر کی تشریح نہیں کرتا کہ مجرم اور دوسرے غلط کار لوگ غیر مجرموں اور اپنے خاندان والوں کو چھوڑ کر مجرم اور غلط کار ساتھیوں سے مشورے کیوں قبول کرتے ہیں اور ان کی رفاقت کیوں اپناتے ہیں؟

☆ ہرشی(Harshi) کے خیال میں یہ نظریہ ایک تنہائی پسند شخص کے مسائل اور اس حقیقت کو نظرانداز کر دیتا ہے کہ بار بار جرم کرنے والے کئی اشخاص نے قانون شکن گروہوں سے روابط نہیں رکھے یہ اس امر کی تشریح بھی نہیں کرتا کہ ایسے مجرموں کو مخالف صحبت کا موقع ہی نہیں ملا۔

☆ کریسی (Cressey) کے خیال میں اس نظریے کی کئی جزویات تجربات کے تحت نہیں آسکتیں گو یہ نظریہ کافی قابلِ قبول ہے۔

عمرانیات پر ہی مبنی دوسرا نظریہ مرٹن(Merton) کا ہے۔اس نے پورے ساج کو پانچ مختلف زمروں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ روایت کی پابندی کرنے والے یعنی Conformist

۲۔ جدت پسند یا اختراعات کرنے والے یعنی Innovators

۳۔ رسوم و رواج کے پیروکار یعنی Ritualist

۴۔ پسپائی اختیار کرنے والے یعنی Retreatist

۵۔ باغی یا بغاوت پر آمادہ لوگ یعنی Revolutionist

عمرانیات کی یہ مشہور و معروف جدول جرائم کا کوئی نظریہ نہیں ہے۔یہ جرم کی تشریحات کے لیے پس منظر کا کام کرتی ہے اور ایسے اشخاص کی نشاندہی کرتی ہے جن کے گمراہ ہونے یا منحرف ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔روایات کی پابندی کرنے والے اپنی زندگیوں کے روایتی مقاصد کو مخصوص قانونی ذرائع استعمال کر کے حاصل کر لیتے ہیں۔ان کے گمراہ یا منحرف ہونے کا کوئی

MashalBooks.org

اندیشہ نہیں ہوتا۔

☆ ان کے برعکس اختراع پسند لوگ ہیں۔ یہ لوگ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے روایتی ذرائع کے علاوہ غیر روایتی طریقے بھی اپنا لیتے ہیں۔ نئے ذریعے تلاش کرنے والے اشخاص کے اس زمرے میں موجد، مخترع اور نئی راہیں تلاش کرنے والے لوگ آتے ہیں۔

تیسرے زمرے کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جا بے جا رسم ورواج کی پابندی کرتے ہیں۔

اس جدول کے آخری چار زمروں میں منحرف لوگ بھی آجاتے ہیں۔ امریکہ میں جہاں امارت اور خوشحالی کے ساتھ شرح جرائم بھی بہت بلند ہے، وہاں کے بیشتر منحرف اشخاص اور قانون شکن لوگ جدت پسند یا اختراع پسند زمرے میں پائے جاتے ہیں۔ امریکی کلچر ہر شخص کی مادی ترقی کو زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے لیکن معاشرے کی نہج ایسی ہے کہ وہ ہر شخص کے لئے مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ذرائع بہم نہیں پہنچاتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ افراد کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ذرائع میسر نہیں آتے اور دباؤ میں آکر وہ قانون شکنی اور انحراف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں چونکہ وہ معاشرے کی رسوم سے پوری طرح ہم آہنگ ہو چکے ہوتے ہیں وہ اپنے مقاصد کی تصعید کر لیتے ہیں اور رسومات کے ذریعے معاشرے سے ہم آہنگ رہتے ہیں۔ مرٹن کی نظر میں درمیانے طبقے کی نچلی سطح پر اکثر ایسا ہوتا ہے۔ یہ رسومات سے شدید وابستگی کا نتیجہ ہے اور ایک خوفزدہ کارکن جیسا کہ کسی بنک کے خزانچی کے رویے میں نظر آتا ہے، اس کے مقابلے میں پسپائی اختیار کرنے والوں کا زمرہ ہے۔ یہ معاشرے کے وہ افراد ہیں جو سماج کے متعین کردہ مقاصد اور ان کے حصول کے لئے قانونی ذرائع دونوں کو رد کر دیتے اور پسپائی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ معاشرے کے افراد ہوتے ہوئے بھی معاشرے سے لاتعلق رہتے ہیں۔ مقاصد کے حصول کے قانونی ہونے پر ان کا یقین پختہ ہوتا ہے اور وہ اختراع کی طرف رجوع نہیں کر سکتے۔ قانونی ذرائع کے استعمال کا موقع نہ ملنے پر وہ مقاصد اور ان کو حاصل کرنے والے ذرائع دونوں کو تج دیتے ہیں اور اس اخلاقی کشمکش سے نجات حاصل کر لیتے ہیں جو مقاصد کو قانونی ذرائع سے حاصل کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس زمرے میں ذہنی مریض، مرگی کے مریض، پرانے شرابی،

نشہ کرنے والے اور آوارہ گرد آتے ہیں۔ باغیوں کے زمرے میں وہ لوگ آتے ہیں جو معاشرے کے متعین کردہ مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع دونوں کو مسترد کردیتے ہیں۔ وہ سماج کی از سرِ نو تعمیر چاہتے ہیں اور نئے مقاصد کا تعین کرتے ہیں اور ان کے حصول کے لئے اہلیت کو بنیاد بناتے ہیں۔ مرٹن کے خیال میں اس زمرے میں آنے والے لوگ مرتد، روایات سے منحرف اور انقلابی ہوتے ہیں۔ انہیں مرتد قرار دیا جاتا ہے لیکن اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجائیں تو وہ پیر، مصلح اور یہاں تک کہ پیغمبر قرار پاتے ہیں۔

اسی بنیاد پر مرٹن نے جرائم کے بارے میں اپنا نظریہ وضع کیا جسے Strain Theory کہتے ہیں اور جس کے مطابق مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع کے درمیان اتنا زیادہ فاصلہ ہوجاتا ہے کہ مقاصد کے حصول کے لئے غیر قانونی ذرائع استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ مرٹن کی نظر میں انسان بذاتِ خود بنیادی طور پر سراسر خیر ہے لیکن معاشرتی حالات اور معاشرے کی ساخت اور تربیت اس کے لئے اتنا سماجی دباؤ پیدا کردیتی ہے کہ اس کو کم کرنے کے لئے لوگ غیر قانونی وسائل کو اپنا لیتے ہیں اور مجرم بن جاتے ہیں۔ معاشرے میں وسائل کی تقسیم غیر مساوی طریقے سے ہوتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ کم ذرائع والے سماجی طبقے اور جرم کے درمیان روابط کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ چنانچہ وسائل اور ترقی کے مواقع کی مساوی اور برابر تقسیم سے جرائم پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ مرٹن کے خیال میں مقاصد کے حصول پر زور اور وسائل کے مخصوص طبقے تک محدود ہونے سے معاشرتی دباؤ اور معیاروں کی معدومیت (Anomie) پیدا ہوتی ہے۔

مرٹن کے سماجی دباؤ اور تناؤ کے نظریے پر بھی خاصی تنقید ہوئی ہے جس کے نمایاں نکات یہ ہیں:

- ☆ اس نظریے کو عملی طور پر آزمایا نہیں جاسکتا۔
- ☆ یہ بڑا عمومی اور غیر واضح اور مبہم نظریہ ہے۔
- ☆ یہ ان لوگوں کی مجرمانہ روش کی وضاحت نہیں کرتا جو آسودہ حال طبقوں میں پیدا ہوتے ہیں اور وہیں پرورش پاتے ہیں۔ اس نکتے پر غور کرتے وقت سفید پوشوں کے جرائم کے تصور کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔
- ☆ ایک اور خیال کے مطابق یہ معیاروں کی معدومیت اور سفید پوشوں کے جرائم کی بڑی اچھی وضاحت کرتا ہے۔

MashalBooks.org

☆ یہ نظریہ رویوں میں اہم انفرادی اختلافات کی وضاحت نہیں کرتا۔
☆ ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ نظریہ اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کرتا کہ محنت کش طبقے کی اکثریت قانون شکنی کی بجائے قانون کی پابندی کیوں کرتی ہے۔
☆ ایسی تحقیقات موجود ہیں جو اس نظریے کے بنیادی مفروضات سے اختلاف کرتی ہیں۔

عمرانیات کی بنیادوں پر استوار تیسرا نظریہ ہرشی کا ہے۔ اس نے یہ نظریہ 1669ء میں وضع کیا۔ انسان فطرت کے متعلق اس نظریہ ساز کا خیال ہے کہ انسان کا فطری طرز عمل منفی ہے۔ وہ بنیادی طور پر خود پسند، خودسر اور انا پرست ہے۔ لیکن معاشرے کی اقدار پر سب لوگوں کا اجماع ہے۔ انسان کی ترقی معاشرے کے قبول کردہ مقاصد اور ان کے حصول کے قانونی ذرائع کو قبول کرنے سے ہی ممکن ہے۔ انحراف یا قانون شکنی کی وجہ مقاصد اور ان کے حاصل کرنے والے ذرائع کے درمیان تفاوت ہے۔ انحراف کی اصلاح سب لوگوں کو ترقی کے برابر مواقع دینے سے ہی ممکن ہے۔

اس نظریے کے چار کلیدی عناصر اور کچھ معاشرتی ادارے ہیں۔ تصورات یہ ہیں:

ا۔ Attachment اس سے مراد رابطوں کی وہ قوت ہے جو ایک فرد کو اپنے رشتے داروں اور لواحقین ......مثلاً والدین، اساتذہ اور دوسرے قریبی رشتے داروں یا مقامی قائدین سے منسلک کرتی ہے۔ ایسے رابطوں سے قانون کی پابندی ہوتی ہے اور ضابطہ اخلاق کو پیشِ نظر رکھنے کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔

۲۔ Commitment......اس سے مراد روایتی روشوں کی پیروی اور مستقبل میں ایسے مقاصد کا انتخاب ہے جو قانون کی پابندی کرتے ہوئے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

۳۔ Invoivement سے مراد معاشرے کی روایتی سرگرمیوں میں حصہ لینا ہے، جس سے مقاصد کے قبول کرنے کی طرف راہنمائی ہوتی ہے۔ کوئی فرد جتنا وقت ایسی سرگرمیوں میں صرف کرے گا اس کے لئے غیر قانونی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے امکانات اتنے ہی کم ہو جائیں گے۔

۴۔ Beliefs......یعنی عقائد۔ اس سے مراد معاشرتی معیاروں کو اخلاقی طور پر قبول کرنا ہے۔ اداروں میں گھر، گھریلو ماحول، ماں باپ، سکول، اساتذہ اور ہم جولی شامل ہیں۔

MashalBooks.org

اس نظریے پر بھی کئی اعتراضات وارد ہوئے ہیں:

☆ یہ کلاسیکی جرمیات کی بصیرت پر مبنی ہے اور اس کے نظریات کو پوزیٹوسٹ اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

☆ یہ نظریہ یک طرفہ ہے کیونکہ یہ ان محرکات کی تشریح نہیں کرتا جو معاشرے کے کلچر اور ساخت سے پیدا ہوتے ہیں۔

☆ یہ نظریہ انسانی فطرت کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جرم سماجی کنٹرول کی عدم موجودگی کا لازمی نتیجہ ہے۔

☆ کمزور سماجی روابط والے بہت سے افراد قانون کی پابندی کرتے ہیں اور جرم کی طرف رخ نہیں کرتے۔

☆ ناقدین یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ انسانی روابط کے کمزور یا مضبوط ہونے کے علاوہ بھی کئی ابعاد ہیں۔ اہم ابعاد (Qualitative) یعنی کیفیتی اور Quantitative یعنی مقداری ہیں۔

لیبلنگ نظریہ

اس نظریے کا بنیادی خیال یہ ہے کہ اگر کوئی مقتدر ہستی یا ادارہ کسی شخص کی کسی خاص طریقے سے تعریف کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس تعریف کے مطابق ڈھال لیتا ہے اور اس کی عزت نفس اور رویے میں ویسی ہی تبدیلی آجاتی ہے۔ وہ شخص اس نام یا اس لیبل کے مطابق، جو اس پر چسپاں کیا جاتا ہے، پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ خیال 1962ء میں پیش کیا گیا اور کچھ ماہرین نے اس خیال کی تائید کی اور کہا کہ جب کسی شخص کو ایک ذہنی مریض قرار دیا جاتا ہے تو لازمی طور پر وہ اپنی ذہنی بیماری کا اظہار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ نارمل بھی ہو جائے تو بھی وہ اپنے نارمل ہونے کا اظہار نہیں کرسکتا۔ ایک ماہر کے الفاظ میں اصول وضع کر کے سوشل گروپس انحراف پیدا کرتے ہیں۔ وہ ان اُصولوں کو مخصوص افراد پر نافذ کرتے ہیں اور انہیں اجنبی قرار دیتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کے مطابق انحراف اس عمل کی خصوصیت نہیں ہے جس کا کوئی شخص مرتکب ہوتا ہے بلکہ یہ ان اصولوں کا نتیجہ ہے جن کا اطلاق دوسرے لوگ اس پر کرتے ہیں۔ چنانچہ منحرف وہ شخص ہے جس پر دوسروں نے یہ لیبل بڑی کامیابی سے چسپاں کر دیا ہو۔

MashalBooks.org

اس نظریے پر بھی بڑی تنقید ہوئی ہے جس کے کچھ نکات درج ذیل ہیں:

☆ یہ نظریہ شکاگو سکول کے خیالات کی توسیع ہے۔ جارج ہربرٹ ریڈ کے مطابق ذات کوئی اکائی نہیں بلکہ ایک عمل ہے جو جاری رہتا ہے اور اس میں ہر وقت تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

☆ پہلی قانون شکنی کے بعد جرائم کے ارتکاب کی تشریح تو یہ نظریہ کرتا ہے لیکن اس امر کی وضاحت نہیں کرتا کہ کسی شخص کی پہلی قانون شکنی کی وجوہات کیا تھیں۔

☆ کسی شخص کو مجرم یا کسی فعل کو انحراف یا قانون شکنی قرار دینے سے شرح جرائم کو تو متاثر کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے جن کا خیال لیبل لگانے والوں تک کو بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جرم کے ارتکاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

☆ مجرم کی اصلاح کا راستہ صرف یہ رہ جاتا ہے کسی شخص کے انحراف کو ڈرامائی شکل نہ دی جائے۔

☆ اس نظریے سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ منحرف یا مجرم ہونا بڑی حد تک ایک منسوب شدہ عمل ہے جو نہ صرف انفرادی انحراف کی سرگرمی یا عمل کو بلکہ اس انحراف کے متعلق لوگوں کے ردعمل کو بھی منعکس کرتا ہے۔

اریکسن (Erikson) کے مطابق انحراف کسی مخصوص رویے کا حامل نہیں بلکہ یہ وہ صفت ہے جو دوسرے لوگ کسی عمل کے ساتھ منسوب کر دیتے ہیں۔ چنانچہ عمرانیات کے نقطہ نظر سے نازک تغیر پذیر عامل معاشرے کے وہ ناظرین ہیں جو یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ کوئی مخصوص عمل واضح انحراف پایا نہیں۔

تحلیل نفسی کا نظریہ

نفسیاتی اعتبار سے جرائم کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاتا ہے:

اول۔ جرم کو غیر متوازن نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق مجرم کے تحت الشعور میں خواہشات کا ایک طوفان چھپا ہوتا ہے اور مجرم کو اس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اور یہ طوفان ارتکاب جرم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

دوئم: جرم بذات خود ایک نفسیاتی بیماری ہو سکتا ہے۔ قابلِ شناخت صورتوں کی بجائے یہ بیماری

بڑی خفیہ طریقے سے اپنا اظہار کرتی ہے۔ اس اظہار کی ایک صورت جرائم کا ارتکاب ہوسکتی ہے۔
تحلیل نفسی کا دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ قانون بذات خود جرم کی بڑی وجہ ہے۔ اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

اول۔ قانون کی موجودگی ایک ممانعت پیدا کرتی ہے جو متعلقہ شخص کے اندر اسے پھلانگنے کا ہیجان پیدا کرتی ہے۔ اس سے جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ ہم جرم اور منشیات کی بحث کے دوران دیکھیں گے کہ منشیات پر پابندی کے خلاف لوگوں کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ چونکہ منشیات پر پابندی ہے اس لئے لوگ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اگر یہ پابندی ہٹادی جائے تو منشیات کی کشش خود بخود ختم ہوجائے گی۔ یہ وہی زمرہ ہے جو جرم پر بحث کے دوران Mela Prohibita کی ذیل میں آتا ہے۔

دوئم: قانون بذات خود قانون شکنی کی ترغیب دیتا ہے۔ قانون شکنی پر سزا واجب ہوتی ہے۔ چنانچہ قانون شکنی شخص کا مقصد اپنے آپ کو سزا دلوانا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے اندر چھپا ہوا کوئی احساس جرم ہوتا ہے۔

علیاتی بحران

ان چند ایک نظریات کو یہاں بیان کرنے کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ کوئی بھی ایک نظریہ جرم کے مظہر کی پوری پوری وضاحت نہیں کرتا۔ مختلف نقطہ ہائے نظر سے مختلف نظریات وضع کئے جاتے ہیں لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔ اس علم کے حکماء اس کیفیت کو علیاتی بحران یا Etiological crises کا نام دیتے ہیں جو 1980ء سے اب تک اس علم پر چھایا ہوا ہے۔

مندرجہ بالا نظریات اور ان کے علاوہ دوسرے نظریات، جیسے Conflict Theory سب کلچرل نظریہ اور جدید کلاسزم نے علم جرمیات میں بڑا ہیجان برپا کیا جو اس علم پر 1950ء سے 1970ء تک حاوی رہا۔ لیکن یہ ہیجان یا بحران تمام ممالک میں بیک وقت نہیں آیا۔ بلکہ مختلف ممالک میں اس کا اظہار مختلف وقتوں میں ہوتا رہا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف علم جرمیات کے ماہرین بلکہ عوام نے بھی جرائم کے مظہر کو مختلف زاویوں سے دیکھنا شروع کردیا۔

MashalBooks.org

دوسری جنگ عظیم کے بعد مختلف نقطہ ہائے نظر کے حامل ماہرین کا اس امر پر کلی اتفاق تھا کہ جرائم کی سب سے بڑی وجہ معاشرتی خستہ حالی ہے۔ سماج دشمن حالات کی بنا پر سماج دشمن رویے جنم لیتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانے کی غالب فکر کو Positivism یا سوشل ڈیموکریٹک پوزیٹوازم Social Democratic Positivism کا نام دیا گیا جس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ جرائم اور دوسرے سماج دشمن رویوں کو ایسے سیاسی رویوں سے کم کیا جا سکتا ہے جس سے سماجی اور معاشرتی خستہ حالی ختم ہو اور ان میں بہتری کی صورت پیدا ہو۔ لیکن یہ فکر ناکامی سے دوچار ہوئی۔ ان معاشرتی حالات میں بہتری کی تمام کوششیں ...... Slums کا خاتمہ، تعلیمی معیار میں ترقی، سب کے لئے روزگار کی فراہمی اور رفاہ عامہ کے دوسرے کام...... سب ناکام ہو گئے۔ جیسے جیسے معیار زندگی بلند ہونا شروع ہوا جرائم کی شرح میں ہے...... یعنی وہ جرائم جو پولیس کے علم میں لائے جاتے ہیں...... اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مثال کے طور پر انگلستان میں جہاں خرچ کی جانے والی آمدنی میں 64 فیصد اضافہ ہوا، وہاں جرائم کی شرح دگنی سے بھی زیادہ یعنی 174 فیصد ہو گئی۔ جرائم کی وجوہات کی تلاش کرنے والی فکر میں یہ ایک بحرانی کیفیت تھی اور ماہرین نے اسے علیاتی بحران کا نام دیا۔ اس کی صحیح تصویر امریکی صدر نکسن کے جرائم کے مشیر جیمز کولسن (James Q. Wilson) نے ان الفاظ میں پیش کی:

''اگر 1960ء میں کوئی پوچھتا کہ شرح جرائم کو کم کرنے کے لئے معاشرے کو کیا اقدام کرنے چاہئیں؟ تو جواب ملتا کہ غریبی کم کر کے، تعلیمی معیاروں کو بلند کر کے، ٹوٹے پھوٹے مکان بدل کے، معاشرتی تنظیموں کی حوصلہ افزائی اور بے راہ رو جوانوں کے لئے مشاورتی کونسلیں قائم کر کے شرح جرائم کو کم کیا جا سکتا ہے۔''

جنگ عظیم کے بعد 1960ء کی دہائی کا ابتدائی زمانہ سب سے زیادہ خوشحالی کا دور تھا۔ غریبوں، نوجوانوں اور محروموں کے لئے کئی پروگراموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اگرچہ ان تمام اقدامات کا اولین مقصد شرح جرائم میں کمی تو نہیں تھا تاہم یہ سب مالی لحاظ سے جرائم کے متعلق ایک سنجیدہ سوچ رکھنے والے شخص کی توقعات سے کہیں بڑھ کر تھا۔

تاہم جرم بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہ تھوڑا سا نہیں بڑھا بلکہ 1930ء کے بعد اس کی سطح بڑی تیزی سے بلند ہوئی اور جرائم کے کئی زمروں میں اس قدر اضافہ ہوا کہ اس ملک (امریکہ) کو اس کا کوئی

MashalBooks.org

تجربہ نہ تھا۔

یہ سب 1963ء میں ہوا۔ یہ وہ سال تھا جس کو اگر ڈرامائی شکل میں پیش کیا جائے تو کہا جائے گا کہ اس سال یہ دہائی بکھرنے لگی تھی۔

اس علیاتی بحران کی تشریح یا اس سے انکار نے علم جرمیات میں اس تحرک کا کام کیا۔ تمام ممالک میں اس بحران کا اثر ایک جیسا نہیں تھا۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں اس کی کیفیت مختلف تھی۔ توقع کے مطابق جاپان میں ترقی کے ساتھ ساتھ جرائم میں کمی آتی چلی گئی لیکن لاطینی امریکہ میں اس کے بالکل برعکس بڑھتی ہوئی غربت کے ساتھ شرح جرائم بھی بڑھتی چلی گئی۔ سوشلزم کے قیام کے بعد سوویت روس میں جرائم کی صورت امریکہ میں جرائم کی صورت سے بہت مختلف تھی۔ مغربی یورپ کی رفاہی ریاستوں میں اس بحران کی کیفیت ایک معمے کی تھی جس کی تشریح مشکل تھی۔ سپین میں علیاتی بحران کافی دیر کے بعد رونما ہوا۔

ردعمل کے طور پر جدید کلاسزم کی تشکیل ہوئی اور پوزیٹوازم کی تشکیل اس صورت میں ہوئی کہ جرائم کو سماجی سطح پر دیکھنے کی بجائے اس کی توجہ پھر افراد پر مرکوز ہوگئی۔ چنانچہ اس سوال کے جواب نے کہ شرح جرائم اتنی کیوں بلند ہوئی؟ مندرجہ ذیل چار صورتیں اختیار کر لیں:

☆ معاشرے میں ریاستی عمل بڑھ گیا ہے۔ پولیس کی تعداد میں اضافے سے مجرم زیادہ تعداد میں گرفتار ہو رہے ہیں، اس لئے شرح جرائم بڑھتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

☆ ریاست کا عمل دخل بڑھنے سے قوانین میں اضافہ ہوا ہے اس لئے شرح جرائم میں اضافہ دکھائی دے رہا ہے۔

☆ لوگ جرائم کے متعلق زیادہ حساس ہو گئے ہیں۔

☆ زیادہ خوشحالی آنے سے ایسی چیزوں کی افراط ہوگئی ہے جن کی چوری کی جاسکتی ہے۔ تاہم شرح جرائم میں اضافے سے انکار کے باوجود کئی حلقوں نے اس اضافے کو تسلیم بھی کیا اور اس کی تشریح کی کوششیں شروع ہوئیں۔ ان کوششوں کی زمرہ بندی یوں ہو سکتی ہے:

۱۔ بائیں بازو کے آئیڈیل ازم کی جرمیات۔

۲۔ نئی افسر شاہی جرمیات۔

۳۔ دائیں بازو کی حقیقت پسند جرمیات۔

MashalBooks.org

۴۔ بائیں بازو کی حقیقت پسند جرمیات۔

چنانچہ ان چاروں نقطہ ہائے نظر سے جرمیات کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

جرمیات کے یہ چاروں پہلو1960ء تک مروجہ تشریحات کے ادغام سے جرائم کی تشریح کرتے ہیں۔ مثلاً بائیں بازو کی تشریحات نے یسلنگ نظریے سے جنم لیا تو سماجی کنٹرول کے نظریات سے نئی افسر شاہی جرمیات کی قلم پھوٹی۔ جدید پوزیٹوازم دائیں بازو کی حقیقت پسندی کا ماخذ ہے تو زیلی کلچرل نظریات سے بائیں بازو کی حقیقت پسندی شروع ہوتی ہے۔ لیکن جرمیات کے ان چاروں پہلوؤں میں کچھ اشتراک بھی ہے:

ا۔ جرمیات کے یہ چاروں پہلو پولیس کے کردار کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

۲۔ لیکن عوام کے غیر رسمی کردار کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔

۳۔ یہ سارے جیل خانوں کے موجودہ نظام کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔

۴۔ یہ سارے پہلو روایتی پوزیٹوازم اور کلاسرم کو مسترد کرتے ہیں۔

ان کے باہمی موازنے اور بہتر تقسیم کے لئے ان کا مندرجہ ذیل زاویوں سے جائزہ لیا جائے گا:

ا۔ ان کا فطرت انسانی کا تصور اور سماجی تنظیم کا جائزہ۔

۲۔ جرائم کی وجوہات

۳۔ جرائم کا معاشرے پر اثر

۴۔ حکومتی اداروں کا کردار

۵۔ عوام کا کردار

ا۔ بائیں بازو کا آئیڈیل ازم

اس اصطلاح کے مفاہیم بڑے وسیع ہیں جو عام آزاد خیالی سے شروع ہو کر بائیں بازو کی سخت ترین روش تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ آئیڈیل ازم تمام عمرانی علوم میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ یہ تعلیمی عمرانیات میں بھی نظر آتا ہے اور اس میڈیا میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ انقلابی علمیات میں بھی سرایت کئے ہوئے ہے اور عمرانی ساخشیت میں بھی نظر آتا ہے۔ تحریک آزادی نسواں میں

MashalBooks.org

یہ اس حد تک نفوذ کئے ہوتے ہے کہ اس تحریک کی کتابوں میں خواتین کی جگہ اگر محنت کش طبقہ لکھ دیا جائے تو وہ اشتراکی ماہرین عمرانیات کی کتابیں بن جائیں گی۔ اس آئیڈیل ازم نے جرمیات کو بھی متاثر کیا ہے۔ چنانچہ یہ مغربی معاشرے کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے۔

اس کا مرکزی نقطہ ریاست کا کردار اور اس سے صادر ہونے والے تصورات اور خیالات اور ادارے ہیں۔ اس کے حامیوں کے مطابق یہ انسانی شعور کی تشکیل کرتا ہے اور افراد کے کردار کے رخ کا تعین کرتا ہے۔ جرمیات میں اس کی جڑیں امریکی یسبلنگ نظریے میں ہیں لیکن اس کی بیشتر ترقی یورپ میں ہوئی جہاں اس نے ایسی حکمت عملی وضع کی جس کے مطابق جرم فوجداری قوانین کی گرفت سے نکل سکتے تھے اور جیلوں کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ یہ امر قابلِ فہم ہے کہ اس کی زیادہ تر ترقی ایسے ممالک میں ہوئی جن کی آمدنی قلیل ہے اور جہاں علیاتی بحران کافی دیر سے پہنچا۔

اس نقطہ نظر سے جرمیات پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس آئیڈیل ازم کا مرکزی پہلو یہ امر ہے کہ نظم ونسق یا انتظامیہ کو سماجی ساخت پر فوقیت حاصل ہے۔ اس آئیڈیل ازم کے حامیوں کا خیال ہے کہ ریاستی انتظامیہ معاشرے کا تعین کرتی ہے۔ چنانچہ اس مکتب فکر کے مطابق نوجوانوں میں افلاس سے نہیں بلکہ ان پر لیبل چسپاں کرنے سے تحریک پیدا ہوتی ہے۔ طالب علم اپنے طبقاتی پس منظر کی بنا پر نہیں بلکہ سکول کی کارکردگی کی وجہ سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ زندگی نہیں بلکہ دماغی ہسپتال ہیں جو لوگوں کو دیوانہ بنا دیتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر تشدد دکھانے سے تشدد سڑکوں پر آ جاتا ہے (شاید پاکستان میں ایسا ہی ہوا ہے)

بائیں بازو کا آئیڈیل ازم عمرانی معاہدے کی انقلابی صورت ہے۔ اس روش کے حامیوں کے لئے تمام لوگ برابر ہیں، آزاد ہیں اور سب معقول ہیں جو ایک منصفانہ معاشرے میں اکٹھے ہو کر اتفاق رائے سے حکومت کے حقوق وفرائض اور معاشرے کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ موجود معاشرتی حالات ان کی نظر میں غیر منصفانہ ہیں۔ اس میں طبقاتی، جنسی اور نسلی ناہمواریاں ہیں۔ اس میں عدم مساوات موجود ہے۔ اس بنا پر ادنیٰ مقام پر پائے جانے والے افراد مزاحمتی کلچر پیدا کرنے لگتے ہیں۔ تاہم یہ معاشرتی معمہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے کہ دنیا میں جو اس حد تک غیر منصفانہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کیسے اپنے آپ کو قائم رکھے ہوئے ہے؟ اور عوام کی اکثریت جو طبقاتی، جنسی اور نسلی عدم مساوات کا شکار ہے، یک جا ہو کر مساوات پر مبنی بنا عمرانی معاہدہ کیوں

تشکیل نہیں دے سکتی؟ اس آئیڈیل ازم کے حامیوں کے مطابق اس کی وجہ حکمران طبقے کی طاقت ہے جس کا اظہار ماس میڈیا سے شروع ہو کر سکول، فوجداری نظام انصاف اور سیاست تک کے اداروں میں ہوتا ہے اور ان میں صاحب اقتدار طبقے کی آئیڈیالوجی گزدش کرتی ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی اقدار، پدری نظام پر مبنی خاندان اور نسلی برتری کے یورپی نظریے کو سہارا دیتی ہے ہے۔ اس طرح طبقاتی، نسلی اور جنسی امتیازات اداروں کی صورت میں مہد سے لحد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے نارمل انسان ہونے اور دونوں جنسوں کے مناسب کردار کے تصورات، ایک مطمئن صارف، اطاعت گزار کارکن یا دیانت دار شہری کے تصورات کی تشکیل یہی ممتاز ادارے کرتے ہیں۔ لیکن حاضر و موجود حالات سے یہ تصورات بہت مختلف ہیں۔ یہ اختلافات اور تضادات معاشرتی کشمکش پیدا کرتے ہیں جس پر قابو پانے کے لئے پولیس اور فوجداری نظام انصاف اور ان سے ملحق ادارے ضروری ہوجاتے ہیں کیونکہ ان کے بغیر نچلے طبقوں پر، جو مزاحمت پر اتر آتے ہیں، قابو نہیں پایا جاسکتا۔ چنانچہ معاشرے کے تمام ادارے خواہ وہ تصوراتی ہوں (جیسے سکول یا ماس میڈیا) یا جابرانہ (فوجداری نظام انصاف) بنیادوں پر قائم ہوں، ایسے کل کا حصہ ہیں جو موجودہ عمرانی نظام کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

ان خیالات کے حامل دانشوروں کے لئے جرائم کی وجوہات بڑی واضح ہیں۔ یعنی غریب لوگوں کی محرومی اور امیر طبقے کی ہوس۔ چنانچہ صرف افلاس یا غربت کو جرائم کی وجہ قرار دینا غلط ہے کیونکہ امیر طبقوں اور کارپوریشنوں یا کمپنیوں میں ہونے والے جرائم (وائٹ کالر یا سفید پوشوں کے جرائم) سراسر خوشحالی کی پیداوار ہیں۔

مندرجہ بالا وضاحتوں میں سوشل پوزیٹوازم اپنی سادہ صورت میں بڑا واضح نظر آرہا ہے۔ یعنی جرائم زندہ رہنے کی کوشش کا ایک واضح اور ناگزیر نتیجہ ہیں۔ یہ اضافی نہیں بلکہ مطلق محرومی کی پیداوار ہیں۔ ترمیم پسند مورخین (جن کی نظر میں جرائم اور قانون طبقاتی کشمکش کو منعکس کرتے ہیں) کی کتابوں میں اس قسم کے خیالات کا بڑی تفصیل سے اظہار ہوتا ہے۔ جہاں محنت کش طبقے کا جرم بڑا واضح ہے وہاں صاحب اقتدار طبقے کا جرم خواہ وہ کارپوریشنوں میں ہوا ہو یا پولیس میں، سادہ اور اس طبقے سے مخصوص ہے۔ لیکن ان حالات کو جو مخصوص کارپوریشنوں میں جرائم کے ذمہ دار ہیں یا جو پولیس میں بددیانتی اور بداطواری پھیلاتے ہیں، یہ مکتب فکر نظرانداز کردیتا ہے۔

MashalBooks.org

اس معاشرے میں جہاں عدم مساوات ہر جگہ نظر آتی ہو جرائم کے وہ اعداد وشمار جو نسلی اقلیتوں اور غریبوں کو جرائم کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، پولیس اور فوجداری نظام کی جانبدارانہ روش کو منعکس کرتے ہیں۔ شرح جرائم میں اضافہ پولیس کی نفری میں اضافے کا نتیجہ ہے۔ ابھی تک شرح جرائم کو ناپنے کا کوئی پیمانہ ہمارے پاس نہیں۔ بائیں بازو کا آئیڈیل ازم یہ تاثر نہیں دیتا کہ معاشرے کے لیے جرائم کوئی مسئلہ نہیں بلکہ اس کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ جرائم کے مسئلے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو معاشرے کے اصلی مسائل یعنی غربت اور استحصال کا پتا نہ چلے۔ چنانچہ یہ اس کے پیش نظر جب غریبوں کو جرائم کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے تو دراصل ان غریبوں کو افلاس کا مورد ٹھہرایا جاتا ہے۔ یوں ریاست کی طرف سے غریبوں پر دو الزام عائد ہوتے ہیں۔ اول غریب ہونا اور دوئم ان پر جرم کا کلنک۔

اس آئیڈیل ازم کی نظر میں جرائم پر قابو پانا پولیس کی ذمہ داری نہیں۔ پولیس کی اصل ذمہ داری نظم ونسق کی بحالی اور اسے قائم رکھنا ہے۔ سال 1984ء میں کان کنوں کی ہڑتال پر انگریز تبصرہ نگاروں نے لکھا ''بلاشبہ انگریزی پولیس کی اولین ذمہ داری عوام میں نظم ونسق برقرار رکھنا ہے۔ جرائم کا انسداد اور مجرموں کی گرفتاری پولیس کی ذیلی ذمہ داری ہے''۔ چنانچہ پولیس کی نفری میں اضافہ سیاسی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ ہڑتالیں، مظاہرے، ان افراد پر قابو پانا جن پر دہشت گردی کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہو (جیسے شمالی آئرلینڈ میں سیاسی کارکن اور دوسرے ملکوں میں سیاہ فام اور دوسری نسلی یا علاقائی اقلیتیں) پولیس کی نفری میں اضافے کے کلیدی عوامل ہیں۔ جرم تو پولیس کی نفری میں اضافے کا ایک بہانہ ہے۔

اس آئیڈیل ازم کی نظر میں اب جیل کا وہ کلاسیکی تصور نہیں جو بیکاریا سے شروع ہو کر راڈینوِکز (Radzinowiz) تک آیا ہے یعنی یہ کہ جیل کا ایک فریضہ گمراہ لوگوں اور مجرموں کی اصلاح ہے۔ یہ تصور ناکام ہو چکا ہے۔ اس آئیڈیل ازم کے حامیوں کی نظر میں جیل لوگوں کو تقسیم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اشتراکی ذہن رکھنے والے کئی مورخ اور بائیں بازو کے آئیڈیل ازم سے متعلق رکھنے والے اسی نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہیں کہ یہ سرمایہ داری نظام کو دوام بخشنے کا ایک آلہ یا ذریعہ ہے۔ اس کے دو وظیفے ہیں: فوجداری نظام انصاف افراد پر اپنی توجہ مرکوز کر کے اس اقتصادی نظام کی ہلاکت آفرینیوں سے ہماری توجہ ہٹاتا اور مجرموں پر توجہ مرکوز کر کے صاحب

اقتدار اور امیر آدمیوں سے جو معاشرے کے اداروں سے، سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں، عوام کی توجہ ہٹاتا ہے۔

اب مکتب فکر کے حامی اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جرائم عمرانی انتشار اور انفرادیت کا نتیجہ ہیں۔ بیشتر جرائم عمرانی یک جہتی کی ٹوٹ پھوٹ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ آج بھی اتنا ہی درست ہے جتنا کہ انیسویں صدی میں یا اس سے بیشتر تھا۔ چنانچہ یہ خیال غلط ہے کہ جیل خانوں کا اجرا اور ان کی موجودگی فاضل آبادی کو باہر دھکیلنے کے ایک حربے کے طور پر ہوا تاکہ اس آبادی کو بکھیر دیا جائے۔ بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ بیشتر جرائم انفرادی سرگرمی پر مبنی ہوتے ہیں۔ صاحب اقتدار طبقے کو ان جرائم کو افراد کے سر تھوپنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مجرموں کو منفرد کرنے کے تجزیے کو قبول کیا جائے اور اسے مجرموں پر چسپاں کر دیا جائے۔ لیکن اس بیان سے مراد تعزیر اور بدنظمی کی نفی نہیں۔ معاشرتی اور مادی حالات ہی انفرادیت اور سماج دشمنی پیدا کرتے ہیں اور اسے قبول کرنے کا مطلب کلاسیکی اور پوزیٹوسٹ نظریات کی وکالت کرنا نہیں۔ کلاسیکی اور پوزیٹوازم بورژوا فکر کے دو مختلف قطبین ہیں اور دونوں کا تجزیہ کرنے کا ایک ہی انداز ہے کیونکہ دونوں حقیقت کے صرف ایک پہلو کو دیکھتے ہیں۔

۳۔ انتظامیہ یا جدید افسر شاہی جرمیات

جرمیات کی اس روش کی پیدائش انگلستان کے ہوم آفس میں ہوئی۔ یہ وہیں پروان چڑھی اور 1960 میں اس نے سوشل ڈیموکریٹنگ پوزیٹوازم فکر کی جگہ لے لی۔ بائیں بازو کی آئیڈیل ازم کی جرمیات اور اس جرمیات میں حیرت انگیز مماثلتیں ہیں۔ دونوں جنگ عظیم کے بعد کی سوشل ڈیموکریٹک جرمیات اور نیوکلاسزم کی تعزیرات کے خلاف ہیں۔

اس جرمیات کا اصل مقصد علیاتی بحران سے دامن بچانا ہے کیونکہ یہ جرمیات یہ تاثر دیتی ہے کہ جرائم کی وجوہات کا کھوج لگانا اتنا ضروری نہیں یا انہیں سیاسی طور پر حل کرنا ناممکن ہے۔ صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ جرائم موجود ہیں اور ان کو ختم کرنے کے اقدامات کرنے چاہئیں۔ چنانچہ اس فکر کے حامیوں کے نزدیک جرائم کو کم کرنے کی لاگت اہم مسئلہ ہے۔ اور یوں جرائم کو کم کرنے کی Cost Benefit Ratio اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ جرمیات اپنے اطراف

MashalBooks.org

جرائم کی موجودگی اوراس کے سنگین خطرات کو اصل مسئلہ قرار دیتی ہے۔

یہ ''نئی افسر شاہی جرمیات'' سماجی تنظیم کے وسیع تر مسئلے سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اس کا زیادہ رشتہ ہرشی کے سوشل کنٹرول نظریے سے بنتا ہے جو اس سوال کو کہ لوگ جرم کا ارتکاب کیوں کرتے ہیں؟ ایک بالکل الٹ طریقے سے پوچھتا ہے کہ اکثر لوگ جرم کیوں نہیں کرتے؟ اس طرح یہ جرمیات ہابس(Hobbs) کے اس نظریے سے منسلک ہوجاتی ہے کہ تدارک نہ ہونے کی وجہ سے لوگ جرم کا ارتکاب کرتے ہیں کیونکہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں۔ یوں ارتکاب جرم ایک سماجی ردِعمل بن جاتا ہے یعنی انسداد اور تدارک اور جرم کی ترغیب یا تحرک۔ لیکن ایک جامع نظریے کے لیے جروری ہے کہ وہ جرائم کی تحریک دینے والے عناصر اور جرائم کے انسداد دونوں کی تشریح کرے کیونکہ عملی طور پر تدارک کا انحصار بھی تو انہی عناصر پر ہے جو جرم کی ترغیب دیتے ہیں۔

روایتی حکمت کے پیشِ نظر انسداد کا انحصار جرائم کی وجوہات کی تفہیم و تجزیے پر ہے۔ اگرچہ یہ امر قابلِ قبول ہے کہ وجوہات کی تفہیم کے بغیر بھی انسدادی اقدامات جرائم کو کم کرسکتے ہیں، جیسے کہ تیز رفتاری کو روکنے کے لئے سڑک میں Speed Breakers بنانا ان یا سرقے کے تدارک کے لئے بہتر قفل، بہتر دروازے اور سائنسی آلات جو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ جیسے

Closed circuit ٹی وی اور کیمرے وغیرہ یا بنکوں کے باہر الارم سسٹم۔ لیکن ایسے اقدامات کی جو جرائم کے ارتکاب کے مواقع کم کرتے ہیں، افادیت بڑی محدود ہوتی ہے۔ وہ وقتی طور پر کسی علاقے میں جرائم کو ضرور روکتے ہیں لیکن مجرم ایسے علاقے چھوڑ کر جرم کے ارتکاب کے لئے دوسرے علاقے تلاش کرلیتے ہیں۔ سماجی اقدامات جیسے کہ روزگار کے مواقع پیدا کرنا، کھیلوں کے لئے سہولتیں، بہتر تعلیم، فرصت کے وقت کا بہتر استعمال، کہیں زیادہ موثر ہوتے ہیں کیونکہ یہ جرائم کی تحریک دینے والی بنیادی وجوہات کو ختم کردیتے ہیں۔ ان انسدادی اقدامات سے عوام اور شاید مجسٹریٹ اور پولیس بھی اتفاق نہ کریں، مگر تدریسی حلقوں میں یہ بہت زیادہ مقبول ہیں۔

''نئی افسر شاہی انتظامیہ'' جرائم میں اضافے سے انکار نہیں کرتی مگر اس کا دعویٰ ہے کہ یہ اضافہ اس لئے ہے کہ اب جرائم کی زیادہ اطلاعات دی جاتی ہیں اس لئے جرائم میں اضافہ نظر آتا ہے۔ مزید برآں اس جرمیات کے وکلا یہ خیال بھی کرتے ہیں کہ جرائم میں اضافے کی ایک وجہ یہ

بھی ہے کہ اب جرائم کا ارتکاب کرنے کے مواقع پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔

اس جرمیات کی بنیاد برطانوی وزارت داخلہ کے وہ جائزے ہیں جن کا آغاز 1982ء میں ہوا تھا۔ ان کا مقصد مبالغے کی حد تک بڑھتے ہوئے جرائم کے خوف کو کم کرنا تھا۔ ان کی تحقیقات کے نتائج درج ذیل ہیں:

☆ جرم سے متاثرہ شخص بالکل مجرم کی طرح ہوتا ہے۔ نہ بوڑھا، نہ عورت، نہ امیر بلکہ ایک نوجوان کنوارا مرد جو بہت زیادہ شراب پیتا ہے اور دوسروں پر حملے کرتے ہے۔

☆ جرائم کی حقیقت سے جرائم کا خوف زیادہ ہے۔ شہر کے باہر جرائم اتنا بڑا خطرہ نہیں۔ اس بنیاد اور اس مفروضے پر کہ مستقبل میں بھی شرح جرائم 1961ء والی ہی رہے گی، ایک متوسط شخص کو جو سولہ سال یا اس سے زیادہ عمر کا ہے، یہ توقع رکھنی چاہیے کہ:۔

...... ہر پانچ سو سال کے بعد ایک ڈکیتی کی واردات ہوگی۔

...... ہر سو سال کے دوران ایک تشدد آمیز حملہ ہوگا۔ جسم میں خفیف یا شدید زخم آئیں گے۔

...... ہر ساٹھ سال بعد ایک کار چوری ہوگی۔

...... ہر چالیس سال بعد نقب زنی کی ایک واردات ہوگی۔

ان جائزوں نے مزید یہ تاثر دیا کہ سیاست دانوں، میڈیا اور پولیس کی (جو ہمیشہ اپنے بجٹ میں اضافہ چاہتی ہے) تیار کردہ جرائم کی تصویر بڑی مبالغہ آمیز ہے اور بیشتر قانون شکنی معمولی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس لئے پولیس کو جرائم کے خلاف جہاد کرنے سے زیادہ انسدادی کارروائی پر زور دینا چاہیے۔

پولیس کے متعلق اس جرمیات کے خیالات جستہ جستہ اوپر پیش کئے جا چکے ہیں۔ مزید یہ کہا جا سکتا ہے کہ جرائم پر قابو پانے کے لئے پولیس کا کردار بڑا محدود ہے۔ اس ''افسر شاہی جرمیات'' کی نظر میں سنگین جرائم کو روکنے میں تو پولیس موثر ہوسکتی ہے لیکن جرائم کی مجموعی سطح پر اثر انداز ہونے یا اس سطح کو کم کرنے میں پولیس کا کردار بڑا مشکوک ہے۔ ان کی نظر میں اس امر کی کوئی شہادت نہیں کی گشت کرنے والی پولیس میں اضافے سے جرائم کم کئے جا سکتے ہیں، گو درست ہے کہ ایسی پولیس کی موجودگی سے عوام کے حفاظت کے احساس میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔

''نئی افسر شاہی جرمیات'' اپنے آپ کو صرف جرائم تک محدود کرتی ہے اور ان کی وجوہات

کو تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔ جرائم کی وجوہات کا کھوج لگائے بغیر اور ان کا تجزیہ کئے بغیر جرائم کی روک تھام مشکل ہے۔ اس جرمیات کے بتائے ہوئے طریقوں کے اطلاق سے جرائم ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔

دائیں بازو کی حقیقت پسندانہ جرمیات

پچھلے صفحات میں جیمز کیو ولسن کا مختصر سا تعارف آ چکا ہے۔ ان کی کتاب Thinking About Crime امریکہ میں بڑی مقبول ہے۔ یہ کئی اور کتابوں کے بھی مصنف ہیں۔ مخصوص جرائد میں جن کا تعلق جرمیات سے ہے اپنے متعدد مقالات شائع کرا چکے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ میں ان کے کام کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے علیاتی بحران کو کھلے دل سے تسلیم کیا۔ 1960ء کی دہائی میں امریکہ میں ہونے والے جرائم کے متعلق وہ سوشل ڈیموکریٹک پوزیٹوازم کے تصورات اور کنزرویٹو (Conservative) خیالات کے حامی ماہرین کے اس موقف کو کہ پولیس کی نفری میں اضافے، جیلوں میں اضافے، اور عدلیہ کے اختیارات میں اضافے سے جرائم کم ہو سکتے ہیں، وہ مسترد کرتے ہیں۔

برطانیہ کی ''نئی افسر شاہی جرمیات'' اور جرمیات کے متعلق امریکہ کی دائیں بازو کی حقیقت پسندانہ روش میں بڑا فرق ہے۔ اس کی وجہ ان دونوں ممالک کے حالات، امریکہ کی بلند ترین شرح جرائم اور امریکہ کی دانشورانہ فضا بھی ایک وجہ ہے جس کا بائیں بازو کی بجائے دائیں بازو کی طرف جھکاؤ زیادہ ہے۔

جرائم کے متعلق ''دائیں بازو کی جرمیات'' اپنے نظریات کو جرمیات کی اصل روایت سے منسلک کرتی ہے۔ دائیں بازو کی حقیقت پسندانہ جرمیات جرائم کی علیات کو نظرانداز نہیں کرتی اور جرائم کے بہت سے اسباب بتاتی ہے۔ ولسن اس روش کا سب سے بڑا ترجمان ہے۔ برطانیہ کی نئی افسر شاہی کی طرح یہ جرائم کے اسباب سے نظریں نہیں چراتا۔ اس کے برعکس ولسن ہیرسٹائن سے مل کر انفرادی پوزیٹوسٹک (Positivistic) نظریات کو آگے بڑھاتا ہے جن کا آغاز آئیزنگ (Eysenck) نے کیا تھا، جس کا مقصد مجرم کے جرم سے حاصل ہونے والے فوائد کا اس کی سزاؤں سے تقابل کرنا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ سزائیں گیر یقینی ہیں اور شاید جرم کا پتا بھی نہ چلے اس

لئے سزائیں مجرم کوارتکاب جرم سے روک نہیں سکتیں۔تاہم قانون شکنی کا تدارک بچپن کی تربیت سے ہوسکتا ہے جب یہ تربیت فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔اس نقطہ نظر کے حامل آئیزنک سے اس امر میں اتفاق کرتے ہیں کہ ضمیر حادث ہے اور یہ ایک تجرباتی اضطرار ہے۔اس طرح ضمیر اس خاندانی تربیت سے مشروط ہوجاتا ہے جو کوئی بچہ اپنے بچپن میں اپنے ہی خاندان میں حاصل کرتا ہے۔دوسرے عوامل جیسے ہمجولی،سکول،کام کرنے کی جگہ کا ماحول،فوجداری نظام انصاف اور خود کلچر اس بنیادی تربیت کو متاثر کرتے ہیں۔ چنانچہ قانون کی پابندی (عدم جرم) کے صلے کا تناسب جرم سے حاصل ہونے والے تناسب سے جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی جرم کے ارتکاب کا رجحان کم زور ہوگا۔ضمیر کا ردعمل، ہم جولیوں کی رضامندی اور عدم مساوات کا احساس جرائم کے گھٹنے بڑھنے پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔فرد کا میل جول، جرم سے منسلک سزاو جزا کی توقع اور سزا کا خوف بھی بڑے اہم عوامل ہیں اور زمانے کے ساتھ ساتھ یہ بدلتے رہتے ہیں۔اس صورت احوال کو ولسن مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''ہمارے خیال میں جرائم میں طویل المدت رجحانات کی تشریح تین عوامل سے ہوسکتی ہے: آبادی کا جارحانہ مزاج اور محدود ذہنی افق والے نوجوانوں کے تناسب میں کمی بیشی۔دوم جرائم سے حاصل ہونے والے منافع اور لاگت (سکول بدر ہونا، سزا، ملازمت سے برخواستگی) میں تبدیلی خصوصاً مالی جرائم کو متاثر کرسکتے ہیں۔سوم معاشرے میں سکولوں، خاندانوں، عبادت گاہوں اور ماس میڈیا کے ذریعے اندرونی ضبط نفس پیدا کرکے خطرے کی سرحد پر کھڑے نوجوانوں کو اس حد تک متاثر کرنا کہ وہ فوری تسکین کو ملتوی کریں، قانون کی پاسداری کریں اور دوسروں کی کارکردگی کا منصفانہ جائزہ لیں۔''

اس تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرائم ہوتا ہے کہ جرائم کے مسئلے کا حل بہت مشکل ہے۔ انسان کے جسمانی عوامل اور آبادی میں نوجوانوں کا تناسب متعین ہیں اور ہمیں انہیں اسی طرح قبول کرنا چاہیے۔ہمیں اسی کے ساتھ گزارا کرنا ہوگا۔اسی طرح بچوں کی پرورش کو خصوصاً جب والدین میں سے صرف ایک ہوراتوں رات تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ عوامل جو جرائم کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جیسے امریکہ میں انفرادی کلچر کلچر کا اہم حصہ ہیں۔ انہیں بھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک پولیس اور سزا کا معاملہ ہے تو وہ بھی ولسن کی نظر میں مشکوک ہے۔تو پھر

MashalBooks.org

جرائم کے اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ ولسن اور اس مکتب فکر کی حقیقت پسندی کم سے کم افادیت پر زور دیتی ہے۔ یہ لوگ خیالی حیثیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں روپیہ ادھر ادھر پھینکنے کی بجائے اسے ان اقدامات پر صرف کرنا چاہیے جن کی نگرانی بڑی احتیاط سے کی جا سکتی ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فوجداری نظام جرائم کی بنیادی وجوہات پر اثر انداز نہیں ہوتے اور ہم اسے بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے یہ اقدامات صورت حال کو بہتر نہیں بنا سکتے۔

پولیس کے کردار کے متعلق اس مکتب فکر کے حامی اس مفروضے سے ابتدا کرتے ہیں کہ بلا واسطہ جرائم پر قابو پانے میں پولیس ناکام رہتی ہے۔ معاشرتی نظم و نسق کو قائم رکھنے میں وہ کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہو سکتی ہے۔ مزید یہ کہ جب بدنظمی پیدا کرنے والی روش (جھگڑالو، شرابی نوجوان وغیرہ) کو قابو نہیں رکھ سکتی تو متعلقہ علاقے سے شریف لوگ نقل مکانی کر جاتے ہیں، غیر رسمی سماجی کنٹرول کمزور ہو جاتے ہیں اور وہاں جرم پھیلنے لگتا ہے۔ چنانچہ نظم و نسق کی بحالی جرائم کو قابو میں رکھنے میں مفید ہو سکتی ہے۔ پولیس کی موجودگی سے تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور غیر رسمی سماجی کنٹرول میں بہتری ہوتی ہے اور یوں علاقے میں تحفظ کا احساس بحال ہو جاتا ہے۔

یہ مکتب فکر پولیس کے فرائض کو تین زمروں میں تقسیم کرتا ہے۔ قانون کا نفاذ، نظم و نسق کو قائم رکھنا اور عوام کی خدمت (راستے صاف رکھوانا، گم شدہ اشیا کی بازیابی) ٹریفک کے نظام کو کنٹرول کرنا وغیرہ۔ ولسن کی نظر میں قانون کا نفاذ اور نظم و نسق میں فرق مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ گشت کرنے والی پولیس کے کارندوں کا اولین فرض نظم و نسق قائم رکھنا ہے۔ قانون کا نفاذ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے تو ان لوگوں کی نظر میں غیر رسمی سماجی کنٹرول کی انتہائی طاقت ور صورت ہے۔ پولیس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کنٹرولز کو ہر صورت میں بحال رکھے، ان علاقوں میں جہاں یہ کمزور پڑ چکے ہوں اور اس وجہ سے وہ زیادہ جرائم والے علاقے بن چکے ہوں، پولیس کی روایتی سراغ رسانی کے عمل کا اطلاق بار بار جرائم کا ارتکاب کرنے والوں پر کرنا چاہیے۔ اسی طرح عدالتوں اور جیل خانوں کو بھی چاہیے کہ وہ اس ایک چھوٹے سے گروہ کو، جو بار بار جرائم کا ارتکاب کرتا ہے، کڑی سزائیں دیں تاکہ انہیں جرم کے ارتکاب کا موقعہ ہی نہ مل سکے۔ یہاں اس مکتب فکر کا خیال ہے کہ نظم و نسق کی بحالی کو انصاف پر فوقیت حاصل ہے۔ نظم و نسق قائم رکھنے کے

لئے انصاف کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ عادی مجرموں کو سزا دیتے وقت صرف اس جرم کو پیشِ نظر نہیں رکھنا چاہیے جس کی کارروائی عدالت میں ہورہی ہے، بلکہ اس کے پورے ریکارڈ کو سامنے رکھ کر عدالت کو سزا تجویز کرنی چاہیے تاکہ مجرم کو معاشرے سے زیادہ سے زیادہ مدت کے لئے دور رکھا جاسکے اور اسے جرم کے ارتکاب کا مزید کوئی موقعہ نہ ملے۔ اس معاملے میں بھی عوام کا کردار بڑا اہم ہے۔ انہیں بھی منظّم ہوکر مقامی پہرے اور گشت کا انتظام کرنا چاہیے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے دائیں بازو کی حقیقت پسندی جرائم کے علیاتی بحران سے آنکھیں نہیں چراتی۔ امریکہ شرح جرائم ان لوگوں کی نظر میں ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ رویہ نظم ونسق کی بحالی اور اس کے استحکام کو انصاف پر ترجیح دیتا ہے جس کا اظہار وہ مندرجہ ذیل صورتوں میں کرتا ہے:

☆ اس امر کے باوجود کہ مختلف افراد نے خواہ کتنا ہی خفیف جرم کیا ہو، پولیس کو عملی طور پر تنظیم کی بحالی کی کوشش کرنی چاہیے، اور ایسی کوششیں عوام کو نظر بھی آنی چاہئیں۔

☆ پولیس کی مداخلت ان علاقوں میں ہونی چاہیے جو ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچے جہاں سے واپسی ناممکن ہو اور جنہیں پھر سے بحال کیا جاسکتا ہو، نہ کہ ان علاقوں میں جو بحالی کی سرحد سے پرے جاچکے ہوں۔

☆ اسی طرح منشیات کے متعلق کارروائی ان لوگوں کے خلاف نہیں ہونی چاہیے جو ان کے پوری طرح عادی ہوچکے ہیں بلکہ ان کے خلاف ہونی چاہیے جنہوں نے منشیات کا استعمال ابھی ابھی شروع کیا ہے کیونکہ انہیں روکا جاسکتا ہے۔ عادی افراد کو روکنا محال ہے۔

☆ عادی مجرم شرح جرائم میں زبردست اضافہ کرتے ہیں۔ انہیں جیلوں میں بند کرکے جرائم کرنے کے نااہل بنادینا چاہیے۔ انہیں سزا دیتے وقت دو چیزوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، ان کے جرائم کی سنگینی اور معاشرے اور عوام کا مفاد۔

بائیں بازو کی حقیقت پسند جرمیات

بائیں بازو کی حقیقت پسند جرمیات دراصل جرائم کے متعلق موجودہ نظریات پر کڑی تنقید ہے۔ یہ روش جرائم کی ناگزیر حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کرتی ہے۔ اس کی نظر میں جرم کے چار

عناصر ترکیبی ہیں: قانون اور قانون شکنی، (یعنی مجرمانہ فعل اور اس کے خلاف ردِعمل) مجرم اور جرم سے متاثرہ شخص۔ یہ روش جرم کے متعلق دوسرے نظریات کو یک طرفہ، جانبدارانہ اور ناکافی تصور کرتی ہے کیونکہ یہ سب مجرمانہ فعل کے صرف ایک حصے یعنی مجرم، اس سے متاثرہ شخص، قانون نافذ کرنے والے ادارے یا عوام کے ردعمل پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ہیں اور دوسرے عوامل کو بالکل نظرانداز کر دیتی ہیں۔ یہ جرمیات اس امر کی داعی ہے کہ یہ جرم کے مندرجہ بالا تمام عناصر ترکیبی کو پیشِ نظر رکھتی ہے اور اس کے وضع کردہ نظریات دوسرے نظریات کے مقابلے میں جامع ہیں۔ یہ دوسرے نظریات کو قطعی رد نہیں کرتی بلکہ ان سب کو باہم مدغم کرتی ہے۔

اگرچہ بائیں بازو کی حقیقت پسندی دائیں باز و خصوصاً ولسن کے نظریات پر شدید تنقید کرتی ہے، تاہم ان دونوں میں کچھ پہلو مشترک بھی ہیں۔

- یہ دونوں روشیں جرائم کو ایک گمبھیر مسئلہ تسلیم کرتی ہیں اور آئیڈیل ازم کی روایات کی طرح ان سے آنکھیں نہیں چراتیں۔ لوگوں کا جرائم سے خوفزدہ ہونا دونوں روشوں کے مطابق حقیقت پر مبنی ہے جبکہ بائیں بازو کا آئیڈیل ازم اور جدید افسر شاہی جرمیات اس خوف کو بے بنیاد وہم خیال کرتی ہیں۔
- جرائم کے انسداد خصوصاً عوام اور پولیس کے درمیان روابط کے متعلق موجودہ تصورات کو یہ دونوں روشیں غلط قرار دیتی ہیں۔
- یہ دونوں روشیں جرائم کے متعلق ہمارے موجود علم کو اور ان کے خلاف اقدامات کی افادیت کے محدود ہونے کی تسلیم کرتی ہیں مگر دونوں ان سے حاصل ہونے والے کم سے کم فوائد کو رد نہیں کرتیں۔ دونوں جرائم کے کسی خیالی حل سے اجتناب کرتی ہیں۔
- دونوں شدید نگرانی کے تحت جرائم کے متعلق مزید تحقیق پر اصرار کرتی ہیں۔ دونوں کی نظر میں جرائم کے انسداد پر لاگت زیادہ آتی ہے اور ان سے حاصل ہونے والے فوائد خاطر خواہ نہیں ہیں۔

بائیں بازو کی حقیقت پسندانہ روش کا شدید اصرار ہے کہ جرمیات کی حقیقت کو قبول کر کے آگے بڑھنا چاہیے۔ یہ جرم کی ہیئت ترکیبی، صورت، جرم کے سماجی سیاق وسباق، وقت کے دورانیہ میں جرائم کی قوس (ٹریجکٹری) اور جرائم کے ارتکاب کو تسلیم کر کے اپنے نظریات وضع کرتی ہے۔

MashalBooks.org

اس کے انسداد کے چار اجزائے ترکیبی ہیں: مجرم، جرم سے متاثرہ شخص، مجرمانہ فعل اور اس کے خلاف ردِعمل یہ چاروں امور جرم کی تعریف کی توضیح میں شامل ہوتے ہیں۔ یعنی جرم کی کسی تعریف میں مجرم، اس سے متاثرہ شخص، روایتی اور غیر روایتی کنٹرول کو شامل کئے بغیر جرم کی کوئی تعریف نہیں ہوسکتی اور ان کے بغیر جو تعریف بھی ہم وضع کریں گے وہ ناقص، یک طرفہ اور ناکافی ہوگی۔ اس جرمیات کی نظر میں چاروں امور جرم کو ایک مربع کی شکل دیتے ہیں جس کے ایک کونے پر مجرم ہے تو اس کے بالمقابل جرم سے متاثرہ شخص ہے۔ تیسرے کونے پر قانون نافذ کرنے والے ادارے ہیں اور اس کے بالمقابل عوام ہیں۔

مجرم اور اس سے متاثرہ شخص کا درمیانی ضلع الف ان دونوں کے درمیان ردِعمل کو ظاہر کرتا ہے۔ مجرم اور پولیس کے درمیان والا ضلع ب مجرم اور پولیس کے درمیانی عمل اور ردِعمل کا نمائندہ ہے۔ متاثرہ شخص اور عوام کے درمیان والا ضلع ج ان دونوں کے درمیان عمل اور ردِعمل کو منعکس کرتا ہے۔ ضلع د پولیس اور عوام کے درمیان تعلقات ......عمل اور ردِعمل کی نمائندگی کرتا ہے۔ چنانچہ جرم کے یہ چاروں عناصر نہ صرف شرح جرائم کا تعین کرتے ہیں بلکہ ان کے درمیان سماجی تعلقات کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ پولیس اور عوام کے درمیان تعلقات ہی پولیس کے موثر ہونے کا تعین کرتے ہیں۔ مجرم اور اس کے شکار کے درمیان تعلق جرم کے اثر کا تعین کرتا ہے۔ مجرم اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے درمیان عمل اور ردِعمل جرم کے بار بار ارتکاب میں ایک اہم عامل ہے جرائم کی نوعیت میں تبدیلی کے ساتھ ان چاروں عوامل کے درمیان تعلقات بھی متاثر ہوتے ہیں۔

یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ شرح جرائم کو ان چاروں عناصر کی پیداوار قرار دیتے وقت ہم صرف ایک عمل کو بیان کرتے ہیں۔ جرائم کی شرحیں، ممکنہ مجرموں، ان سے متاثر ہونے والے ممکنہ افراد، سرکاری اداروں کی کارکردگی کی تبدیل ہوتی ہوئی سطح، اور پبلک کے درمیان تبدیلیوں کی پیداوار ہیں۔ ان کو شامل کئے بغیر کسی بھی شرح جرائم کی وضاحت نہیں ہوسکتی۔

جرائم کے متعلق سماجی ردِعمل دو امور پر مشتمل ہے: ایک تو جرم کی تعریف ہے اور دوسرا اسے برداشت کرنے کا رویہ ہے۔ ان دونوں کو اکثر خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ دوسرا امر کنٹرول کا عنصر ہے۔ (یعنی کنٹرول کی وہ واقعی سطح جو کسی مخصوص جرم سے متعلق ہو)۔ چنانچہ اس لحاظ سے جرم کی تعریف کم قابل برداشت ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی مجرمانہ رویے کو کنٹرول کرنے کی اہلیت

MashalBooks.org

میں واقعتاً کمی آجائے۔

یہ امر مسلم ہے کہ سماجی کنٹرول اور مجرمانہ رویہ اپنے آپ میں مجرمانہ فعل کے محض قطبین سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ سوشل کنٹرول میں حکومت، عوام، پولیس، تعلیمی نظام، سوشل خدمات، میڈیا، کارخانوں کا دفتری ماحول، خاندان ہم جولی، اور سڑکوں اور گلیوں میں اجنبیوں کے درمیان غیر رسمی کنٹرول شامل ہیں۔ غیر روایتی کنٹرولز کے پبلک سسٹم اور پولیس سے متعلق دیگر اداروں کے جرائم کو کنٹرول کرنے کی مرکزی اہلیت کو تسلیم کرنا اس جرمیات کی ایک اہم خدمت ہے۔ چنانچہ ایسے نظام کی اہلیت کا دارومدار بھی ان تمام اداروں کے باہمی روابط پر ہے۔ ان میں پولیس اور پبلک تعلقات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس حیثیت کو وسیع حلقوں نے تسلیم بھی کیا ہے۔

جرائم کا سماجی سیاق وسباق

یہ سیاق وسباق ان چاروں عناصر کے فوری باہمی ردعمل پر اور ان میں سے ہر ایک کو سماجی ساخت کے وسیع تر تناظر میں دیکھنے پر مشتمل ہے۔ اس امر کا اظہار ٹیلر کی کتاب New Criminology میں کیا گیا ہے کہ جہاں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ انحرافی فعل کے فوری مخرج کو اس وسیع تر سوشل تناظر مین دیکھنا چاہیے اور اس تجزیے میں مجرم اور جرم سے متاثر شخص کو شامل کرنا ناگزیر ہے۔ بائیں بازو کا آئیڈیل ازم اسے ایک قدم اور آگے لے جاتا ہے جب وہ اس امر پر اصرار کرتا ہے کہ نہ صرف مجرمانہ افعال اور حکومتی اداروں کو اس تناظر میں دیکھنا چاہیے بلکہ اس عمل میں غیر روایتی سوشل کنٹرولز کو بھی شامل کرنا چاہیے۔

یہاں دائیں بازو کے حقیقت پسندی اور بائیں بازو کی حقیقت پسندی میں فرق بڑا نمایاں نظر آتا ہے۔ دائیں بازو کی حقیقت پسند رویے کی نظر میں جرائم کی وجوہات سماجی ساخت سے بالکل آزاد ہیں۔ مثال کے طور پر انحراف کے لئے خاندان اور والدین کو موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے اور یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ والدین اور خاندان معاشرتی ساخت میں شامل نہیں ہیں اور ان پر معاشرتی ماحول اثر انداز نہیں ہوتا۔ دوسری مثال جدید معاشرے کا مزاج ہے جسے کئی برائیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور اس امر کو نظرانداز کردیا جاتا ہے کہ مارکیٹ سوسائٹی کے حقائق سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

MashalBooks.org

جرم کی صورت

بائیں بازو کی حقیقت پسند جرمیات کی نظر میں جرم تعلقات کا ایک سلسلہ ہے۔ ہر قسم کے جرم میں تعلقات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت منشیات سے متعلق جرائم اور نقب زنی اور Assault والے جرائم سے تقابل سے ہوجاتی ہے۔ منشیات میں مجرمانہ تعلقات کی صورت کی شکل مخروطی ہوتی ہے اور اس کی جڑیں مختلف ممالک میں ملتی ہیں۔ نقب زنی میں کئی شخص ملوث ہوتے ہیں اور عمارتیں اور بنگلے شامل ہوتے ہیں، جبکہ حملے کے جرم میں ایک ہی شخص متاثر ہوتا ہے۔ جرائم کی تاریخ میں ان تعلقات میں جرائم کی مشمولات میں بھی اختلافات نظر آتے ہیں۔ جرم میں تعاون اور جبر دونوں شامل ہیں۔ منشیات کے جرم میں ہر قدم پر تعاون اور رضامندی ہوتی ہے۔ نقب زنی کے معاملے میں مال کے لین دین میں رضامندی شامل ہوتی ہے جبکہ نقب زنی کے فعل میں جبر کا عنصر پایا جاتا ہے۔ کسی پر حملہ کرنا سراسر جبر پر مبنی ہے۔

جرائم کا زمانی پہلو

وقت کا زمانی پہلو (یا اس کی تاریخ) جرائم کے چاروں عوامل پر اور ان میں سے ہر ایک کے دوسرے کے ساتھ ردِعمل پر مشتمل ہوتا ہے۔ بائیں بازو کی حقیقت پسندانہ جرمیات جرائم کی تاریخ اور بڑھوتری کو مدِنظر رکھتی ہے اور وقت کے دورانیہ میں جرائم کی قوس کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کرتی ہے اور دیکھتی ہے کہ ان کا باہمی ردعمل کیسا ہے۔ ان حصوں میں (۱) جرائم کی وہ وجوہات ہیں جو جرائم کے پس منظر میں کارفرما ہوتی ہیں۔ (۲) وہ اخلاقی سیاق وسباق جو مجرم کو جرم کی طرف اُکساتا ہے۔ (۳) جرم کے ارتکاب کا محل وقوع۔ (۴) جرم کا سراغ۔ (۵) مجرم کے خلاف ردعمل اور (۶) جرم سے متاثرہ شخص کا ردعمل۔

مجرمانہ پیشے کی تعمیر ان عناصر کا عمل اور ردعمل اور حکومت کی طرف سے مختلف جرائم کے خلاف اٹھائے گئے قدم کرتے ہین۔ ان میں مجرم کے پیشے میں مادی تبدیلیاں اور جرائم کے جواز بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تمام عوامل صرف مجرم کے پیشے کو ہی متاثر نہیں کرتے۔ جرائم کے مندرجہ بالا چاروں عوامل ...... بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ان کا باہمی ردعمل بھی بدلتا رہتا ہے۔ مجرموں کے خلاف پولیس کا ردعمل (سلوک) مائل بہ

تبدیلی ہے۔عوام میں جرائم کے خوف سے بچنے کے لئے لوگوں کے رویوں میں بھی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔

جرائم کا مکانی پہلو

اس پہلو کا تعلق اس مقام سے ہے جہاں جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ جرائم کے مخصوص علاقے ہوتے ہیں اور ان کا جغرافیہ بھی بدلتا رہتا ہے۔منشیات کے جرائم کا پہلو بین الاقوامی ہے لیکن اس کاروبار خاص خاص ملکوں تک محدود ہے اور پھر یہ کاروبار مختلف شہروں کے مخصوص علاقوں میں ہوتا ہے۔شہروں میں نقب زنی کا ارتکاب بھی شہروں کے مخصوص علاقوں میں ہوتا ہے اور مال مسروقہ کالین دین بھی چند علاقوں تک محدود یا مخصوص ہوتا ہے۔ مجرمانہ حملے کا کوئی مخصوص مکانی حملے کا مرتکب ہوتا ہے تو جائے وقوع بڑی نمایاں ہوجاتی ہے۔اس کا اظہار جرم کے واقعات کی تعداد اور اس خوف سے واضح ہوجاتا ہے جس میں اس علاقے کے رہنے والے مبتلا ہوتے ہیں۔

چنانچہ بائیں بازو کی حقیقت پسندانہ جرمیات اس امر کی مقتضی ہے کہ جرائم پر کنٹرول کرنے کے لئے مربعے کے چاروں کونوں پر واقع جرائم کے عوامل میں مداخلت کی جائے۔صرف کسی ایک عامل ......مجرم یا اس سے متاثرہ شخص یا پولیس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے یا عوام ......کومدِنظر رکھنے سے جرائم کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔جرائم پر کنٹرول کرنے کے لئے عوام کے شعور کو بیدار کرنا، پولیس اور جرائم کے انسداد سے متعلق دوسرے اداروں کی کارکردگی میں اصلاح اور بہتری، متاثرہ شخص کی حفاظت اور بحالی اور معاشرے کے ان ساختیاتی مسائل کی، جو جرم کے محرکات بنتے ہیں، اصلاح ضروری ہے ان سب پر توجہ دیے بغیر جرائم پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔

جرائم کی وجوہات

بائیں بازو کی حقیقت پسندانہ جرمیات کی نظر میں جرائم کے فوری محرکات میں اضافی (مطلق نہیں) محرومی پیش پیش ہے۔ چنانچہ اس خیال کے مطابق جرم معاشرے کے ہر طبقے میں کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔خواہ وہ طبقہ غریبوں کا ہو یا امرا اور خوشحال لوگوں کا۔مطلق محرومی سے جرائم کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ اضافی محرومی ہر طبقے میں ہوسکتی ہے لیکن غریب طبقہ اس سے زیادہ متاثر ہوتا ہے کیونکہ یہی لوگ اور اقلیتیں معاشرتی ترقی کے فوائد سے محروم رہتے ہیں اور یہ محرومی اضافی

ہوتی ہے، اور یہیں پر جرائم کار جحان زیادہ تیز ہوتا ہے۔

لیکن صرف یہ اضافی محرومی ہی جرائم کا سبب نہیں۔ جرائم کے کئی اور اسباب بھی ہیں۔ ان میں خواہشات اور ان کے حصول کے لئے مواقع کی کمی بھی ہوسکتی ہے، لالچ بھی ہوسکتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اور کسی طبقے سے مخصوص نہیں۔ ویسے یہ دیکھا گیا ہے کہ کوئی شخص جتنا مالدار ہوگا اتنی ہی اس میں لالچ زیادہ ہوگا۔ سفید پوشوں کے جرائم کے دوسرے محرکات میں یہ بھی شامل ہے۔ تاہم اضافی محرومی جرائم کا زبردست محرک ہے کیونکہ:

ا۔ یہ صرف محنت کشوں کے نچلے طبقے تک محدود نہیں بلکہ یہ پورے معاشرے میں ہر سطح پر موجود ہے۔

۲۔ جرائم کا تعلق صرف اقتصادی یا مالی جرائم سے نہیں کیونکہ تشدد کے ذیلی کلچر جہاں غریب طبقوں میں موجود ہیں وہاں خوش حال طبقے میں بھی اضافی اقتصادی محرومی کی بنا پر تشدد پایا جاتا ہے۔

صرف غربت اور محرومی ہی جرائم کا سبب نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو سب غریب لوگ مجرم ہوتے۔ غریب لوگوں کی ضروریات بڑی محدود ہوتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی رہتی ہیں۔ غربت یا محرومی کی بجائے نوجوان دوسروں کے پاس اپنے سے زیادہ سامان تعیش کی فراوانی دیکھ کر محرومی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس محرومی سے وہ سمجھوتا نہیں کر پاتے اور ارتکاب جرم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں زیر بحث آچکا ہے کہ جرائم کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ہر مجرم کے لئے کوئی نہ کوئی ذاتی محرک ہوتا ہے جو دوسرے مجرموں کے محرکات سے مختلف ہوتا ہے۔ اس صدی میں کئی ماہرین جرمیات جرائم کی وجوہات کو تلاش کرنے میں کافی سرگرداں رہے ہیں۔ ولسن نے جرائم کی کئی وجوہات بتائی ہیں۔ سوشل پوزیٹوازم کی نظر میں جرائم کی وجوہات کی نوعیت مطلق محرومی، جبریت اور میکانکی ہے۔ یہی تین امور اس مکتب کی فکر کا مرکزی نقطہ ہیں۔ ان زمروں کی ذیل میں آنے والے امور ہی اس فکر کی نظر میں جرائم کے ارتکاب کی وجہ بنتے ہیں۔ مگر یہ خیال غلط ہے اور جرائم کے مسئلے کا کوئی تسلی بخش حل پیش کرنے میں یہ مکتب فکر ناکام ہے۔

ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جو یہ ثابت کرے کہ مطلق محرومی (جیسے بے روزگاری، مفلسی، تعلیم کا نہ ہونا اور ٹوٹے پھوٹے مکان) ہی جرائم کا محرک ہے۔ انگلستان میں

MashalBooks.org

انتہائی غربت کے باوجود 1930 میں شرح جرائم بہت کم تھی۔ اس کے برعکس بائیں بازو کی حقیقت پسندانہ روش اس امر پر اصرار کرتی ہے کہ مخصوص حالات میں اضافی محرومی ہی جرائم کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب وسائل کی غیر یکساں تقسیم کو درست کرنے کے لئے کچھ لوگ ''انفرادی حل'' یا حربے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایک منصفانہ تجربے کے خلاف ایک غیر منصفانہ ردعمل ہے۔ چنانچہ یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ ایسا غیر منصفانہ انفرادی حل معاشرے کے مختلف طبقوں میں برسرعمل رہتا ہے اور جیسے کہ جرائم صرف غریب طبقے تک محدود نہیں، اسی طرح حل یا عمل بھی کسی طبقے سے مخصوص نہیں۔

مختلف ادوار میں ایسے ''انفرادی حل'' والے ردعمل کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوجاتے ہیں۔ انیسویں صدی کی سرمایہ دارانہ آزاد تجارت کی پالیسی کے دوران اس کا بڑا غلبہ تھا۔ اس صدی میں شرح جرائم بھی بہت بلند تھی۔ حالیہ دور میں برطانیہ میں بھی یہ کافی نمایاں ہونے لگی ہے اور وہاں شرح جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ صنعتی طور پر انتہائی ترقی یافتہ ملک امریکہ میں شرح جرائم انتہائی بلندی پر پہنچ چکی ہے۔

یہ خیال کہ مخصوص سماجی حالات جرائم کا سبب بنتے ہیں، فلسفہ جبریت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس بات کا کہ غربت کی بنا پر لوگ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں مطلب یہ نہیں کہ سب غریب لوگ مجرم ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ بیشتر غریب آدمی قانون کا احترام کرتے ہیں اور قانون شکنی سے گریز کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اکثر امیر آدمی قانون شکنی اور جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ مخصوص حالات کے تحت چند مخصوص طبقوں میں شرح جرائم زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے رویوں کی طرح جرم بھی ایک رویہ ہے اور مخصوص حالات میں یہ قطعاً ناگزیر نہیں۔ تاہم جرم محض اخلاقی اختیار کا معاملہ نہیں یعنی یہ ایسا شر نہیں جسے دنیا میں غیر مساوی طریقے سے پھیلا دیا گیا ہو۔ ہر معاشرے میں مادی حالات و وسائل مختلف ہوتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان مادی حالات و وسائل مین تفاوت بہت زیادہ ہے۔ یہ تفاوت ہی شرح جرائم کو متاثر کرتا ہے۔

جرائم کی وجوہات کی تلاش کا مقصد یہ نہیں کہ جرم کی کوئی میکانکی وجوہات ہوتی ہیں، جیسے مثال کے طور پر، ہم میز کو دھکیلتے ہیں اور میز حرکت میں آجاتی ہے۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ

معاشرے کے کچھ طبقوں کے رویوں میں موضوعی عنصر جرم کے ارتکاب کا بڑھاوا دیتا ہے۔ مگر اس خیال کو جرائم کے سادہ سماجی عوامل (جیسے کہ بے روزگاری) سے ملحق کرنے کی ساری کوششیں بے کار ہیں۔ خواہ ہمارا مطالعہ شماریات کے کتنے ہی عمدہ طریقوں پر منحصر کیوں نہ ہو، لوگ بیروزگاری کو غیر منصفانہ، غیر ضروری اور قابل اصلاح سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بیروزگاری بے اطمینانی کا سبب بنتی ہے، اور جب افراد سماج کے بڑے دھارے سے اپنے آپ کو سماجی اور اقتصادی طور پر الگ تھلگ محسوس کرنے لگتے ہیں تو بے اطمینانی کی یہ کیفیت اور بھی شدید ہو جاتی ہے اور یہی جرائم کا سبب بنتی ہے۔ موجودہ دور میں بے اطمینانی کی کیفیت بڑی واضح ہے۔ اس پر مستزاد جان میرڑ کینز کا اقتصادی فلسفہ ہے۔ لوگ کینز کی تجویز کردہ مداخلتوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ غربت اور بے روزگاری کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں اور حالات کا فطری تقاضا نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کی نظر میں بے روزگاری اور اضافی غربت فطری حقیقت نہیں بلکہ یہ معاشرے اور حکومت کی ناکامی کا نتیجہ ہیں۔

اس طرزِ استدلال میں مشکل یہ ہے کہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ جرائم کی وجوہات فوری ہوتی ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ لوگوں کو اپنی مشکلات کا اندازہ لگانے میں کافی وقت لگتا ہے اور ان کا حل تلاش کرنے میں وہ اور زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ اس صورت میں فوری وجوہات کا تصور مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ بے روزگاری اور جرم کی طرف رجوع کرنے میں کافی وقفہ ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے اپنے ذیلی کلچر کی استواری اور اپنے حالات کا جائزہ لینے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور یہ کلچر بے روزگاری کے چند برسوں کے بعد پھلتا پھولتا ہے۔ چنانچہ بے روزگاری سے جرم کو بیک وقت منسلک کرنا غلط طریق استدلال ہے۔ کیونکہ یہ اس امر کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ لوگ اپنی مشکلات کا جائزہ لینے اور ان کا حل تلاش کرنے میں کافی وقت لیتے ہیں۔

انسان مشکل حالات میں اپنی ترجیحات کا تعین کرتا ہے۔ اس بنا پر جرائم کے اسباب کا مسئلہ بڑی پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے لیکن ''نئی افسر شاہی جرمیات'' اس پیچیدگی سے انکار کرتی ہے اور بائیں بازو کی آئیڈیل ازم والی جرمیات میں بھی اس کا کوئی حل نہیں۔ اس کے برعکس ''دائیں بازو کی حقیقت پسندانہ جرمیات'' جرائم کے علل سے منکر نہیں اور ان کی کئی وجوہات شمار کرتی ہے لیکن اقتدار اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو یہ جرمیات جرائم کی اہم ترین وجہ قرار نہیں

MashalBooks.org

دیتی ہے۔

جسمانی ساخت اور جرم کے درمیان رشتے کو بائیں بازو کی حقیقت پسندانہ جرمیات قبول کرتی ہے مگر ذرا مختلف طریقے سے۔ نومبراسو کی طرح یہ جرائم کی وراثت خیال نہیں کرتی لیکن جرائم کے نقطہ نظر سے جسمانی ساخت، ہیئت، ہارمونز کے نظام اور عمر کو اہم قرار دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں بائیں بازو کے آئیڈیل ازم پر مبنی جرمیات اور لیبلنگ نظریات حیاتیات کے ساتھ جرائم کے رشتے کو بالکل نظرانداز کر دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمزور اور ضعیف افراد کے مقابلے میں قدآور اور طاقت ور اشخاص تشدد کے زیادہ مرتکب ہوتے ہیں۔ ہارمونز کے تشدد کے ساتھ مضبوط رشتے کو بائیں بازو کی حقیقت پسندی قبول کرتی ہے۔ صحت منداور مضبوط انسان غیر صحت منداشخاص کے مقابلے میں جرائم کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ عورتوں کے مقابلے میں مرداور خصوصاً نوجوان زیادہ تشدد پسند ہوتے ہیں۔ لیکن بائیں بازو کی حقیقت پسندی کی نظر میں یہ تشدد سماجی حالات کی پیداوار ہیں نہ کہ حیاتیات کی۔ اس جرمیات کی نظر میں جرم کرنے کے لیے جسمانی قوت ایک عارضی عامل ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ جرمیات کا ایک مکتب فکر، جس کا تعلق دائیں بازو کی جرمیات سے ہے، اس پر مصر ہے کہ ڈسپلن (یعنی نظم ونسق) کو انصاف پر ترجیح دینی چاہیے۔ لیکن بائیں بازو کی حقیقت پسندی اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ اس کی نظر میں معاشرے کی شیرازہ بندی صرف اس وقت تک ہی ممکن ہے جب تک معاشرے کے لوگ اسے انصاف پر مبنی دیکھیں اور سمجھیں۔ جب معاشرے کے اہم ادارے (جیسے پولیس اور عدلیہ) اپنی کارکردگی سے انصاف کے اس احساس کو کوئی گزند پہنچائیں ......جیسے من مانی گرفتاریاں (جیسے آج کل پاکستان میں ہو رہا ہے)، خوف وہراس پھیلانا اور ایسی سزائیں جو جرم سے غیر متناسب ہوں ......تو اس سے قانون اور انصاف کے متعلق بداعتمادی اور اجنبیت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ خصوصاً ان لوگوں میں جو سماجی کنٹرولز کا لازمی حصہ ہیں۔ اس زمرے میں محنت کش طبقے کے بے روزگار نوجوان اور اور وہ اقلیتیں آتی ہیں جو پہلے ہی اضافی محرومی کا شکار ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ پولیس کی بدسلوکی اور زیادتی اکثر انہیں جرائم کی طرف راغب کر دیتی ہے۔ یوں اضافی محرومی جرم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مزید برآں پولیس کی کارکردگی کا انحصار عوام کے تعاون ہے۔ اوپر وضاحت ہو چکی ہے کہ اکثر عوام

MashalBooks.org

ہی پولیس کی جرائم کی اطلاع دیتے ہیں۔ وہی شہادتیں مہیا کرتے ہیں۔ انصاف کے حصول کے لئے وہی عدالتوں میں خوار ہوتے ہیں۔ عوام کے تعاون کے بغیر پولیس کی کارکردگی بڑی محدود اور ناقص ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سب پولیس اور عدلیہ کے متعلق یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ ادارے من مانیاں کرتے ہیں اور ان کا طرزِ عمل غیر منصفانہ ہے تو قانون کی پابندی کرنے والا طبقہ جو ان اداروں کی کارکردگی کے لئے بڑا اہم ہوتا ہے، بددل ہو جاتا ہے۔ وہ ان اداروں سے تعاون کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور جرائم کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔

اس طرح جہاں دائیں بازو کی حقیقت پسندی کا خیال ہے کہ نظم و نسق کی انصاف پر بالا دستی سے جرائم کا موثر انسداد ہو سکتا ہے وہاں بائیں بازو کی حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ صرف انصاف کے ذریعے نظم و نسق کی بحالی اور استحکام سے ہی جرائم پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

اوپر بار بار اس امر کا اظہار ہوا ہے کہ جرائم کے انسداد کے لئے عوام کا تعاون اور کارکردگی بڑی اہم ہیں۔ اس اہمیت کی دو صورتیں ہیں: اول روزمرہ زندگی میں قانون کی رسمی اور غیر رسمی پابندی کرنا اور دوسروں کو ایسا کرنے کی تلقین کرنا۔ دوئم پولیس کے ساتھ تعاون یا عدم تعاون۔ اگر عوام پولیس اور عدلیہ سے بہ رضا و رغبت تعاون نہ کریں تو معاشرے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ پاکستان میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔

۳۔ پاکستان میں جرائم کے خاص پہلو

پاکستان میں جرائم کی موجودہ صورتِ حال کا ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم آزادی سے پہلے کے معاشرے اور جرائم کی صورتحال پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں اور دونوں کا موازنہ کریں۔

آبادی اور جرائم میں ایک بلاواسطہ رشتہ ہے۔ جتنی آبادی بڑھے گی اتنا ہی شرح جرائم میں اضافہ ہوگا۔ آبادی کی اپنی خصوصیات ہیں اور وہ جرائم میں منعکس ہوتی ہیں۔ پاکستان کی آبادی کی اپنی خصوصیات ہیں اور یہاں کے جرائم کی ہیئت ترکیبی بھی مخصوص ہے۔ پاکستانی معاشرہ جڑوں سے اکھڑا ہوا معاشرہ ہے اور ان پچاس برسوں میں یہ اپنی جڑیں اس طرح زمین میں نہیں اتار سکا جیسے کہ اس نے آزادی سے پہلے اتاری ہوئی تھیں۔

آزادی سے پہلے کے زمانے میں معاشرے میں جرائم اتنے نہیں تھے۔ پرانے پنجاب میں (جس میں نہری آبادیاں شامل نہیں تھیں) جرائم بہت کم تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معاشرے کی جڑیں بڑی گہری تھیں اور اس کے روایتی اور غیر روایتی کنٹرول پوری طرح کام کر رہے تھے۔ پشتوں سے لوگ ایک ہی گلی محلے میں رہتے تھے۔ ان کی آپس میں رشتے داریاں ہوتی تھیں۔ ہمسائیگی بھی ایک طرح سے رشتے کی صورت میں موجود تھی۔ کوئی بھی غیر قانونی حرکت کرنے سے پہلے ذہن میں سوال اٹھتا تھا کہ گلی محلے والے یا ہمسائے کیا سوچیں گے اور کیا کہیں گے۔ غلط حرکت کرنے والے کو بھی تو آخر وہیں رہنا ہوتا تھا اور اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں بھی تو کرنی ہوتی تھیں اور یہ رشتے داریاں بھی تو آخر میں شہر گاؤں یا محلے میں ہی کرنی ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس قسم کے معاشرے میں رہنے والے شخص کو کوئی بھی غلط کام کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا تھا کہ اس کے نتائج اس کے لئے کتنے خطرناک اور کتنے دیرپا ہو سکتے ہیں۔ غیر قانونی حرکت کرنے والوں کے سامنے یہ سوال بہت بڑی رکاوٹ بن جاتا تھا اور لوگ شر سے محفوظ رہتے تھے۔ اسی کو جرمیات کی مندرجہ بالا اصطلاح میں روایتی سماجی کنٹرولز کہا جاتا ہے۔

اس زمانے میں اگر کسی اجنبی کا گزر کسی محلے میں ہوتا تھا تو سب لوگ چوکنے ہو جاتے تھے کہ یہ شخص ادھر کیوں آیا ہے، اسے کس سے ملنا ہے اور کیوں ملنا ہے۔ اگر اس شخص کی نیت صاف ہوتی تو سب خاموش ہو جاتے تھے اور اگر وہ شخص کسی غلط نیت سے ادھر آنکلا ہوتا تو محلے والے باز پرس کرتے اور کبھی کبھار مرمت بھی کر دیتے تھے۔ جب اجنبی لوگوں کو پتا چلتا کہ گلی محلے والے اتنے چوکنے ہیں تو وہ بھی کسی غلط نیت سے ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔ یہ بھی ایک سماجی کنٹرول تھا جو جرائم کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھا۔

پشتوں سے مل جل کر اکٹھے رہنے سے لوگ ذاتوں اور برادریوں سے منسلک ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے خاندانی حالات سے پوری طرح واقف ہوتے تھے۔ سبھی جانتے تھے کہ الف کے کتنے بچے ہیں۔ ان میں سے لڑکے کتنے ہیں اور لڑکیاں کتنی ہیں اور ان کی عمریں کیا کیا ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں پڑھتے ہیں، ملازمتیں کرتے ہیں یا کوئی دھندا کرتے ہیں اتنی واقفیت ہونے سے کسی کی کوئی بھی غیر قانونی حرکت چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے لوگ بہت محتاط زندگیاں گزارتے تھے۔ ہر نوجوان کا ایک ایک قدم گنا جاتا تھا اور ہر لڑکی کی ایک ایک نظر

کا حساب رکھا جاتا تھا۔ معاشرے میں بڑی کڑی نگرانی کی یہ ایک صورت تھی۔ یہ حالات قانون شکنی کے رجحان کو روکنے میں بڑے کامیاب ہوتے تھے۔

اس زمانے میں اگر ایک ہی محلے دار کی کسی دوسرے شہر میں کسی دوسرے محلے دار سے ملاقات ہو جاتی تھی تو دونوں بڑی گرم جوشی سے ایک دوسرے سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کے کام آنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر ان میں سے کسی کو روپے پیسے کی ضرورت ہوتی تو دوسرا شخص بخوشی اسے قرض دے دیتا تھا اور کسی رسید پرچے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا کیونکہ یہ تو معلوم ہی ہوتا تھا کہ لوٹ کر آخر اسے اسی گاؤں تو جانا ہے، وہاں معاملہ صاف ہو جائے گا۔ یہ بھی ایک غیر رسمی روایتی کنٹرول تھا اور لوگوں کے لیے بھی قابل قبول تھا۔

ان سماجی کنٹرولز کا نتیجہ یہ تھا کہ پنجاب میں جب سیاہ یا سرخ آندھی آتی تھی تو لوگ کہتے تھے کہ کہیں کوئی بے گناہ قتل ہوا ہے۔ یعنی قتل ایک نہایت ہی غیر معمولی واردات سمجھی جاتی تھی۔ قانون کی حکمرانی ایسی تھی کہ دور دراز گاؤں میں بھی رات کے وقت لوگ اپنی بیل گاڑیوں کے نیچے لالٹین لٹکا کر سفر کرتے تھے۔ قانون کی حکمرانی کی دوسری مثال یہ تھی کہ ایک جوان عورت سونے میں پہلی پشاور سے ریل گاڑی میں بیٹھتی تھی اور کراچی جا اترتی تھی اور کسی مائی کے لال کو اس کی طرف انگلی اٹھانے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔

یہ سب کچھ بتانے کا مطلب یہ نہیں کہ آزادی سے پہلے جرائم نہیں ہوتے تھے۔ اس زمانے میں بھی جرائم ہوتے تھے اور جرائم پیشہ لوگ بھی ہوتے تھے۔ چوری چکار، ڈاکہ زنی، راہ زنی، قتل، اغوا، نقب زنی، مویشیوں کی چوری، رسہ گیری وغیرہ قسم کے جرائم کا ارتکاب ہوتا تھا مگر ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی جتنی کہ آج کل ہے کیونکہ سرکاری سطح پر جرائم پر قابو پانے کی کوششوں کے علاوہ خود معاشرے میں روایتی اور غیر روایتی سماجی کنٹرولز جرائم کو قابو میں رکھنے کی پوری کامیاب کوشش کرتے تھے۔ نہ ہی جرائم اتنے پیچیدہ اور سفاکانہ قسم کے ہوتے تھے جتنے آج کل ہو رہے ہیں۔ اس زمانے میں گروہ کی صورت میں نہ تو زنا بالجبر تھا، نہ ہی اغوا برائے تاوان ہوتا تھا، نہ ہی بتیس بتیس آدمیوں کو بغیر کسی وجہ کے حالات نماز میں قتل کر دیا جاتا تھا جیسا کہ حال ہی میں ملتان میں اور پھر لاہور میں مومن پورہ میں ہوا۔ نہ پولیس مقابلے ہوتے تھے اور نہ ہی اتنی تعداد میں قتل اور نہ ہی اتنے مقدمات تھے جیسے کہ ایک اخباری اطلاع کے مطابق آج کل لاہور میں ہو رہا ہے۔

پولیس اورعوام میں جرائم کو روکنے کے لئے تعاون موجود تھا جو جرائم کو کم کرنے کے لیے بڑا موثر تھا۔

پچھلے زمانے میں غیر قانونی اسلحہ رکھنا اتنا آسان نہیں تھا۔ پھر اسلحہ بھی بڑی بھونڈی قسم کا ہوتا تھا۔ اس میں چاقو، برچھیاں، کلہاڑے اور دونالی بندوقیں ہوتی تھیں۔ آج کل کی طرح کا مہلک اور ترقی یافتہ اسلحہ جیسے ماوزر اور لوگر قسم کے پستول اور کلاشنکوف جیسی رائفلیں نہیں ہوتی تھیں۔ اور پھر ہر ضلعے میں غیر قانونی اسلحہ اکٹھا کرنے کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اس طرح یہ وبا آج کل کے مقابلے میں تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ بھی ایک ایسا عامل تھا جو تشدد آمیز جرائم میں کمی کا باعث تھا۔ اسی طرح منشیات اور مخدرات یعنی نشیلی دوائیں جیسے ہیروین، کریک وغیرہ موجود نہیں تھیں۔ یہ بھی ایک اور عامل تھا جو جرائم میں کمی کا باعث تھا۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے یہ منشیات اور مخدرات ہی ہیں جو جرائم کی تعداد میں کسی قدر اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ سمگلنگ ایک اور عامل تھا جو آج کل کے مقابلے میں برائے نام تھا۔ آج کل تو اس نے ہمارے ملک میں ایک متوازی اقتصادی نظام قائم کر رکھا ہے اور اس میں ملک کی نامور شخصیات بھی ملوث ہیں۔ سمگلنگ کا یہ غیر قانونی متوازی نظام ہمارے قانونی اقتصادی نظام کا مسلسل گلا گھونٹ رہا ہے۔

جرائم پر قابو رکھنے میں اہم ترین عامل عدالتوں کا نظام انصاف تھا۔ ٹھوس مقدمے عدالتوں میں بھیجے جاتے تھے اور شہادتوں کی بنا پر ان کے فیصلے ہوتے تھے۔ عوام کو معلوم ہوتا تھا کہ ہر مقدمے کا جو فیصلہ عدالتیں کرتی ہیں وہ بیشتر درست ہوتے ہیں۔ صرف یہی ایک اتنا موثر عامل تھا جس کے بل بوتے پر عدالتی نظام قائم تھا اور جو جرائم پر بڑا موثر کنٹرول رکھے ہوئے تھا۔ موجودہ دور میں یہ عامل بوجوہ غیر موثر ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کل مجرم کا گرفت میں آنا اور پھر اس کا عدالت سے سزا پانا غیر یقینی ہو گیا ہے۔ مستغیث اور ملزم دونوں رشوت کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں اور بسا اوقات کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

آزادی سے پہلے لوگوں کو یقین ہوتا تھا کہ قانون شکنی کرنے پر پولیس ضرور باز پرس کرے گی اور اگر پولیس نے باز پرس کی تو پھر عدالت میں بھی جانا پڑے گا۔ صرف یہ یقین ہی جرائم کو روکنے کے لئے کافی تھا اور لوگ پولیس اور عدالتوں کے ڈر سے قانون شکنی سے گریز کرتے تھے۔ آج کل یہ خوف ختم ہو گیا ہے۔ لوگوں کو یقین ہے کہ قانون شکنی کرنے پر وہ پولیس کے ہتھے نہیں چڑھیں گے کیونکہ پولیس بذات خود نالائق، غیر موثر اور بے ایمان ادارہ بن چکی ہے اور اگر پولیس

کے ہتھے چڑھ بھی گئے تو کوئی نہ کوئی سیاست دان ان کی سفارش کو چلا آئے گا۔ پرانے زمانے میں انسانوں کی یہ سیاست دان جنس بڑی کمیاب تھی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ پاکستان بننے کے بعد یہ جنس بہت ارزاں ہوگئی ہے۔ان میں سے بیشتر کا اپنا مجرمانہ ریکارڈ ان کے متعلقہ تھانے میں موجود ہے۔ سیاست دانوں کی پہلی کھیپ روزمرہ کے انتظامی معاملات میں دخل نہیں دیتی تھی۔ مگر اب ہماری سیاست پر مجرمانہ رنگ چڑھ گیا ہے۔ اب وہی سیاست میں آسکتا ہے جس میں قانون شکنی کے رجحانات موجود ہوں اور بغیر کسی خوف کے قانون شکنی کا مرتکب ہو۔ یوں ہماری سیاست میں بہت سارا مجرمانہ عنصر داخل ہو چکا ہے جو خود جرائم کرنے کے علاوہ دوسرے مجرموں کی پشت پناہی بھی کرتا ہے۔ پاکستان کے جرائم کے منظرنامے میں یہ عامل بڑا اہم ہے کیونکہ یہ پولیس اور عدلیہ دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ ہمارے ہاں سیاست اور جرائم کا لازم وملزوم ہوگئے ہیں۔ برائی کا معیار بھی اب رہ گیا ہے کہ جو شخص جرائم کرنے کے بعد قانون کی گرفت میں نہیں آتا، اتنا ہی وہ بڑا اور سیاسی طور پر طاقتور ہے۔

آزادی سے پہلے کے زمانے میں لوگ آدھی رات کو بھی گھومنے پھرنے نکل پڑتے تھے اور کسی کو کوئی تعرض نہیں ہوتا تھا۔ گرمیاں ہوں یا سردیاں راتوں کی رونقیں عروج پر ہوتی تھیں۔ لوگ سیریں کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے ملتے ملاتے تھے لیکن آج کل شام ہوتے ہی ہو کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور روشنیوں والے شہروں کا تصور ختم ہو گیا ہے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آزادی کے بعد رفتہ رفتہ یہ صورتحال ختم ہوگئی ہے اور جرائم کی تاریکی نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس کی چند در چند وجوہات ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے جرائم کے موجودہ منظرنامے کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

جرائم کی موجودہ صورت حال کا آغاز 1947ء کے بلووں، قتل وغارت گری اور نفسانفسی سے ہوا۔ جو لوگ خون کے دریا کو پار کر کے ادھر آئے یا ادھر سے گئے یا جن آنکھوں نے یہ خوفناک مناظر دیکھے ان کے نزدیک پشتوں سے چلی آرہی انسانی اقدار یعنی انسانی جان ومال اور عزت کے تصورات اور دوسری اخلاقی اقدار بالکل بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ اس سے مروجہ اخلاقی اقدار سے لوگوں کا ایمان اُٹھ گیا۔ انہیں روکنے والا روایتی معاشرہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، منتشر ہو چکا تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا روایتی کنٹرول غیر موثر ہو کر رہ گئے اور اس سے غیر قانونی سرگرمیوں کے

MashalBooks.org

راستے بالکل صاف ہو گئے۔ نہ مروت، نہ رواداری، نہ رشتے داریاں اور نہ گلی محلے والوں کا خوف باقی رہا جو غیر قانونی سرگرمیوں کا راستہ روک سکتا۔ یوں ایک مستحکم معاشرے میں جرائم کے خلاف جو نفسیاتی اور اخلاقی رکاوٹیں پائی جاتی تھیں ان حالات کے باعث ختم ہو گئیں اور جرم کے ساتھ جو گھناؤنے تاثرات تھے، ان میں بھی کمی واقع ہو گئی۔

اس پر متروکہ جائیدادوں کے چکر، کلیم اور محکمہ آبادکاری نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر متروکہ جائیدادوں کے لئے جھوٹے سچے کلیم داخل کرنے لگے اور یہ ایک نئی قسم کا بازار کھل گیا۔ ایک شخص مکان کے لئے یا غیر منقولہ جائیداد کے لئے اپنا کلیم پشاور میں داخل کرتا، مکان الاٹ کراتا، اسے اونے پونے بیچ کر راولپنڈی آ کر وہی آموختہ دہراتا اور یہاں سے فارغ ہو کر لاہور آ جاتا اور یہاں اسی واردات کو دہراتا اور پھر آگے چل دیتا۔ چونکہ محکمہ آبادکاری پوری طرح منظم نہیں ہوا تھا اور سارا کام ہنگامی بنیادوں پر ہو رہا تھا اس لئے پکڑے جانے کا خوف بھی نہیں تھا۔ یہ لوٹ کھسوٹ تقریباً گیارہ سال جاری رہی تا آنکہ ایوب خان کا مارشل لا آیا اور کھربوں کے جھوٹے کلیم لوگوں نے واپس لے لئے۔ تاہم یہ بازار ابھی بھی قائم ہے گو اس میں وہ گرم بازاری باقی نہیں رہی۔ محکمہ آبادکاری نے اتنی تباہی مچائی کہ لوگوں نے اس کا نام محکمہ بربادکاری رکھ دیا اور شاید آج بھی یہ محکمہ اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرے کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کی آبادی اب بھی اس طرح جم جما کر نہیں بیٹھی جیسے کہ آزادی سے قبل کا معاشرہ تھا۔ اس میں دو طرح کی حرکت نظر آتی ہے۔ ایک حرکت تو وہ ہے جو ایک شہر سے دوسرے شہر کے درمیان ہوتی اور دوسری حرکت دیہاتی آبادی کی شہر کی طرف منتقلی ہے۔ پہلی حرکت کی وجہ یہ امر ہے کہ کسی فرد یا خاندان کا روزگار بدلتا رہتا ہے یا ان کے پاؤں ٹھیک طرح جمتے نہیں۔ دوسری حرکت کی وجہ صنعتی ترقی ہے جس کی بنا پر لوگ تلاش معاش کے لئے شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ یہ حرکتیں بھی شرح جرائم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس قسم کی حرکت کرنے والے لوگ واردات کرنے کے بعد کسی دوسرے شہر کا رخ کرتے ہیں اور اس طرح وہ کافی حد تک قانون گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ ہماری پولیس کی پیشہ ورانہ اہلیتیں سب پر عیاں ہیں۔ وہ تو کسی ایسے شخص کو بھی تلاش نہیں کر سکتی جو شہر کے ایک حصے میں واردات کر کے اسی شہر کے دوسرے حصے میں جا بسے۔

ان امور کو ذہن میں رکھ کر ہم جرائم پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مندرجہ ذیل صورت حالات نظر آتی ہے۔

جدول جو1947ء سے1981ء تک جرائم کو پیش کرتی ہے۔

جرائم/سال	1947	1951	1962	1972	1981
درج شدہ جرائم	74,107	76,519	97,900	156,722	152,782
اشخاص کے خلاف جرائم	16,068	13,755	17,697	32,366	32,281
قتل	4,489	2,263	2,990	4,697	4,307
مال سے متعلق جرائم	34,354	36,537	32,710	51,271	30,235
آرمز آرڈی نینس	3,109	3,545	3,086	1,271	20,881
منشیات اور ایکسائز	1,691	2,735	3,984	9,908	10,467

ماخذ: پولیس بیورآف ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ

مندرجہ بالا جدول کا مطالعہ کرتے وقت چند امور کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ایک ماہر جرمیات نے، جس کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے، بہت سے ممالک کے جرائم کے تجزیے اور بہت ساری شہادتوں کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کسی ملک میں واقع ہونے والے جرائم میں سے صرف پندرہ فی صد کی اطلاع پولیس کو دی جاتی ہے۔ جرائم کی اطلاع پولیس کو نہ دینے کی وجوہات اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ ان میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں پولیس کا رویہ ایسا ہے کہ عام لوگ اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مزید برآں ہماری پولیس مقدمات درج کرنے سے گریز کرتی ہے۔ تفصیل اس کی کچھ یوں ہے:

پاکستان کے ضابطہ فوجداری کی دفعہ 15A کے تحت پولیس کا یہ قانونی فرض ہے کہ جرم کی اطلاع ملنے پر وہ مجوزہ فارم پر مقدمہ درج کرے۔ اسے ابتدائی رپورٹ، فرسٹ انفرمیشن رپورٹ یا F.I.R کہا جاتا ہے۔ تمام فوجداری مقدمات کی بنیاد، جن پر بڑے بڑے فاضل وکلا اور بڑے بڑے فاضل جج صاحبان بحث مباحثہ کرتے ہیں، یہی رپورٹ ہے۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اسے درج کرنے والا یا لکھنے والا نیم خواندہ شخص ہوتا ہے جسے تھانے کا محرر کہا جاتا

MashalBooks.org

ہے جس کا عہدہ ہیڈ کانسٹیبل کا ہوتا ہے۔ جب یہ نیم خواندہ شخص F.I.R ضبط تحریر میں لے آئے تو تفتیش کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں مقدمہ درج کروانا ایک بہت بڑا مرحلہ ہے۔ اول تو تھانے کا محرر مقدمہ درج کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا اور اطلاع دہندہ کو ہر طرح سے یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ مقدمہ بالاخر اسی کے لئے تکلیف اور خرابی کا باعث ہوگا۔ اگر مدعی کی بے عزتی اور دوسری خرابیوں کے باوجود تھانے کا محرر مقدمہ درج کرنے کے لئے تیار ہو بھی جائے تو اولین مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ مقدمہ کس ضابطے کے تحت درج کیا جائے۔ تعزیرات پاکستان کے تحت، مارشل لا قوانین کے تحت یا شریعت ایکٹ کے تحت۔ مقدمے کی نوعیت کے علاوہ تینوں اقسام کی الگ الگ ''فیسیں'' مقرر ہیں۔ ''فیس'' ادا کرنے کے بعد اور ایک دستہ کاغذ اور ایک درجن قلم مہیا کرنے کے بعد ابتدائی رپورٹ درج کی جاتی ہے اور مقدمے کا آغاز ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ پولیس کے ہاتھوں عذاب اٹھانے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں پولیس والوں کو موقعے پر لے جانے کے لئے سواریاں مہیا کرنا، ان کی خاطر مدارات اور دوسرے نخرے اٹھانا شامل ہیں۔ اس طرح اطلاع دہندہ یا مدعی کے اخراجات اس کے مقدمے میں ہونے والے نقصان سے کہیں زیادہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان حالات کے پیش نظر شرفا پولیس سٹیشن جانے سے گریز کرتے ہیں اور مقدمات درج نہیں کرواتے۔

مقدمہ درج نہ کرنے کو اخفایا اخفائے جرم کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے برکنگ (burking) کہا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں خصوصاً پاکستان کے ابتدائی برسوں میں اگر پولیس کے افسران بالا کو اخفا کی واردات کا علم ہو جاتا تھا تو تھانیدار یعنی سٹیشن ہاؤس آفیسر جو ضابطہ فوجداری کے مطابق تھانے کا ذمہ دار ہوتا ہے، مع محرر کے فوراً معطل کر دیا جاتا تھا اور ان کے خلاف محکمانہ کارروائی کی جاتی تھی۔ الزام ثابت ہونے پر یا تو انہیں معزول کر دیا جاتا تھا یا انہیں گھر بھیج دیا جاتا تھا۔ لیکن اب صورتحال بدل چکی ہے۔ اخفا کا مقصد افسران بالا کو یہ تاثر دینا ہوتا ہے کہ جرائم پر پولیس کا پورا کنٹرول ہے۔ آج کل اس روش میں افسران بالا کا ایما بھی شامل ہوتا ہے۔

اخفائے جرم تھوڑے وقت کے لئے یہ تاثر ضرور دیتا ہے کہ جرائم پر پولیس کا کنٹرول ہے لیکن اس کے طویل المدت نتائج بڑے خطرناک ہیں۔ جب مجرم کو یہ پتا چل جائے کہ پولیس اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہی تو وہ زیادہ دلیر ہو جاتا ہے اور مزید جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔

MashalBooks.org

یوں جرم معاشرے کی رگوں میں سرایت کر جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ ایک بیمار معاشرہ ہے۔ اسے کئی بیماریاں لاحق ہیں۔ سب سے بڑی بیماری لاقانونیت ہے جو اس معاشرے کے ہر طبقے پر سیاست، تجارت، صنعت، زراعت، تعلیم وتعلم، وغیرہ سب چھائی ہوئی ہے۔ یہاں ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ لاقانونیت کا ارتکاب کر کے بچ جائے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کی بیماریوں میں سے ایک یہی لاقانونیت ہے جس کا بڑا سبب پولیس کے ہاتھوں جرائم کا اخفا ہے۔ اس کی سزا پورے معاشرے کو بھگتنی پڑتی ہے اور ہمارا معاشرہ یہ سزا بھگت رہا ہے اور اس کی ایک صورت پولیس تشدد بھی ہے جس کی وجہ سے (ایک اخباری اطلاع کے مطابق) ایک سال میں 200 اموات واقع ہو چکی ہیں۔ مذہبی تشدد جس کی مثال شاید الجیریا ہی میں نظر آئے، سمگلنگ، منشیات کا دھندا، شناختی کارڈوں کا دھندا، لوکل اور سپیشل قوانین کی خلاف ورزیاں، بینکوں کے نادھندگان، فائینانس کمپنیاں، تاج کمپنی، مہران بینک۔ بیشتر ویگنوں اور رکشاؤں کا پولیس کی ملکیت ہونا اور اس بنا پر ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزیاں۔ زرعی اور انسانی ادویات کی جعلی سازی، قبضہ گروپ، بوٹی مافیا، صرف کاغذات پر سکولوں کا قیام، سڑکوں اور ہسپتالوں کی صرف کاغذات پر موجودگی اور وبا کی صورت میں رشوت جس میں بڑے سے لے کر چھوٹے سرکاری ملازم تک بلا کسی استثنا کے شامل ہیں۔

اخفائے جرائم کی اس روش کی بنا پر ایک محتاط محکمانہ اندازے کے مطابق ان مقدمات کا، جن کی اطلاع پولیس کو دی جاتی ہے، صرف پندرہ فی صد درج ہوتا ہے اور باقی ماندہ 85 فیصد اسی اخفا کی روش کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس تخمینے اور مندرجہ بالا جدول کی مدد سے اس ملک میں جرائم کی صورتحال کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

اس جدول میں 1947 کے دوران درج شدہ جرائم میں شاید وہ وارداتیں شامل نہیں جن کا ارتکاب فسادات کے دوران ہوا۔

اس طرح ایوب خان والے مارشل لا سے قبل چلنے والی تحریک میں جن وارداتوں کا ارتکاب کیا گیا، وہ بھی شامل نہیں۔

اور آخر میں نام نہاد نظام مصطفیٰ والی تحریک میں سرزد ہونے والے جرائم بھی شامل نہیں جو ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف چلی۔

MashalBooks.org

مندرجہ بالا امور سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ ہر ملک میں جرائم کی صورت حال دوسرے ممالک کے جرائم کی صورت حال سے مختلف ہوتی ہے۔ یہی صورت پاکستان کی ہے۔ یہاں جرائم کے سرچشمے اور ان کی صورت احوال باقی ممالک سے مختلف ہے تاہم جرائم کے چند پہلو صرف پاکستان ہی سے مخصوص ہیں۔

اول نمبر پر ہمارا جاگیرداری نظام ہے۔ یہ نظام انگریز نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے بنایا اور ہم نے چند ترمیموں کے ساتھ اسے باقی رکھا جو جمہوریت کے ساتھ ساتھ آج بھی قائم ہے اور بہت ساری معاشرتی برائیوں کے ساتھ ساتھ یہ جرائم کا بہت بڑا سرچشمہ ہے۔ اس کی ایک ہلکی سی جھلک مسعود کھدر پوش کی ''ہاری کمیٹی کی رپورٹ'' میں نظر آتی ہے جسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

''پاکستان کے جرائم کے منظرنامے میں جاگیرداری/سرداری کی ایک مخصوص حیثیت ہے، اس لئے اس کی ہیئت پر نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

مغلیہ دور میں جاگیردار کی سیاسی اور فوجی حیثیت تھی جو جاگیردار کی زندگی تک رہتی تھی اور مرنے پر بادشاہ کو واپس ہو جاتی تھی۔ انگریز نے اس میں ترامیم کر کے اس ملک میں اپنے مقاصد انگریزی حکومت کے استحکام، امن وامان کے قیام، لڑائی میں دامے، درمے، سخنے امداد اور فوج میں بھرتی حاصل کرنے کے لئے قائم رکھا اور جاگیر کو موروثی بنادیا۔ اب جاگیردار کے مرنے پر جاگیر حکومت کو نہیں واپس ہوتی تھی بلکہ اس کے وارثوں کو منتقل ہو جاتی تھی۔ تقریباً یہی صورت احوال بلوچستان اور صوبہ سرحد میں سرداری نظام کی ہے جہاں سردار یا خان یا ملک کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا وارث ہو جاتا ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان نے تو ریاستوں، جاگیروں اور زمینداری نظام کا خاتمہ کر دیا لیکن ہمارے ہاں یہ اب بھی قائم ودائم ہے۔

بقول ڈاکٹر مبارک علی ''پاکستان کے ابتدائی دور میں چونکہ نہ کوئی دستور تھا اور نہ ہی انتخابات ہوئے اس لئے مسلم لیگ، جو جاگیرداروں کے تسلط میں تھی، اس نے بغیر کسی مقابلے کے اقتدار کو اپنے لئے مخصوص رکھا۔ سیاست کے ساتھ ساتھ انہوں نے بیوروکریسی اور فوج میں بھی اپنا اثر ورسوخ بڑھایا اور یہاں ان کے خاندان کے افراد نے اعلیٰ عہدوں پر قبضہ جما لیا۔ چنانچہ سندھ میں جب بیراج کی زرخیز زمینیں ان لوگوں کو ملکی اور فوجی خدمات کے عوض دی گئیں تو

MashalBooks.org

اس سے یہ طبقہ زیادہ طبقہ ہوگیا۔

''پاکستان میں مارشل لا اور فوجی آمریت کے زمانے میں بھی جاگیردار طبقے ہر مراعات میں کوئی فرق نہ آیا۔ فوج اور بیوروکریسی سے ان کے روابط مضبوط ہوگئے اور ان کی وجہ سے انہوں نے اپنے اختیارات کو بحال رکھنا۔''

''ہمارے لئے جوامر اہمیت کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ ''پاکستانی کی جمہوریت بھی جاگیردارانہ ہے کیونکہ ملک کی ہر سیاسی جماعت، سوائے چند نظریاتی جماعتوں کے ان کی گرفت میں ہے۔ اس جاگیردار جمہوریت میں جمہوری ادارے ان کے لئے موثر ہتھیار ہیں جن کو وہ اپنی ذات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں ایسے قوانین پاس ہوتے ہیں جو ان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اسی لئے آج تک زرعی ٹیکس پاس نہیں ہوا کیونکہ پارلیمنٹ میں ان کی اکثریت ہے جو اس بل کو پاس نہیں ہونے دیتی۔ (جاگیرداری 165,164)

''زراعت میں مشینوں کے استعمال کی وجہ سے اب جاگیردار اور کسان کے تعلقات میں بھی فرق آ گیا ہے۔ گاؤں اور شہروں میں رابطے بڑھنے کی وجہ سے شہر کی مارکیٹیں ہاریوں اور کسانوں کے لئے کھل گئی ہیں۔ اس لئے ہاریوں سے کھیتوں پر کام کرانے کے لیے جاگیردار تشدد کرتا ہے جس کی وجہ سے سندھ میں نجی جیلوں کی بھرمار ہے۔'' (جاگیرداری 168)

جرائم کے منظرنامے کی رو سے یہی مقام ہماری دلچسپی کا باعث ہے۔ جاگیر پر جاگیردار کا قانون چلتا ہے۔ وہی مدعی ہے، وہی وکیل ہے اور وہی منصف ہے۔ اس کی ذات ہی عدالت ہے۔ اس کی اپنی پولیس ہے جو علاقے کے بدمعاشوں چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں پر مشتمل ہے۔ اس کا اپنا مواصلاتی نظام ہے اور اس کے ہاری، مزارعے یا جاگیر پر کام کرنے والے کی حیثیت محض رعایا کی ہے۔ اس کی اپنی جیلیں ہیں جہاں بنیادی انسانی حقوق کے خلاف جبری مشقت لی جاتی ہے۔ جس کی تفصیل اخباروں میں چھپی رہتی ہے۔

چنانچہ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے رسالہ ''جہد حق'' جلد نمبر 2، شمارہ نمبر 12 (دسمبر 1995) سے یہ اقتباسات دئے جا رہے ہیں:

''ٹیم کے ارکان اس سلسلے میں ضلع سانگھڑ کے زمیندار مرید خاں مری کے گاؤں دہیہ دم گئے۔ ٹیم کے ارکان کے ہمراہ گاؤں سے ایک ماہ قبل فرار ہونے والا خمیو بھیل بھی تھا۔ جب ٹیم کے

ارکان مرید خاں مری کے گاؤں درویش کے گنے کے کھیتوں میں پہنچے تو وہاں ضلع تھر کے ایک گاؤں بگھار کے کرشن بھیل چنو بھیل، گیلو بھیل، مولو بھیل ......زنگ آلود زنجیروں اور تالوں سے دو دو کی جوڑی میں بندھے ہوئے گنے کی کٹائی میں مصروف تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ کئی مہینوں سے اسی طرح بندھے ہوئے کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی طرف کے سینکڑوں ہاری مرید خاں مری کے وسیع وعریض رقبے پر پھیلے ہوئے کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔

سندھ میں ڈاکہ زنی کئی خاندانوں کا آبادی پیشہ تھا جو پشت در پشت چلتا تھا اور خاندانوں کے لئے باعث افتخار تھا۔ ان کی پناہ گاہ سندھ کے گھنے جنگلات تھے جن کے چپے چپے سے یہ لوگ واقف تھے، اس لئے پولیس ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ چنانچہ ان ڈاکوؤں نے اپنی غیر قانونی سرگرمیاں جاری رکھیں اور پولیس سے محفوظ رہے۔ لیکن جنگلات کم ہونے سے اور زمینوں کی آبادکاری کے بڑھنے سے ان ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں کم ہونے لگیں۔ ادھر پولیس کو بھی بہتر ہتھیار دیئے گئے اور ان کے لئے سواریوں کا انتظام بھی ہو گیا۔ پولیس زیادہ متحرک ہو گئی تو اس سندھ میں ڈاکہ زنی کافی کم ہو گئی اور ڈاکوؤں نے سندھ کے مختلف جاگیرداروں کے ہاں پناہ لے لی۔ جاگیرداروں نے انہیں خوش آمدید کہا اور اپنے پاس رکھ کر ان سے غیر قانونی کام لینے لگے۔ جاگیردار کے حکم پر وہ ڈاکے ڈالتے تھے، لوگوں کی بہو بیٹیوں کو اٹھا لیتے تھے یا ایسے لوگوں کو قتل کر دیتے تھے جو جاگیردار کی حکم عدولی کرتے تھے۔ سرکاری پولیس جاگیرداروں کے سامنے بے بس تھی، کیونکہ جاگیر پر تو جاگیردار یا وڈیرے کا حکم چلتا تھا نہ کہ سرکار کا۔

بحالی جمہوریت کی 1985ء کی تحریک میں جس میں جاگیردار پیش پیش تھے ان ڈاکوؤں کو بھی شامل کر لیا گیا تا کہ تحریک کو مزید تقویت ملے اور غارت گری میں اضافہ ہو۔ اس تحریک کو فوج نے کچل دیا تو ان ڈاکوؤں نے اغوا برائے تاوان کی وارداتیں شروع کر دیں۔ جب یہ وارداتیں کثرت سے ہونے لگیں اور کراچی کے صنعت کاروں اور تاجروں نے کراچی کو خیرباد کہنا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ پھر ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی ہوئی اور یہ طبقہ دب گیا۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جاگیردار اور ڈاکوؤں میں تعاون کیوں ہوا۔ ظاہر ہے کہ دونوں قانون شکنی کے مرتکب ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے درمیان تعاون اور ایک دوسرے کے لئے ہمدردی کے جذبے کا پیدا ہونا فطری عمل تھا کیونکہ دونوں کو ایک دوسرے

MashalBooks.org

کی ضرورت تھی۔

ہمارے جرائم کے منظر نامے سے مندرجہ بالا حقائق مخصوص ہیں جو کسی اور ملک کے جرائم کے منظر نامے میں نظر نہیں آتے۔

چنانچہ یہی جاگیردار سردار، خان اور زمیندار ہماری اسمبلیوں میں بیٹھتے ہیں اور عوام کی تقدیر کے فیصلے کرتے ہیں۔ یہ وہ مجرم ہیں جن کے جرائم سرکاری اعداد وشمار میں شامل نہیں کئے جاتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہاتھ ڈالنا پولیس کے بس کی بات نہیں بلکہ دردناک پہلو تو یہ ہے کہ پولیس خود ان کی کارندہ بن جاتی ہے۔ دودھ دینے والی بھینس، اس کے چارے، اناج، گھی اور دوسری چھوٹی موٹی مراعات کے عوض پولیس کے ملازم اپنا ضمیر بیچ دیتے ہیں اور جاگیردار کے مجرمانہ احکامات کی تعمیل خود کرتے ہیں۔ یہی پولیس کے ملازم حکومت کے کان اور آنکھیں ہوتی ہیں اور اس لئے حکومت اور انتظامیہ کو بھی پتا نہیں چلتا کہ علاقے میں کیا ہو رہا ہے۔

جاگیردار کی جبری مشقت سے ملتی جلتی وہ جبری مشقت ہے جو ٹھیکدار ان نابالغ لڑکوں سے لیتے ہیں جنہیں وہ اغوا کروا کر کے یا خرید کر اپنے پاس بطور مزدور رکھ لیتے ہیں۔ جہاں بھی مٹی کی کھدائی کا کام ہو، رہا ہو جیسے بیراج بنانا یا نہریں کھودنا، وہاں یہ بیگار کیمپ موجود ہیں۔ ان لڑکوں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا ہے اور ان پر زبردست پہرہ ہوتا ہے۔ ان کو خوراک بھی اچھی نہیں ملتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو سرکاری افسران کاموں کی نگرانی کرتے ہیں ان کی نظر میں یہ بیگار کیمپ کیوں نہیں آتے۔ ظاہر ہے یا تو وہ نااہل ہیں یا وہ اس جرم میں ٹھیکیدار کی اعانت کرتے ہیں۔ بعض اوقات کچھ لڑکے بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ساری واردات پولیس اور انتظامیہ کو سناتے ہیں لیکن ان قومی مجرموں کے خلاف صرف واجبی سی کارروائی ہوتی ہے اور بس۔

جبری مشقت کی ایک اور مثال اینٹوں کے بھٹوں کے مزدور ہیں۔ بھٹے کا مالک کچھ رقم پیشگی دے کر انہیں نوکر رکھ لیتا ہے۔ رقم پر ویسے ہی سود لیا جاتا ہے جیسے ہاری سے جاگیردار لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزدور خاندان نہ تو وہ قرضہ اتار سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے آپ کو آزاد کرا سکتے ہیں۔

ہمارے جرائم کے منظر نامے کے یہ مخصوص پہلو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ اب بھی ازمنہ وسطیٰ کے دور سے گزر رہا ہے جب کہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاریاں

MashalBooks.org

کررہے ہیں۔

بچے اوراونٹوں کی دوڑ(Camel Kids)

متحدہ عرب امارات میں خوشحالی کے دور دورے کے ساتھ ایک غیر انسانی روایت شروع ہوگئی ہے۔عرب لوگ یہاں سے اغوا شدہ بچے خرید کر اپنے ملک میں لے جاتے ہیں۔ جب ان کے ہاں اونٹوں کی دوڑ ہوتی ہے تو ان بچوں کو اونٹوں کی پیٹھوں پر باندھ دیا جاتا ہے۔ جب اونٹ دوڑتے ہیں تو بچے خوف سے چیختے ہیں اور اونٹ اور زیادہ تیزی سے بھاگنے لگتا ہے۔ کچھ بچے تو خوف سے وہیں مرجاتے ہیں، کچھ اونٹوں سے گر پڑتے ہیں اور دوسرے اونٹوں کے پاؤں تلے آکر کچلے جاتے ہیں۔ پاکستان میں کچھ گروہ اس بہیمانہ تجارت میں ملوث ہیں جو چھوٹے بچوں کو بہلا پھسلا کر اغوا کر لیتے ہیں۔ کچھ والدین بھی ایسے ہیں جو غربت کے ہاتھوں تنگ آکر ان گروہوں کو اپنے بچے فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ وارداتین بھی پاکستان سے مخصوص ہیں۔ پولیس ان کے خلاف موثر اقدامات نہیں کرسکی۔ پاکستان میں آنے والی مختلف حکومتوں نے بھی اس مجرمانہ لعنت کی طرف کوئی زیادہ توجہ نہیں دی۔

بردہ فروشی

جنوب مشرقی ایشیا کے چند ملکوں میں بشمول پاکستان یہ جرم مسلسل ہورہا ہے۔ان ممالک میں سری لنکا، ہندوستان، فلپائن وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں سے عورتوں کو خرید کر مشرق وسطیٰ لے جاکر بیچ دیا جاتا ہے۔اپنے ملک سے نکل جانے کے بعد ان عورتوں کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ۔

طالب علموں کا تشدد

جماعت اسلامی اور بھٹو نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طالب علموں کو سیاسی مقاصد کے لیے خوب استعمال کیا۔ایوب خان کے خلاف چلنے والی تحریک نے سیاست دانوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ طالب علموں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے حامی طالب علموں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔انہیں مسلح بھی کیا گیا اور وافر فنڈز بھی ان کی تحویل میں دے دیئے گئے۔ یہ تنظیمیں تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پھیل گئیں، یہاں

تک کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور کالجوں کے پرنسپل بھی ان کے سامنے بے بس ہو گئے۔ وہ کوئی فیصلہ بھی ایسی تنظیموں کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ اب یہ تنظیمیں مجرموں کی سر پرستی کرنے لگی ہیں اور انہوں نے اپنے اپنے مافیا سنڈیکیٹ قائم کر لئے ہیں۔ ان میں کبھی کبھی مسلح جھڑپیں بھی ہو جاتی ہیں۔ جنوری 1990ء اور اگست 1991ء کے دوران ایسی 580 وارداتیں ہوئیں جن میں طالب علم ملوث تھے۔ ان وارداتوں میں صرف پنجاب میں 73 لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ہماری تعلیم کی حالت زار کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ طالب علموں کا دھیان بجائے تعلیم کے ایسے راستے تلاش کرنے کی طرف ہو گیا ہے جن پر چل کر ان تنظیموں کے بل بوتے پر وہ اعلیٰ مقامات تک پہنچ جائیں۔ کئی سیاسی پارٹیوں میں ایسے طالب علم لیڈر شامل ہیں جن کے خلاف قتل کے کئی مقدمات درج ہوئے لیکن ان کی سیاسی حیثیت کی بنا پر انتظامیہ ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکی۔

منشیات کی تجارت

ویت نام کی جنگ سے پہلے برما، لاؤس اور تھائی لینڈ اس منحوس تجارت کے لئے بدنام تھے۔ اس علاقے کو گولڈن ٹرائی اینگل (golden triangle) یعنی طلائی تثلیث کہا جاتا تھا۔ منشیات یہاں سے برآمد ہو کر ایشیا کے خشکی کے راستوں سے ہوتی ہوئی یورپ اور پھر امریکہ پہنچتی تھیں۔ ویت نام کی جنگ کے بعد یہ تجارت پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پھیل گئی۔ جب افغانستان کی جنگ چھڑی تو منشیات کی کاشت کے ذریعے حاصل ہونے والے منافع سے اسلحہ خریدا جاتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس تجارت کو منظم کرنے اور اس کی ہمت افزائی کرنے میں امریکہ کی خفیہ ایجنسی نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان دنیا بھر میں منشیات کی تجارت کا بہت بڑا مرکز بن گیا اور اس میں پاکستان کے سیاست دان اور سرمایہ دار بھی ملوث ہو گئے۔ عمائدین حکومت بھی پیچھے نہ رہے اور انہوں نے بھی خوب ہاتھ رنگے۔ پاکستان میں اس وقت کم از کم پندرہ لاکھ انسان نشے کی لت میں مبتلا ہیں۔

افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ اس تجارت میں پولیس کے کئی گزٹیڈ افسر بھی شامل ہیں۔

ہتھوڑا گروپ قتل

صوبہ پنجاب اور سرحد میں اچانک قتل کی وارداتوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس میں ہتھوڑے کو بطور آلہ قتل استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسی وارداتوں میں خاندانوں کے خاندان جن سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ مقتول نہ امیر تھے نہ ہی ان کی کوئی سیاسی وابستگیاں تھیں۔ نہ ہی یہ ہیروئن کی تجارت میں ملوث تھے اور نہ ہی ان کا تعلق کسی خاص مذہبی فرقے سے تھا۔ پولیس آج تک ان کے محرکات کا فیصلہ نہیں کر سکی اور نہ ہی یہ معلوم کر سکی کہ ان کے پیچھے قاتلوں کے مقاصد کیا تھے پرانی دشمنی، یا کوئی اور مقصد۔ یہ وارداتیں جیسے اچانک شروع ہوئی تھیں ویسے ہی بند ہو گئیں۔ ہماری پولیس کے کارناموں میں یہ بھی شامل کرنا چاہیے کہ ان وارداتوں کا کوئی مجرم آج تک پکڑا نہیں گیا۔

کاروا کاری

قتل کی یہ وارداتیں جو کارا (یا کارو) کاری کہلاتی ہیں، صرف پاکستان سے مخصوص ہیں۔ جنوبی پنجاب کے کچھ قبائل اور چند دیگر قبائل میں یہ رواج ہے کہ جب کسی بالغ لڑکی اور لڑکے کے درمیان ناجائز تعلقات کا پتا چل جائے تو لڑکے کو اس کے خاندان والے اور لڑکی کو اس کے خاندان والے خاموشی سے قتل کر دیتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ ایسی وارداتوں کا پولیس کو بھی علم نہیں ہوتا اور متعلقہ قبیلے کے سارے لوگ اس معاملے میں بالکل خاموش رہتے ہیں۔ یہ ازمنہ وسطیٰ کا کوئی رواج تھا جو ہمارے ہاں آج بھی جاری ہے۔

نسلی تعصّبات

پاکستان کے جرائم کے منظرنامے میں نسلی تعصّبات کو بڑا دخل ہے۔ مختلف صوبوں میں چھوٹی چھوٹی نسلی تحریکیں اپنی حیثیت منوانے پر اصرار کرتی ہیں۔ ان کے ارکان اور پیروکار زیادہ نہیں ہیں لیکن جو ہیں وہ متشددانہ مزاج رکھتے ہیں۔ متواتر ناکامیوں کے بعد وہ تشدد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

کراچی پاکستان کا صنعتی اور تجارتی مرکز ہے۔ ضیاء الحق کے مارشل لا سے پہلے یہ بہت پرامن شہر تھا۔ یہاں پر پیپلز پارٹی کی بالادستی تھی جو ضیاء الحق کو کھٹکتی تھی۔ وہ اس سیاسی پارٹی کی مقبولیت سے خائف تھا اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے طریقے سوچا کرتا تھا۔ اس پارٹی کے توڑ کے لئے اس نے کراچی میں رہنے والے مہاجروں کو مہرہ بنایا اور مہاجر قومی موومنٹ کی بنیاد رکھی۔

MashalBooks.org

پھر اسے جدید ترین اسلحے سے لیس کیا اور دامے درمے ہر طرح سے اس تحریک کو مضبوط کرتا رہا۔ چنانچہ جلد ہی اس تحریک نے سندھ کے دوسرے بڑے شہر حیدرآباد میں بھی اپنے پنجے گاڑ دیے۔ آخر میں اپنی سیاسی حیثیت سے تجاوز کر کے یہ ایک تشدد پسند گروہ بن گیا۔ کراچی میں اپنے علاقوں کی انہوں نے مورچہ بندی کی اور پھر قتل لوٹ مار اور جگا ٹیکس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے اپنا مزاج آمرانہ بنا لیا۔ ضیاء الحق کی موت کے بعد یہ اپنے سب سے بڑے سرپرست سے محروم ہو گئی تو فوج نے اس کے خلاف اقدامات شروع کر دیئے۔ تب یہ معلوم ہوا کہ اس تحریک نے اپنے عقوبت خانے بنا رکھے ہیں جہاں مخالفوں کو اغوا کر کے لاتے تھے اور پھر ان پر بے رحمانہ تشدد کرتے تھے۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر وہاں کئی گروہ پیدا ہو گئے جنہوں نے تشدد کی کاروائیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے امیر آدمیوں اور صنعت کاروں سے جگا ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا۔ جو شخص یہ ٹیکس نہیں دیتا تھا تو اسے یا اس کے کسی رشتے دار یا بہو بیٹی کو اغوا کر لیا جاتا تھا۔ ان وارداتوں سے کراچی کی شرح جرائم میں زبردست اضافہ ہوا۔ ہر چار گھنٹے کے بعد ایک قتل اور ہر تین گھنٹے کے بعد ایک قاتلانہ حملے کی واردات ہونے لگی۔ ہر روز ایک ڈکیتی اور لوٹ مار کی پانچ وارداتیں ہوتی تھی۔ جگا ٹیکس ان وارداتوں کے علاوہ تھا۔

اس تحریک میں سرزد ہونے والے جرائم بھی پاکستان سے مخصوص ہیں۔

فرقہ پرستی

مذہبی فرقے بھی پرتشدد جرائم کے ذمہ دار ہیں۔ بات کچھ یوں ہے کہ دینی مدرسوں میں تین سو سال قبل تیار ہونے والے نصاب سے فارغ التحصیل ہونے والے فرقے آزادی سے پہلے سیاست کی سمجھ بوجھ سے عاری تھے۔ انہوں نے قیام پاکستان کی بھرپور مخالفت کی۔ احراری تو کانگرس کا دست و بازو تھے۔ دیوبندی فرقہ بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ وہ پاکستان کا یہاں تک مخالف تھا کہ جب سلہٹ میں ریفرنڈم ہوا تو دیوبند کے مہتمم مولانا حسین احمد مدنی پاکستان کی مخالفت کے لئے بہ نفس نفیس وہاں پہنچے اور پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔ آزادی کے بعد انڈین نیشنل کانگرس کو مولویوں کی ضرورت نہ رہی اور انہوں نے ان مذہبی جماعتوں سے اپنا دامن چھڑا لیا کیونکہ کانگریس سیکولرازم کی دعوے دار تھی۔

اب ان جماعتوں کے لئے سوائے پاکستان ہجرت کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ

MashalBooks.org

یہ فرقے یہاں چلے آئے۔ پاکستان بن چکا تھا۔لہٰذا ان کی سیاست دھری کی دھری رہ گئی۔لیکن بقول اقبال ''دین ملافی سبیل اللہ فساد'' یہ لوگ فارغ بیٹھنے والے نہیں تھے۔ ان کے لئے فرقہ بازی پیٹ کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ یہاں آتے ہی احراریوں نے قادیانیوں کے خلاف محاذ قائم کرلیا۔ ان کی تقاریر سے متاثر ہوکر کچھ لوگوں نے قادیانیوں کو قتل بھی کیا اور ان کی مسجدوں کو نذر آتش کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ چنانچہ 1954ء میں پنجاب میں فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی۔ کئی لوگ قتل ہوئے، کئیوں کے گھر جلائے گئے، انتظامیہ بے بس ہوگئی اور لاہور میں پاکستان کا پہلا مارشل لا نافذ ہوا۔ یہ سب کوائف منیر کمشن رپورٹ میں موجود ہیں اور وہاں سے ان کی تصدیق ہوسکتی ہے۔

مارشل لا کے بعد قدرے خاموشی رہی پھر 1969ء میں جب ایوب خان کے خلاف تحریک چلی تو ان فرقوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بھٹو نے ان جماعتوں کو خوش کرنے کے لئے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔ اب ان فرقوں کے لئے سیاست میں داخل ہونے کے راستے کھل گئے۔ جب بھٹو کے خلاف تحریک چلی تو اسے نظام مصطفیٰ کے نام پر مذہبی رنگ دے دیا گیا اور قرون اولے والے اسلام کے نفاذ کا مطالبہ شروع ہوگیا۔ بھٹو نے ان کو پھر خوش کرنے کی کوشش کی اور اتوار کی چھٹی ختم کرکے جمعہ کی چھٹی کا اعلان کردیا۔ گھڑ دوڑ اور شراب پر پابندی عائد ہوئی لیکن بھٹو اپنے آپ کو ان جنونیوں سے بچا نہ سکا۔

ضیاء الحق کا مارشل لا آیا۔ اس نے بھی بھٹو کے راستے کو اپنایا اور مذہبی جماعتوں کو خوش رکھنے کی بھرپور کوششیں کی۔ مجلس شوریٰ میں ان کو نمائندگی ملی، زکوٰۃ اور عشر کا قانون نافذ ہوا۔ توہین رسالت کا قانون پاس ہوا۔ بیت المال کا قیام وجود میں آیا لیکن نفاذ اسلام کا مطالبہ اپنی جگہ پھر بھی قائم رہا۔

چنانچہ 1994 میں مالاکنڈ ڈویژن میں اس مطالبے کو عملی شکل دی گئی۔ ضلع کی انتظامیہ اور ایک نیشنل اسمبلی اور ایک صوبائی اسمبلی کے رکن کو یرغمال بنایا گیا۔ صوبائی اسمبلی کے دوسرے رکن کو مزاحمت کرنے پر موقعے پر ہی قتل کردیا گیا۔ آمدورفت کے تمام راستے بند کردیئے گئے۔ پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دوسرے ادارے بے بس ہوگئے۔ یہ سب کارروائی ایک مذہبی لیڈر مولانا صوفی محمد کے زیرنگرانی عمل میں آئی۔ وہ اسلامی شریعت کے نفاذ کے نام پر یہ فتنہ

پردازی کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس شورش میں چالیس اشخاص قتل ہوئے اور اس سے کہیں زیادہ زخمی ہوئے۔ چنانچہ صوبائی حکومت نے ہتھیار ڈال دیے اور مالاکنڈ ڈویژن میں ''اسلامی شریعت'' کا نفاذ ہوگیا۔ اس بات سے مولانا مذکور کی تشفی نہ ہوئی اور اگلے سال کے شروع میں اس نے پھر شورش برپا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ گرفتار کرلیا گیا اور شورش یا بغاوت کچل دی گئی۔

قادیانیوں کو کافر قرار دینے کے بعد ان جماعتوں نے شیعہ فرقے کے خلاف بھی محاذ آرائی شروع کردی۔ جب زکوٰۃ کا قانون پاس ہوا تو شیعہ لوگوں نے اسے ماننے سے انکار کردیا اور فقہ جعفریہ کے نفاذ پر اصرار شروع کیا یا اس میں پناہ تلاش کی۔ جلد ہی ایک نئی جماعت ''سپاہ صحابہ'' وجود میں آئی جس نے شیعوں کے خلاف تشدد آمیز کارروائیاں شروع کردیں۔ ایک واردات میں تو 32 آدمیوں کو حالت نماز میں ختم کردیا گیا۔ پھر مومن پورہ کا واقعہ پیش آیا جس میں پانچ افراد قتل ہوئے اور کئی زخمی ہوئے۔ شیعہ لوگوں نے ''سپاہ محمدؐ'' قائم کی اور وہ بھی غیر قانونی کارروائیوں میں سرگرم ہوگئے۔

یہ سب وارداتیں صرف پاکستان سے مخصوص ہیں، کسی اور ملک میں ان کی مثالیں نہیں ملتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

MashalBooks.org

مزید مباحث:

متضاد نظریات

سزائیں:

نئے تصورات

انسداد:

نئے طریقے

MashalBooks.org

ابتدائیہ

سب سے زیادہ جرائم صنعتی معاشروں میں ہوتے ہیں۔ امریکہ دنیا کا امیر ترین ملک ہے لیکن وہاں جرائم کی شرح سب ممالک سے بلند ہے۔ ''اس ملک میں ہر دس سیکنڈ کے بعد ایک جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد ایک قتل اور ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک زنا بالجبر۔ پچھلے 16 سال میں قتل کی شرح میں تین گنا اضافہ ہوا ہے۔ ہر منٹ کے بعد ایک کار چوری ہوتی ہے اور ہر پانچویں سیکنڈ کے بعد ایک چوری کی واردات ہوتی ہے۔ یہ اعداد وشمار 1965ء کے ہیں۔''

اس بظاہر بلند شرح کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ صنعتی ممالک میں حکومت کی اور پھر ماہرین کی سطح پر جرائم کے اعداد وشمار بڑی باقاعدگی سے اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ انہیں شائع بھی کیا جاتا ہے۔ پس ماندہ یا ترقی پذیر ممالک میں ایسا کوئی انتظام نہیں۔ پاکستان میں شماریات کے اداروں میں اول تو جرائم کی شماریات درج کرنے کا خاطر خواہ نظام ہے ہی نہیں اور اگر کسی صوبائی یا مرکزی ادارے میں کچھ اعداد وشمار مل جاتے ہیں تو وہ ایف آئی آر کے ملزموں اور مجرموں کے بارے میں ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ہاں یا دوسرے ترقی پذیر ممالک میں جرائم کی شرح کیا ہے۔

دوئم، جرائم پر تحقیق کرنے والے ہمارے ہاں ماہرین بھی نہیں ہیں جو اپنے طور پر جرائم کے متعلق اعداد وشمار اکٹھے کریں اور پھر ان کا تجزیہ کرکے بتائیں کہ ہمارے ہاں جرائم کی شرح کیا ہے۔ یہ کام ہے بھی بڑا مہنگا اور صرف ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔

اس وقت کے پیش نظر جہاں کسی نظریے کے حق میں یا اس کے خلاف اعداد وشمار کی ضرورت پیش آتی ہے وہاں امریکہ کی شماریات پر ہی بھروسہ کیا گیا ہے۔ اکثر و بیشتر نظریات وہیں وضع ہوتے ہیں جہاں جرائم کو ایک قومی مسئلہ تسلیم کرلیا گیا ہے۔ ہم ابھی اس منزل پر نہیں پہنچے اور آنکھیں بند کرکے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہمارے ہاں جرائم کی شرح بہت کم ہے۔

جرائم کی وجوہات

معاشرتی عدم مساوات اور غربت

ایلیٹ کری(Elliot Curie) ماہر عمرانیات ہیں۔انہوں نے جرائم پر کئی مقالات اور ایک کتاب:

(Confronting Crime an American Challenge) تصنیف کی ہے۔ درج ذیل خیالات میں وہ اقتصادی اور معاشرتی رجحانات کو زیرِ بحث لائے ہیں جو صنعتی طور پر ترقی یافتہ معاشروں میں جرائم کے محرکات ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ بدقسمتی سے آج بھی مجرمانہ تشدد میں دنیا کے صنعتی معاشرے سرفہرست ہیں۔اگر ہم موجود معاشرتی حکمت عملی میں انقلابی تبدیلیاں نہ لائیں تو نہ صرف یہ ناقابلِ رشک رجحانات جاری رہیں گے بلکہ یہ مزید سنگین اور مہیب ہوجائیں گے اور صنعتی طور پر ذاتی یافتہ معاشروں کی طرزِ زندگی پر دوررس نتائج مرتب کریں گے۔

سائنس تیقن سے مستقبل کے متعلق کوئی بھی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے پاس اگرچہ مستقبل میں جھانک کر دیکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں تاہم ہمیں کئی ایسے رجحانات ضرور نظر آتے ہیں جو تشدد یا معاشرتی امن، معاشرتی بیگانگی یا لاتعلقی، باہمی تعاون اور پیداواری مواقع پر بڑے گہرے طریقے سے اثرانداز ہوسکتے ہیں۔ان رجحانات میں کام کی نوعیت اور اس کی تقسیم، ان ممالک میں خاندانوں پر معاشرتی دباؤ، اور امریکی آبادی کے اجزائے ترکیبی انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، حبشی، ہسپانوی، یہودی وغیرہ میں اقتصادی مواقع اور مساوات شامل ہیں۔

بڑھتی ہوئی عدم مساوات

MashalBooks.org

کری کے خیال میں اپنے تمام معیاروں کے ساتھ صنعتی معاشرے متواتر زیادہ سے زیادہ عدم مساوات کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ مربوط کوششوں سے ان کے پس پشت کارفرما عوامل کو روکے بغیر عدم مساوات کے رجحانات مستقبل میں بھی جاری رہیں گے اور یہ بڑھتی ہوئی عدم مساوات صنعتی معاشروں میں منفی رجحانات مرتب کرے گی۔ بیماریوں اور بچوں کی شرح اموات میں اضافہ ہوگا۔ بے گھر بے در ہونے کا رجحان بڑھے گا اور خاندانی استحکام کے لئے خطرات میں اضافہ ہوگا۔ ان سب عوامل کے نتیجے میں جرائم اور تشدد میں اضافہ ہوگا۔

اس نقطہ نظر کے مطابق عدم مساوات اور اس کا جزو لاینفک تلخ اقتصادی محرومی ان اداروں کو کمزور کر دیتے ہیں جو افراد کی صحت مند ترقی اور نشو ونما کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ غریب خاندانوں پر زبردست دباؤ ڈالتے ہیں جن کی بنا پر بچوں کی پرورش سے غفلت، گھریلو جھگڑے اور بچوں سے بدسلوکی جنم لیتی ہے۔ اسی سے شراب خوری کی لت، منشیات اور ناکامی حفظان صحت کے خطرات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ سب مل کر بچوں اور نوجوانوں میں مجرمانہ رجحانات کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ غربت اور معاشی عدم مساوات سے اعلیٰ تعلیم و تربیت کے مواقع محدود ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر نابالغی کے دوران حاملہ ہونے اور ناجائز یعنی ان چاہے بچوں کے پیدا ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے اور یوں آنے والی نسلوں کی غربت کی شدت اور ناکافی تربیت یافتہ والدین کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ کری امریکہ کی مثال دیتے ہیں جہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ میں وفاقی حکومت نے تقسیم دولت کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے شروع کئے تھے۔ اس کے بعد پچھلے کئی برسوں میں ان کے مقابلے میں یہ معاشی عدم مساوات اور بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ رجحان اور بھی مہیب ہو گیا ہے۔ یہ امر اس لئے بھی تشویش ناک ہے کہ اس کا شدید اثر ان جوڑوں پر پڑتا ہے جن کی حال ہی شادیاں ہوئی ہوں۔ کانگریس کی جوائنٹ اکنامک کمیٹی کے حالیہ جائزہ سے پتا چلتا ہے کہ 1972 اور 1981 کے درمیان چھوٹے بچوں پر مشتمل کم آمدنی والے خاندانوں کی آمدنی میں 25 فیصد کمی ہوئی ہے۔

اس رجحان کا ایک ڈرامائی اظہار امریکی بچوں کی بڑھتی ہوئی غربت میں نظر آتا ہے۔ صرف 1978ء سے خط غربت (Poverty Line) کے نیچے اٹھارہ سالہ بچوں میں 26 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ چھ سال کے ہر چار امریکی بچوں میں سے ایک غریب ہے۔ اگر یہ ہسپانوی گروہ

ہوں تو پانچ میں سے دو اور اگر دو کالے لوگ ہوں تو ان میں سے آدھے بچے غریب ہوں گے۔ ان میں سے کئی بچوں کے متعلق خصوصاً جب وہ ہسپانوی یا کالے ہوں، اس بات کا سخت اندیشہ ہے کہ وہ اپنے بچپن کے دوران غریب ہی رہیں گے اور شاید اپنی بلوغت کے دوران بھی وہ غریب ہی رہیں۔ ان خاندانوں کے لئے جنہیں اس کا تجربہ ہے، غربت ایک عارضی حالت ہے۔ لیکن ایک کالے کے لئے جو غریب خاندان میں پیدا ہوا ہو، یہ اندیشہ ہے کہ وہ اوسطاً دس سال تک نادار ہی رہے گا۔ بڑھتی ہوئی امریکی غربت میں پلنے والے بچے اس صدی کے اختتام تک غریب ہی رہیں گے اور انیس سال کی عمر تک اور بلوغت کے دوران وہ بڑے بڑے جرائم کے مرتکب ہوں گے۔

کری کے تجزیے کے مطابق امریکہ میں ان رجحانات کے پیچھے کئی پیچیدہ اور باہم مربوط عوامل سرگرم عمل ہیں۔

ان میں سے ایک 1980ء میں امریکہ کی شدید بے روزگاری ہے جس نے نوعمر اور قلیل آمدنی والے خاندانوں کو سخت متاثر کیا ہے۔ یہ مجموعی اقتصادیات کی متدائر انقلابات کا نتیجہ ہے۔ زیادہ تشویش ناک یہ امر ہے کہ 1970 کی اقتصادی بدحالی نے اپنے سے پہلے کے اقتصادی مندے کے مقابلے میں زیادہ بے روزگاری پیدا کی ہے۔ یہ امر ان خاندانوں کے بڑھتے ہوئے تناسب کی توجیہ کرتا ہے جن کا انحصار سرکاری امداد پر ہے تاکہ وہ خط غربت کے اوپر یا اس کے قریب رہ سکیں۔ ایسے خاندانوں کی تعداد میں، جنہیں اقتصادیات میں ''پری ٹرانسفر'' (Pre-transfer) کہا جاتا ہے، 1970 کے آغاز سے بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔

اس نقطہ نظر کے مطابق ماہرین کو یقین ہے کہ اگر بڑے اور فوری اقدامات نہ کئے گئے تو آج کے مقابلے میں سنہ 2000 میں صنعتی طور پر ترقی یافتہ معاشرے خصوصاً امریکہ، مکمل طور پر جرائم پیشہ معاشرے بن جائیں گے۔

دوسرا نظریہ

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جرائم کی وجہ افلاس نہیں ہے بلکہ جرائم از خود افلاس پیدا کرتے ہیں۔

جیمز کے۔ سٹیورٹ جو امریکہ کی نیشنل انسٹیٹیوٹ آف جسٹس کے ڈائریکٹر ہیں، اس سے مختلف نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ غربت یا افلاس جرائم کے محرکات نہیں ہیں بلکہ جرائم سے غربت پیدا ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مجرم ہی شہری لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ چونکہ مجرم شہریوں کے گھروں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں اس لئے اس کا ایک لازمی اور بلاواسطہ نتیجہ یہ ہے کہ کاروباری لوگ جرائم والے علاقے چھوڑ جاتے ہیں۔ اس طرح ایسے علاقوں میں بے روزگاری کو بڑھاوا ملتا ہے اور اس کے نتیجے میں ان علاقے میں معاشرتی پس ماندگی در آتی ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ غربت کے خلاف جہاد کا آغاز جرائم کے خلاف مہم چلانے سے ہونا چاہئے۔

یہ خیال کہ افلاس سے جرائم میں اضافہ ہوتا ہے، ارسطو کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ ارسطو نے کہا تھا کہ غربت انقلابات اور جرائم کی ماں ہے۔ لیکن اب دیکھنے میں آ رہا ہے کہ موجودہ شہروں میں معاملات اس نظریے کے عین برعکس ہیں۔ جرائم کی وجہ افلاس نہیں بلکہ جرائم خود افلاس پیدا کرتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو جرائم غربت سے بچنے کے راستے میں حایل ضرور ہوتے ہیں۔ غریب لوگوں کی اکثریت ایماندار شہری ہے۔ وہ قانون کا احترام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی معاشی ترقی کے راستے میں منشیات فروش، لٹیرے، چور، زنا بالجبر کے مرتکب لوگ اور قاتل حامل ہوتے ہیں جو اپنے ہمسایوں پر دہشت گردی کرتے ہیں۔ یہ لوگ رابن ہڈ جیسے ڈاکو نہیں بلکہ ان کا پیشہ ہی جرم کرنا ہے۔ وہ غریب لوگوں کی محنت اور اُمیدوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ وہ اتنے ہی قابل نفرت ہیں جتنی کہ کوئی آمرانہ حکومت ہوسکتی ہے۔

جرائم پیشہ لوگوں کا بڑا واضح طریق واردات غریبوں کی املاک چھین لینا اور اگر ضرورت محسوس ہو تو انہیں قتل بھی کر دیتا ہے۔ امریکہ کی بیورو آف جسٹس کے ایک تخمینے کے مطابق 1984 میں 75000 ڈالر یا اس سے کم آمدنی والے گھروں کے 6ء9 فیصد گھروں میں نقب زنی کی واردات ہوئی۔ نقب کی یہ سب سے بلند شرح ہے۔ 25,000 سے 30,000 ہزار ڈالر آمدنی والے گھروں میں نقب زنی کی واردات کی شرح اس سے دوگنی ہے۔ پرتشدد جرائم کی زد میں سب سے زیادہ غریب لوگ ہی آتے ہیں۔ 75,000 سے 14,0000 ڈالر کی سالانہ آمدنی والے لوگ جرائم سے سب سے زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ ان جرائم میں لوٹ مار، مجرمانہ حملے اور چوری شامل ہیں۔ غریب آدمی بیمہ نہیں کرا سکتے چنانچہ ان کے لئے ٹی وی، فرنیچر یا کار کی چوری اکثر تباہ

MashalBooks.org

کن ہوتی ہے۔ مکان کے کرائے اور فلاح و بہبود کے چیکوں یا نقدی کی چوری، خوراک یا مستقبل کو ایک ہی وار میں تباہ کر دیتے ہیں۔ ایک مثالی مجرم جرم کا ارتکاب اس لئے نہیں کرتا کہ امیروں کو لوٹ کر ان کی دولت سے غریبوں کی مدد کی جائے۔ وہ صرف اپنی ذات کے لئے غریبوں کو لوٹتا ہے۔

جرائم کی بلا واسطہ قیمت

جرائم کی بلاواسطہ قیمت ان نقصانات سے کہیں زیادہ ہے۔ جرائم پیشہ لوگ ان روایتی راستوں کو جن سے غریب لوگ اپنی مالی حالت سدھار سکتے ہیں اوور ٹائم کرنا، جز وقتی کام یا مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے تعلیم حاصل کرنا مسدود کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ بسوں کے سنسان اڈوں پر انتظار کرنے اور اوباش نوجوانوں کے ہاتھوں لٹنے کے خوف سے مقررہ وقت کے بعد کام کرنا یا رات کے سکولوں میں تعلیم پانا چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر مقررہ اوقات کے بعد کسی سکریٹری کو اوور ٹائم کرنے کو کہا جائے تو وہ انکار کر دیتی ہے کیونکہ اسے خطرہ ہوتا ہے کہ ٹیکسی سے اترنے کے بعد اور گھر کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے لوٹ لیا جائے گا۔ بیوی بچوں کو اکیلا چھوڑنے کے خوف سے ایک استاد رات کے سکول میں بڑھانے سے انکار کر دیتا ہے۔

جرائم کی وجہ سے اندرون شہر کے علاقوں میں زمین کی قیمت گر جاتی ہے اور وہاں رہنے والوں کے لئے سرمایہ حاصل کرنا یا قرض لے کر کاروبار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے خاندانوں کے لئے عذاب ہے جو بچت کے ذریعے سرمایہ اکٹھا کرنا چاہتے ہوں۔ ایسے خاندانوں کے حالات صرف وہاں سے نقل مکانی کے بعد ہی بہتر ہو سکتے ہیں۔

بالکل اسی طرح انتہائی دلکش رہائشی منصوبوں کو بھی جرائم تباہ کر دیتے ہیں اور ان میں رہنے والوں کے لئے ان گھروں کو تباہ کن بنا دیتے ہیں۔ بالوں کی طرح کے لمبے راستے، سنسان ایلیویٹر اور زینے، راستوں پر روشنی کی غیر موجودگی اور بلند و بالا گھر معصوم لوگوں کو مجرموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ عمارتیں جو سابقہ عمارتوں پر تعمیر ہوتی ہیں، کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔

اس نظریے کی تائید سٹنٹن ای سیمینو و (Stanton E.Semenom) مصنف ''ان سائیڈ دی کریمنل مائنڈ'' (Inside the criminal Mind) 1974ء، میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''بری ہمسائیگی، والدین کی ناکافی توجہ، ٹیلی ویژن، سکول منشیات اور بیروزگاری جرائم کی وجہ نہیں ہیں۔ جرائم کی اصل وجہ خود مجرم ہیں۔ جرم سماجی حالات سے نہیں بلکہ انسان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم اس سادہ سی حقیقت کو پہچان لیں تو جرائم کے خاتمے کے موجودہ طریقوں سے کہیں بہتر اور انقلابی طریقے اپنا سکتے ہیں۔ ہم اپنے ناقابل برداشت سماجی حالات کو بہتر بنانے میں ضرور لگے رہیں کیونکہ یہ بذات خود بامصرف کام ہے لیکن ایسی تبدیلیوں سے جرائم پیشہ لوگوں میں تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی۔''

جرائم اور کاروبار

جرائم اندرون شہر یا شہر کے باہر تجارت اور صنعت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ یوں غریب لوگوں کے لئے ملازمت کا حصول سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ جہاں لوگوں پر خوف طاری ہو وہاں تجارت آزادی سے نہیں ہوسکتی۔ غریب آبادیوں میں جرائم کی بلند شرح وہاں کے رہنے والوں کے لئے کسی قسم کی تجارت پر مبنی اقتصادیات میں ملازمتوں کا حصول ناممکن بنا دیتی ہے۔ اندرون شہر علاقوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور وہاں کئی اقتصادی پہلوؤں کے لئے ان کا باعث کشش ہونا ضروری ہے۔ بیشتر غریب علاقے شہروں کے مراکز میں یا ان کے قریب ہوتے ہیں۔ صنعت و تجارت کے لئے یہ بہترین مقامات ہیں۔ یہاں ریلوے سٹیشن، سڑکیں، پانی اور بجلی موجود ہوتے ہیں۔ یہاں کارکن بھی باآسانی سے مل جاتے ہیں۔ یہاں وہ ساری بنیادی سہولتیں موجود ہوتی ہیں جو مضافات میں اکثر غائب ہوتی ہیں۔

ان علاقوں کی اقتصادی ترقی کی راہ میں جرائم سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اور سرمایہ کاری کرنے والے اس رکاوٹ کو عبور نہیں سکتے۔ بھاری ٹیکسوں اور مزدوری کی بلند شرح کے مقابلے میں جرائم کا خوف سرمایہ کاروں کے فیصلوں کو زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ ہم پاکستانی اس تجربے سے حال ہی میں گزر رہے ہیں۔ امریکی اور عرب سرمایہ کاری اس لئے کھٹائی میں پڑ گئی ہے کہ پچھلے چھ برسوں میں پاکستان میں سرمایہ کاری کے لئے امن وامان کی صورت حال انتہائی ناتسلی بخش ہے۔ کاروبار کو محدود کرنے یا بند کرنے کی سب سے بڑی وجہ جرائم ہیں۔

جرائم پیشہ لوگوں کو سزا کا خوف نہیں ہوتا اس لئے وہ غریبوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ پولیس

MashalBooks.org

تھانوں میں صرف دس فیصد جرائم کی اطلاع دی جاتی ہے اور ان کے متعلق مقدمات درج کئے جاتے ہیں۔ درج شدہ مقدمات میں سے صرف 20 فیصد جرائم کا سراغ ملتا ہے۔ باقی عدم پتا ہو کر داخل دفتر ہو جاتے ہیں۔ لوگ پولیس پر بھروسہ نہیں کرتے۔ نہ ہی لوگوں کو مال مسروقہ کی بازیابی کا یقین ہوتا ہے اور نہ ہی مجرم کیفر کردار تک پہنچتا ہے۔ برآمدگی پر مال پولیس کی ''تحویل'' میں بطور ''وجہ ثبوت'' چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد مالک یا مدعی کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس کا مال کہاں چلا گیا۔ اسے یا اطلاع دہندہ کو صرف خواری ہی ملتی ہے۔

امریکہ ہی کی ایک اور مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ وہاں کے اعداد و شمار کے مطابق 75000 ڈالر آمدنی والے گھروں میں نقب زنی کی وارداتوں کا صرف بیس فی صد اور دوسرے جرائم کی صرف ایک تہائی کی اطلاع پولیس کو دی جاتی ہے۔ غریب علاقوں کے لوگ کسی کو پولیس کے حوالے کرنے، پولیس کو بلانے یا عدالت میں شہادت دینے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی یہ خاموشی قابلِ فہم ہے۔ متعلقہ عدالتیں مشتبہ لوگوں کو جلد ہی ضمانت پر چھوڑ دیتی ہیں۔ مہینوں تک عدالتوں میں کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ ضمانت پر آئے ہوئے ملزم مدعیوں اور گواہوں کو ڈراتے دھمکاتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں یہ طریقہ کار ایک معمول بن چکا ہے۔ قتل کے مقدموں میں ملزم یا ان کے مددگار گواہوں کو اکثر قتل کر دیتے ہیں۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق پاکستان میں اس وقت دس لاکھ مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں۔

اس پر یہ امر مستزاد ہے کہ شہریوں کو عدالتی نظام سے انصاف کی کوئی زیادہ توقع نہیں ہوتی۔ عدالتیں بیشتر ملزموں کو چھوڑ دیتی ہیں اور وہ دوبارہ ارتکاب جرم میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ امریکہ میں تشدد پر مبنی اور املاک کے خلاف جرائم کے صرف 20 فیصد ملزم سزایاب ہوتے ہیں اور جیل جاتے ہیں۔ ان میں سے بھی 70 فیصد کو آزمائشی رہائی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں ان کی نگرانی بھی نہیں کی جاتی۔ ایسے مجرم تین سال کے اندر ہی دوبارہ جرائم کے ارتکاب میں پھر پکڑے جاتے ہیں۔

غریب لوگوں میں نقل مکانی کی سکت نہیں ہوتی اس لئے وہ جرائم کی غارت گری کی ہمہ گیریت سے نجات نہیں پاسکتے۔ جہاں منشیات اور عصمت فروشی کا دھندا ہوتا ہو اور اس کے چلانے والوں کے لئے صرف یہی ایک ذریعہ آمدنی ہو، وہاں قانونی عمل دخل ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ

MashalBooks.org

مقامات متعلقہ جرائم کا گروہ بن جاتے ہیں۔ ان علاقوں میں مخصوص جرائم، جیسے راہ زنی، پرتشدد حملے، چوری، نقب زنی، منشیات کا استعمال اور فروخت، معیشت کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔

علاقے کی ابتری

نیویارک کے سٹیزن کرائم کمشن (Citizen Crime Commission) اور ریجنل پیس ایسوسی ایشن (Regional Peace Association) کی ایک مشترکہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ''شہروں کی عام شاہراہوں پر چلنے والے لوگوں کو کسی اجنبی کے اچانک حملے، بھکاری، نشئی یا شرابی سے مڈبھیڑ، جھگڑے باز لڑکوں، لفنگوں اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والے اشخاص سے خوف آتا ہے۔ موخرالذکر صورت، جسے ناشائستگی بھی کہا جاتا ہے، اتنی ہی خوفناک ہے جتنا کہ کوئی دوسرا سنگین جرم۔ گالیاں یا توہین آمیز زبان، منشیات کا دھندا، نوخیزوں کی آوارہ گردی، برسرعام شراب نوشی، یہ سب ممکنہ سنگین جرائم کے عنوانات ہیں۔

یہ درست ہے کہ وہ بھکاری جو ہمیشہ ایک ہی دکان کے سامنے کھڑا ہوتا ہے یا ایک ذہنی مریض جو لوگوں کو گالیاں دے کر اپنا غصہ نکالتا ہے یا نوجوان لڑکوں کا ایک گروہ جو گلی کی نکڑ پر کھڑا رہتا ہے، یہ سب کسی جرم کا منصوبہ نہیں بنا رہے ہوتے لیکن جب غیر قانونی رویہ زیادہ تیز ہو جاتا ہے تو ان لوگوں کے لئے سماج دشمن حرکات کے لئے کوئی روک نہیں رہتی۔ اس علاقے میں لوگ سیر کرتے، گھومنے پھرنے، کھانے پینے یا خرید وفروخت کرتے وقت خوف زدہ رہتے ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق امریکہ میں دوپہر کے کھانے کے وقفے کے دوران دفتروں میں کام کرنے والوں میں سے صرف 60 فیصد لوگ دفتروں سے باہر نکلتے ہیں۔ ان میں سے 24 فیصد کسی پارک سے گزرتے ہوئے گھبراتے ہیں، خواہ پارک میں سے گزرنے والا راستہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔

بچاؤ کی ایسی کوششیں لوگوں کو الگ تھلگ کر دیتی ہیں اور پبلک جگہوں کو ویران کر دیتی ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ غارت گری والے جرائم اور خوف کسی معاشرے کو کیسے اس حد تک نقصان پہنچاتا ہے کہ وہ نجی نقصانات سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔ جیمز ولسن (James Wilson) کا مشاہدہ ہے کہ:

''لوٹ مار کرنے والے، صرف افراد ہی کو نشانہ نہیں بناتے بلکہ کسی جماعت کی تشکیل میں

بھی رخنہ اندازی کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اسے روک دیتے ہیں۔ یہ ان رسمی اور غیر رسمی نازک رشتوں کو برباد کر دیتے ہیں جن سے ہم اپنے ہمسایوں سے منسلک ہوتے ہیں۔''

علاقے کی ابتری عموماً غیر محفوظ ہونے کے احساس اور خوف میں اضافے سے شروع ہوتی ہے۔ تجارت سست ہو جاتی ہے۔ لوگ کہیں اور جا کر سودا سلف خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔ دکانوں میں خطرے کے الارم فٹ ہو جاتے ہیں۔ کھڑکیوں میں سلاخیں لگ جاتی ہیں۔ کاروبار کو بند کرنے کے مقصد سے کاروبار کی فروخت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی کاروبار ایک ہاتھ سے نکل کر کسی دوسرے ہاتھ میں جانے لگتا ہے تو سامان فروخت کی کوالیٹی کم ہونے لگتی ہے۔ قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ عمارتیں خستہ سے خستہ تر ہونے لگتی ہیں۔ کئی لوگ عمارتوں کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ سڑکوں پر بے جا ضابطگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ سکولوں میں تعلیم کی حالت ابتر ہو جاتی ہے اور یوں اس علاقے کے تمام لوگ سماجی انحطاط اور معاشی بدحالی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

زمانہ حال میں پاکستان میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ سر شام کراچی، لاہور اور اسلام آباد کی سڑکیں اور گلیاں سنسان ہو جاتی ہیں۔ خرید و فروخت، کاروبار اور لین دین سب بند ہو جاتا ہے۔

ان خیالات کی تائید ولیم ٹکر (William Tucker) اپنے ایک مقالے میں کرتے ہیں جو ایک جریدے وجیلانتے (Vigilante) میں 1985ء میں شائع ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''غریبی از خود کسی جرم کا محرک نہیں بنتی۔ اپنی غربت کے متعلق مختلف لوگوں کا ردعمل مختلف ہوتا ہے۔ امریکی معاشرے میں کئی غریب سیاہ فام سخت محنت کرتے ہیں۔ وہ ایک ہی دن میں دو دو یا تین تین ملازمتیں کرتے ہیں۔''

عدم تحفظ اور تشدد ان کی محنت کو ناکام بنا دیتا ہے۔ جب ان محنتی سیاہ فام کارکنوں کو پورے معاشرے کی طرف سے تحفظ نہیں دیا جاتا تو اس امر کی کوئی اُمید باقی نہیں رہتی کہ ان کی عمدہ اور اعلیٰ ترین کوششیں ان کی جماعتوں کو زیادہ اقتصادی ترقی اور خوشحالی کی طرف لے جائیں گی۔''

جرائم غربت سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ غربت خود جرائم کی پیداوار ہے۔

جرائم کو ختم کرنے کا طریقہ

غربت کو مٹانے کے لئے جرائم کا خاتمہ ضروری ہے۔ مثال یہ ہے کہ زرد بخار صرف اس

MashalBooks.org

وقت ختم ہوا جب اس بخار میں مبتلا مریضوں سے توجہ ہٹ کر اس مچھر پر مرکوز ہوئی جس سے یہ بخار پھیلتا تھا۔ اس مچھر کے خاتمے سے یہ بیماری بھی ختم ہوگئی۔ اسی طرح اندرون شہر غربت کے مرض کے خاتمے اور شہر کی صحت کی بحالی کے لئے ضروری ہے کہ جرائم کے ان مچھروں کو ختم کیا جائے جو یہ بیماری پھیلاتے ہیں۔

امریکہ میں کئی تجربات کئے گئے ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ اقتصادی زبوں حالی کو روکا جاسکتا ہے۔ ایسا صرف جرائم کے خاتمے سے ہی ممکن ہوسکتا۔ نیویارک کے قریب مشرقی بروکلن میں چالیس بلاکوں والے محلے میں1970 کے اوایل میں200 کاروباری مراکز تھے۔ ان میں تین ہزار افراد کام کرتے تھے۔ لیکن یہ علاقہ روبہ انحطاط تھا اور1979 کے قریب ان کاروباری مراکز کی تعداد صرف 40 رہ گئی اور کارندوں کی تعداد گھٹ کر صرف1500 رہ گئی۔ کاروباری لوگوں نے اس انحطاط کی سب سے بڑی وجہ جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کو قرار دیا۔ لیکن1980 اور 1982 کے درمیان ایک انقلاب آ گیا۔ اس محلے کے 40 بلاکوں والی عمارت میں نقب زنی کی وارداتیں134 سے کم ہو کر صرف 12 رہ گئیں اور سڑکوں پر لوٹ مار کر وارداتیں208 سے کم ہو کر صرف 62 رہ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی کاروباری صحت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ پچیس نئ فرموں نے یہاں اپنے دفاتر قائم کئے۔ چالیس فرمیں ایسی بھی تھیں جو یہاں اپنے دفاتر قائم کرنے کا ارادہ کر رہی تھیں۔ اب وہاں60,000 مربعہ فٹ پر ایک نئ دفتری عمارت تعمیر ہو رہی ہے اور پہلی عمارتوں کی مرمت جاری ہے۔

یہ اور اس قسم کی دوسری تبدیلیوں کی وجہ نجی ترقی دینے والی ایک فرم کی کوشش ہے جس نے اس علاقے میں تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لی تھی۔ مشرقی نیویارک کی لوکل ڈویلپمنٹ کارپوریشن، نیویارک سٹی پبلک ڈویلپمنٹ کارپوریشن، پولیس اور فائر بریگیڈ کے اشتراک سے خالی عمارتوں کو گرادیا گیا اور باقی ماندہ عمارتوں کے اردگرد حفاظتی باڑیں قائم کی گئیں، نقب زنی سے بچنے کے لئے الارم لگائے گئے، تربیت یافتہ سیکیورٹی گارڈ علاقے میں گشت کرنے لگے اور رہائشی لوگوں اور گاہکوں کو محافظ فراہم کئے گئے۔ اس منصوبے کو چلانے کے لئے کاروباری لوگوں نے روپیہ اکٹھا کیا اور شہر میں سڑکوں کی مرمت اور روشنی کا انتظام کیا گیا۔

دوسری مثال بھی امریکہ ہی کی ہے۔ بیس برس قبل دنگے اور فسادات نے لاس اینجلز کے

MashalBooks.org

کچھ حصوں کو تباہ کر دیتا تھا۔ یہاں درمیانے درجے کے کاروبار کی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی تھی اور جرائم کی زیادتی کی وجہ سے مزید نئے کاروباری ادارے قائم نہیں ہو سکتے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ سرمایہ داران علاقوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے کیونکہ وہاں آمد و رفت بڑی کم تھی اور نقصانات کے خطرات زیادہ تھے۔ فسادات کے بعد یہاں تعمیر ہونے والی عمارت مارٹن لوتھر کنگ شاپنگ سنٹر تھا۔ یہ اس علاقے میں تعمیر ہوا جسے چارکول ایلی کہتے تھے کیونکہ یہ گلی فسادات کے دوران جل کر بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ یہاں پہلے سال کی فروخت 40 ملین ڈالر کے قریب تھی۔ دوسرے لفظوں میں کرائے پر اٹھائے ہوئے ہر مربع فٹ پر 350 ڈالر تھی۔ یہ اس مرکز کی سالانہ اوسط آمدنی سے تین گنا سے بھی زیادہ تھی۔ یہ عمارت شہر کے اس حصے میں تعمیر کی گئی تھی جہاں جرم و تشدد سب سے زیادہ تھا لیکن تعمیر کے بعد یہاں کوئی بڑی واردات نہیں ہوئی۔

ان دونوں مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر حفاظتی انتظامات کر لئے جائیں تو انتہائی معاندانہ ماحول میں بھی کاروبار جڑیں پکڑ سکتا ہے۔ جرائم اور ان کے مضر اثرات کو کم کرنے سے کئی پس ماندہ علاقے ترقی کر سکتے ہیں۔ جب کاروبار کسی ایک علاقے میں ترقی کرتا ہے تو ہمسایہ علاقوں میں بھی مزید ترقی کا باعث بنتا ہے۔ اس سے کسی علاقے میں یک جہتی اور اکٹھے رہنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

کسی بھی علاقے میں جرائم سب لوگوں کے لئے خطرہ ہیں لیکن غریب لوگوں کو یہ زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ متوسط اور اونچا طبقہ اپنے نجی وسائل اور اپنے علاقے کے وسائل کے ذریعے اپنے آپ کو جرائم کے خطرات سے محفوظ کر سکتا ہے۔ چنانچہ کسی غریب علاقے کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے پہلا قدم جرائم کا خاتمہ ہے۔ اس سے مراد ہے کہ انصاف کا کڑا انظام قائم کیا جائے اور جرائم سے غریبوں کو پورا پورا تحفظ دیا جائے۔ امریکہ اگرچہ دنیا میں دہشت گردی کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اسے اپنے گھر کی بھی خبر لینی چاہیے۔

MashalBooks.org

طرز زندگی......استحصال

ایک اور نقطہ نظر یہ ہے کہ صنعتی ترقی یافتہ ممالک خصوصاً امریکہ کی طرز زندگی جرائم پیدا کرتی ہے۔ یہ خیال ایک دانشور کیوں این رایٹ(Kevin N. Wright) کا ہے جو نیویارک میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

ان کے مطابق تمام صنعتی ممالک میں جرائم بہت ہیں لیکن امریکہ میں تشدد آمیز جرائم کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خودمختاری، مادی طرزِ زندگی اور اور بزرگوں سے بدظنی جو خاص طور پر امریکی کلچر کی اقدار ہیں، جرائم کی اتنی بلند شرح کی ذمہ دار ہیں۔ ان پر مستزاد خاندانی زندگی اور ہمسائیگی اور سماجی ضبط کی عدم موجودگی ہیں جوان اقدار سے مل کر ان ممالک میں جرائم کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں۔

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ استحصال صنعتی ممالک بالخصوص امریکی زندگی کا جزو لاینفک ہے، یہ دانشور امریکی زندگی سے کئی مثالیں پیش کرتے ہیں:

دباؤ یا جبر کے تحت نہ سماجی نظم وضبط قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے قائم رکھا جا سکتا ہے۔ دوستانہ میل جول سے ہی قانون کے احترام کا رویہ اپنایا جا سکتا ہے۔ اس وقت کا خیال کریں جب آپ کو کسی شخص پر اس حد تک غصہ آیا تھا کہ آپ اسے زدوکوب کرنا چاہتے تھے بلکہ اسے قتل کرنے پر بھی آمادہ تھے۔ ایسا کرنے سے آپ کو کس چیز نے روکا؟ آپ کے اندر کسی غیر مشخص قوت نے اپنے دشمن کو جسمانی گزند پہنچانے سے باز رکھا۔ شاید اس وقت آپ کو اس بات کا وہم وگمان بھی نہ ہو کہ اس کے قتل کے جرم میں آپ کو سزا بھی مل سکتی ہے۔

مجرمانہ طرزِ عمل کو مواخذہ یا سزا ہی بہترین طریقے سے روک سکتی ہے۔ اس کے برعکس تعلیم اور تہذیب کے ذریعے آپ میں یہ احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ دوسروں کو گزند پہنچانا یا زخمی کرنا

MashalBooks.org

معاشرے کے لئے نا قابلِ قبول ہے۔

استحصال اور صنعتی معاشرے

صنعتی معاشروں میں سماجی کنٹرول کا اظہار نہ صرف جرائم میں بلکہ وسیع تر استحصالی عمل سے ہوتا ہے۔ تمام استحصالی کاموں کو مجرمانہ فعل نہیں سمجھا جاتا لیکن تمام مجرمانہ افعال استحصال ہی کی صورت ہیں۔ جہاں شخصی استحصال عام ہے وہاں اس کی وجوہات اور کنٹرول کے طریقوں پر غور کیا جائے تو استحصال کی مجرمانہ اور غیر مجرمانہ انواع میں تفریق اہم نہیں ہے۔ مجرمانہ افعال اور استحصال اس لئے واقع ہوتے ہیں کہ کلچر انہیں تجویز کرتا ہے اور ان کی اجازت دیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ خود کلچر کے اندر پابندیاں اور سزائیں نا کافی ہیں۔

اس قسم کی وارداتیں خاص طور پر امریکہ میں بڑے وسیع پیمانے پر ہوتی ہیں۔ اگر ہم استحصال کی اس وسیع تعریف کو قبول کریں کہ استحصال کا مطلب ہے اپنے ذاتی مفاد کے لئے کسی شخص سے ناجائز فائدہ اٹھانا تو امریکہ اور دوسرے صنعتی ممالک کی طرزِ زندگی سے ہمیں بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً بددیانت طالب علم اپنے ساتھیوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ امریکہ میں حالیہ مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ سیکنڈری سکولوں میں یہ بیماری بڑے وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے اور یونیورسٹیوں میں تو اس نے وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ پاکستان اگرچہ صرف ایک ترقی پذیر ملک ہے لیکن یہ وبا یہاں بھی بری طرح پھیل چکی ہے اور اس میں سرزد ہونے والے جرائم نے ہمارے نظام نظام کا مکمل طور پر بیڑا غرق کر دیا ہے۔

دوسری مثال صارفین سے دھوکہ کرنا ہے۔ یہ بھی صنعتی معاشروں کی ایک عام اور مقبول روش ہے۔ پاکستان میں تو یہ مرض بڑے وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ کمپنیاں ایسی اشیا اور خدمات برائے فروخت پیش کرتی ہیں جو نہ تو اصلی ہوتی ہیں اور نہ ہی ویسی ہوتی ہیں جن کا اشتہار دیا جاتا ہے۔ ان کا فائدہ بھی مشکوک ہوتا ہے۔ خریدنے کے بعد یہ اشیا تیسرے چوتھے دن ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ شاہ عالمی مارکیٹ لاہور میں یہ کاروبار بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ پرفیومز، آرائش کا سامان، لپ سٹک، سرخی پاؤڈر، صابن، شیمپو، کریمین وغیرہ اور کئی دوسرے عام اور گھریلو استعمال کے کیمیکلز کھلے عام تیار ہو رہے ہیں اور تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ یہ سب دساور کا مال

ہےاور حال ہی میں درآمد کیا گیا ہے۔ یہ طریق کار بھی استحصالی ہے۔

ہمارے ہاں چھوٹی اشتہار بازی ایک فن بن گیا ہے اور اخباروں میں ایسے جھوٹے اشتہاروں کی بھرمار ہوتی ہے۔ زنانہ اور مردانہ خفیہ امراض، پیچیدہ امراض کا بجلی کے ذریعے علاج، نشے بازی کا علاج، جنسی امراض کا علاج۔ کچھ لوگ ان طریقوں کو اچھا کاروبار شمار کرتے ہیں اور اپنی مدافعت میں یہ مقولہ دھراتے ہیں کہ ''مشتری ہوشیار باش''۔ یہ کاروباری طریقے استحصالی کیونکہ ان مصنوعات کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ برقی ہیلتھ کلنکس، اور دوسرے کاروباری اشتہارات سے ان کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے اخبار بھی استحصال کے مرتکب ہوتے ہیں کیونکہ یہ جرنلزم کی بجائے انڈسٹری میں بدل چکے ہیں۔ ہمارے اردو اخبار اس کی بدترین مثالیں ہیں۔

خواہ یہ قابلِ قبول ہوں یا نہ ہوں ایسے طریقے استحصالی ہیں کیونکہ ان میں دوسرے لوگوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

طبی پیشے میں بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اس پیشے کا مقصد انسانیت کی خدمت تھا۔ یہ ایک مشن تھا اور اس میں مالی مفاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ پیشہ بھی ناجائز فائدے کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ اس کے محرکات میں خدمت خلق کی جگہ ہوس درآئی ہے۔ ڈاکٹر غیر ضروری اور مہنگے میڈیکل ٹسٹ یا سرجری کا عمل تجویز کرتے ہیں جبکہ ان کا طبی فائدہ ہمیشہ واضح نہیں ہوتا۔ امریکہ میں وفاقی میڈی کیئر (Medicare) پروگرام نے اس کاروبار میں ایسے دھوکہ بازوں کا پتا چلایا ہے جس میں ڈاکٹر، ہسپتال اور حفظان صحت سے متعلق دوسرے شعبے بھی شامل ہیں۔ پاکستان میں بھی ایسے واقعات بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہے ہیں اور ان کے متعلق اخباروں میں روزانہ خبریں شائع ہوتی ہیں۔ پاکستان میں جعلی ادویات تجارتی بنیادوں پر تیار ہو کر فروخت ہو رہی ہیں۔

استحصال کے دوسرے فن کارانہ طریقے حفظان صحت میں بھی روئے ہیں۔ بہت کم ایسے دندان ساز ہیں جو دانت کی صرف ایک کھوڑ کو پر کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہوس زر کی خاطر پورے دانتوں کی صفائی اور سکیلنگ کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا انسدادی دندان سازی ہے۔ چنانچہ اس طرح بل زیادہ بن جاتا ہے اور اس کی ادائیگی ناگزیر ہے۔

اس قسم کے استحصالی طریقوں سے بچے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر والد

MashalBooks.org

ماجد اپنے افسر کو غچہ دے کر گھر پر رہ سکتے ہیں جب وہ حقیقتاً بیمار نہیں ہوتے تو میں کیوں امتحان میں نقل نہیں کر سکتا؟ اگر کمپنی مجھے غیر محفوظ کارخانے میں کام پر مجبور کر سکتی ہے تو میں وہاں سے اوزار کیوں چوری نہیں کر سکتا کئی اور بھی ایسی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

نکتہ یہ ہے کہ اس معاشرے میں جہاں استحصال عام ہے تو یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا قابلِ قبول ہے اور کیا نا قابلِ قبول ہے۔ قانونی تعریفیں ناکافی ہیں۔ کیا ہم دوسروں پر اپنی کارگزاری کا جائزہ لے سکتے ہیں یا ان کی ہمیں کوئی پرواہ ہے؟ یہ اس امر پر منحصر ہے کہ وہ لوگ آپس میں کس طرح کا میل جول رکھتے ہیں۔ اس معاشرے میں جہاں یہ یاددہانی اکثر کرائی جاتی ہے کہ ہر دوسرا شخص اس سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے، یہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ استحصال بری چیز ہے۔

جرم کا تعین کسی معاشرے کے غالب کلچر میں ہوتا ہے۔ مالی مفاد کی غرض سے جب تک لوگ معاشرتی سطح پر استحصال کی مختلف صورتوں کو قبول کرتے ہیں اور حصول کے ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے سے بے اعتنا رہتے ہیں، اس وقت تک جرائم کا ارتکاب جاری رہے گا۔

استحصال کی ان صورتوں کے مقابلے میں جو ابھی تک زیر بحث آئی ہیں، صنعتی ممالک میں مروج کئی صورتیں زیادہ مکروہ ہیں۔ مثال کے طور پر فحش نگاری انسانی جسم اور محبت کرنے کے عمل کا استحصال ہے کیونکہ یہ ان دونوں کو شہوت کا ایک مظہر بنا دیتے ہیں۔ یہ انسانیت کی تذلیل ہے کیونکہ یہ انسان کو حیوانی سطح پر لے آتی ہے۔ بچوں سے متعلق فحش نگاری میں یہ بہت نمایاں ہے جہاں فائدے کے لئے ہر جوان لڑکی کا استحصال کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچپن اور بچوں دونوں کی تذلیل ہوتی ہے۔ لیکن ہارڈ کور اور سوفٹ کور فحش نگاری کی ہر دل عزیزی کو دیکھیں کہ ایسی تصویروں، فلموں، ویڈیو ٹیپوں یہاں تک کہ اس کے زندہ مظاہروں پر لوگ لاکھوں روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔

امریکہ میں اس پر مستزاد یہ امر ہے کہ امریکی ذرائع ابلاغ اور فوجداری نظام انصاف اس کو سنسنی خیز بنا کر عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ دونوں خوفناک قسم کے جرائم کی خبروں سے مالی فائدہ اٹھاتے ہیں: ایک اخباروں کی فروخت کی صورت میں اور دوسرا بجٹ میں اضافے کی صورت میں۔ یہ بھی دوسروں کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنے کی ایک صورت ہے۔ ان مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ استحصال صنعتی خصوصاً امریکی طرزِ زندگی کا جزو ہے۔ ممکن ہے کہ ان مثالوں سے

MashalBooks.org

قاری کو استحصال کی دوسری صورتیں بھی نظر آ جائیں جن سے وہ ذاتی طور پر واقف ہوں۔

استحصال اور جرم

یہ امر کسی کے لئے حیرت کا باعث نہیں ہونا چاہیے کہ استحصال صنعتی زندگی میں ایک عام موضوع ہے۔ امریکن ایسی قوم ہے جو اپنی کامیابیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ بڑے مسائل کو حل کرنے کے دوران مشکلات پر قابو پانے کی اپنی اہلیت اور کارناموں پر فخر کرتی ہے۔ لیکن کارنامہ سرانجام دینا بذات خود ایک ایسا محرک ہے جس پر قابو پانا آسان نہیں اور ایسا کرنا خود کارنامے سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے، خصوصاً اس وقت جب ان کا جواز نتائج پیش کرتے ہوں اور جب ایسے کام میں کامیابی اسے حاصل کرنے کے ذرائع سے زیادہ اہم ہو جائے۔ جس حد تک کسی معاشرے میں کارنمایاں کو افضل سمجھا جاتا ہے اسی تناسب سے دیانتداری، راست بازی، ضبط نفس، کنٹرول اور دوسروں کے لئے احترام پر اسے فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیا پاکستان میں ایسا نہیں ہو رہا؟ لوگوں کی قدر و منزلت اور احترام ان کی املاک کی افراط پر منحصر ہے۔ وقار کا تعین دولت اور طرزِ زندگی کرتی ہے نہ کہ راست بازی اور اصول پرستی۔

کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے لئے موثر اور قرین مصلحت طریقہ دوسروں سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ شاید یہی ایک مقبول طریقہ ہے جس سے دوسروں سے آگے بڑھنے، مسابقت میں دوسروں کو پیچھے چھوڑنے اور بالآخر حصول دولت، معاشرے میں مقام اور اقتدار کا حصول ہے۔ اگر استحصال کو ایک صنعتی خصوصاً امریکی ادارہ فرض کر لیا جائے تو جرائم کی اتنی بڑی تعداد کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لوگوں کو ہر طرح یہ باور کرایا جاتا ہے کہ استحصال قابل قبول ہے۔ اس عام تنبیہ پر غور کریں: ''مجھے پروا نہیں کہ کام مکمل کرنے کے لئے کیا ذرائع استعمال کئے جائیں''، ''انہیں بتا دو کہ یہاں باس کون ہے'' ''اسے ہر قیمت پر حاصل کرو'' ''تم خود اس کے لئے ذمے دار ہو'' ترغیب دینا، درست ثابت کرنا، اور یہاں تک کہ استفادہ کاری کے طریقے امریکی کلچر میں موجود ہیں۔ مجرمیت تو اس موضوع کا صرف ایک اظہار ہے جو سطح پر نظر آتا ہے۔

اس دعوے پر ایک اعتراض وارد ہو سکتا ہے: جرم استحصال ہی کی ایک قسم ہے لیکن دوسری صورتوں کی بہ نسبت یہ کہیں زیادہ قابل مذمت اور سزا کا مستحق ہے۔

MashalBooks.org

حیاتیاتی عوامل

کتاب کے آغاز میں ہی جرم کے متعلق ہم لومبراسو کے نظریات سے متعارف ہو چکے ہیں اور یہ بھی ذکر آ چکا ہے کہ ان نظریات کو حالیہ تحقیق مسترد کر چکی ہے۔ لیکن اس حکیم کے خیالات کی بازگشت ہمیں آج بھی سنائی دیتی ہے۔ موجودہ تحقیق نے اپنا ایک رخ حیاتیات کی طرف کر لیا ہے اور اس کا نظریہ یہ ہے کہ جرائم کی وجہ حیاتیاتی عوامل ہیں جو معاشرتی حالات کے تحت جرائم پیشہ رویے اختیار کرتے ہیں۔

کتاب کرائم اینڈ ہیومن بیہیویر (Crime and Human Behaviour) جیمز کیو۔ ولسن اور رچرڈ جے ہیئر نستائن دونوں ماہرین کی مشترکہ تصنیف ہے۔ ان کے نظریات لومبراسو کے نظریات ہی کی بازگشت ہیں لیکن انہوں نے زیادہ باریک بینی سے کام لیا ہے۔ لومبراسو کے زمانے میں حیاتیات نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ ان دونوں ماہرین نے اس علم کی ترقی کی بدولت زیادہ غور وخوض سے کام لیا ہے۔ یہ دونوں مدعی ہیں کہ جرائم محض معاشرتی عوامل کا نتیجہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں کچھ لوگوں میں مجرم بننے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا سبب وہ حیاتیاتی عوامل ہیں جو انہیں اپنے والدین سے ورثے میں ملتے ہیں ان پر مستزاد نفسیاتی خصوصیات اور مشاہدات ہیں۔

اپنی کتاب میں وہ یہ سوالات اٹھاتے ہیں:

ا۔ کیا جرائم کرنے والے لوگ پیدائشی مجرم ہوتے ہیں یا وہ حالات کے تحت مجرم بن جاتے ہیں؟

MashalBooks.org

۲۔ وہ کون سی موروثی خصوصیات ہیں جو جرائم کی ذمہ دار ہیں؟

۳۔ کیا مختلف انسانی نسلوں میں جرائم کے فرق کی تشریح حیاتیاتی اور نفسیاتی عوامل کر سکتے ہیں؟

اس نظریے کے مطابق ہمارے شعور میں انقلابی تبدیلیوں نے جرائم کے متعلق ہمارے نظریات کو زیروزبر کر دیا ہے۔ موجودہ زمانے تک ماہرین جرمیات جرائم کے اسباب مجرموں کے معاشرتی حالات میں تلاش کرتے رہے ہیں۔ ایسے اسباب میں منتشر خاندان، ابتر خاندانی حالات، سکولوں میں غیر موثر تعلیم، غیر سماجی گروہ، نسل پرستی، غربت، بے روزگاری وغیرہ شامل ہیں۔ معاشرتی علوم کے فرانسیسی ماہر ایمل ڈرخایم کے اس قول کو کہ ''معاشرتی حقائق کے توجیہ معاشرتی حالات سے ہی ہوتی ہے'' معاشرتی رویوں کے دوسرے طالب علموں کے مقابلے میں ماہرین جرمیات زیادہ سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ اخباروں کے اداریہ نویسوں، مبصروں، سیاست دانوں اور اہلِ فکر کی طرف سے کسی اعتراض کے بغیر جرائم کے اس معاشرتی نظریے کو تقویت ملتی رہتی ہے۔

لیکن آج کے علمی جرائد اور دانشورانہ کتابیں ایک مختلف تصویر پیش کرتی ہیں۔ معاشرتی عوامل کو بالکل نظرانداز تو نہیں کیا جاسکتا مگر کئی ماہرین پر یہ واضح ہو رہا ہے کہ جرائم کے اسباب معاشرتی اور حیاتیاتی عوامل کے عمل اور ردعمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ جرائم کا بار بار ارتکاب کرنے والوں میں یہ امر بہت واضح اور مخصوص طور پر دکھائی دیتا ہے۔ لومبراسو کا نظریہ بھی تک متنازعہ ہے کہ ''مجرم پیدا ہوتے ہیں یا انہیں مجرم بنا دیا جاتا ہے''۔ زیادہ تر جواب یہی ملتا ہے کہ دونوں صورتیں صحیح ہیں۔ جرائم کے اسباب میں پہلے سے متعین حیاتی خصوصیات اور معاشرتی رویے ہیں۔ یہ دونوں مل کر جرائم کا سبب بنتے ہیں۔ حیاتیاتی خصوصیات ہمیشہ جرائم کا سبب نہیں بنتیں اور نہ ہی معاشرتی عوامل ہر شخص کو جرم کی تحریک دیتے ہیں۔ مگر یہ دونوں مل کر ایسے افراد پیدا کرتے ہیں جو بڑی حد تک جرائم کا مسئلہ پیدا کرتے ہیں۔

ایک جیسے جڑواں بچے

جرائم کے اسباب پیدا کرنے کے حق میں حیاتیاتی ورثے میں ملنے والی خصوصیات کی بڑی قوی اور موثر شہادت جڑواں بچوں اور گود لئے جانے والے لڑکوں کے تقابلی مطالعے سے ملتی

MashalBooks.org

ہے۔1920 میں یہ امر واضح ہو چکا تھا کہ جڑواں بچے ایک ہی فرٹیلائزڈ (Fertilized) انڈے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں حیاتیاتی ورثہ یکساں پایا جاتا ہے۔ ایسے بچوں کو مماثل توام (Identical Twins) کہتے ہیں۔لیکن ایسے جڑواں بچے بھی ہوتے ہیں جو دو فرٹیلائزڈ انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے آدھے جینز (Genes) مشترک ہوتے ہیں۔ انہیں فریٹرنل ٹونز (Fraternal Twins) کہتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ مختلف خصوصیات کے لئے جینز کتنے اہم ہیں مماثل جڑواں بچوں میں مماثلتوں کا تقابل فریٹرنل ٹونز کی خصوصیات میں مماثلتوں سے کرنا ایک معیاری طریق کار ہے۔ جب مماثل جڑواں بچوں کی کوئی خصوصیت فریٹرنل ٹونز کے مقابلے میں زیادہ مماثل ہوتی ہے تو لازمی طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس خصوصیت میں وراثت کی اہلیت بہت زیادہ ہے۔

جرائم کے متعلق تحقیق جڑواں بچوں کے تقریباً ایک درجن مطالعات پر مبنی ہے۔ اس تحقیق میں امریکہ، جاپان، سکنڈے نیویا کے ممالک، مغربی جرمنی، برطانیہ اور چند دوسرے ملکوں کے 1500 سے زاید جڑواں بچوں کا مطالعہ کیا گیا۔ فریٹرنل ٹونز کے مقابلے میں ایک جیسے جرائم کے ریکارڈ کا امکان مماثل جڑواں بچوں میں زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر کارل اوکرسچیئن سن نے جو جرمیات کے ماہر ہیں، ڈینش جڑواں بچوں کے رجسٹر کو دیکھنے کے بعد پولیس، عدالتوں اور جیلوں کے ریکارڈز سے 1881 سے 1910 کے درمیانی عرصے میں ڈنمارک میں پیدا ہونے والے جڑواں بچوں کا مطالعہ کیا۔ ان پر یہ واضح ہوا کہ مماثل جڑواں بچوں میں سے اگر ایک کا مجرمانہ ریکارڈ ہے تو اس کے جڑواں بہن یا بھائی میں فریٹرنل ٹونز کے مقابلے میں مجرمانہ امکانات تقریباً گنے ہیں۔

امریکہ کی یونیورسٹی آف اوکلاہوما کے ماہر نفسیات ڈیوڈ رو (David Rowe) بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ مجرمانہ رجحانات کو ناپنے کے لئے انہوں نے مجرمانہ ریکارڈ کی جگہ سوال نامے کا طریقہ کار اپنایا۔ اوہایو کے تقریباً تمام سکولوں میں جڑواں بچوں کو انہوں نے ڈاک کے ذریعے ایک سوالنامہ بھیجا اور یہ وعدہ کیا کہ ان کے جوابات کو بالکل خفیہ رکھا جائے گا۔ یہ وعدہ بھی تھا کہ اگر سوال نامے کو جوابات کے ساتھ واپس بھیجا گیا تو اس پر بھیجنے والے کو معاوضہ بھی ملے گا۔ جڑواں بچوں سے ان کی اور ان کے ساتھی بہن بھائیوں کی کارکردگی اور سرگرمیوں اور مجرمانہ طرزِ

عمل کے متعلق سوالات پوچھے گئے۔ ان سوالناموں کے جوابات سے معلوم ہوا کہ ایک جیسے جڑواں بچوں میں خطا کاری کے رجحانات ایک ہی نوعیت کے ہیں اور برادرانہ جڑواں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک جیسی سرگرمیوں میں زیادہ شریک ہونے والے جڑواں میں کم تر سرگرمیوں میں شریک ہونے والوں کے مقابلے میں رجحانات کے امکانات زیادہ نہیں ہیں۔

خاندانی جائزے

تحقیق کا کوئی طریق کار حتمی نہیں ہوتا۔ تاہم لے پالک بچوں کے جائزے سے بھی ایسے ہی نتائج برآمد ہوئے۔ ایسے جائزے کا محرک یہ امر ہے کہ بچوں کے ایسے نمونے حاصل کئے جائیں جنھیں اوائل بچپن سے ہی گود لیا گیا ہو اور ان کے اپنے سگے والدین اور گود لینے والے والدین کی ماضی کی سرگرمیاں محققین کو معلوم ہوں۔ اور جب یہ بچے بڑے ہو جائیں تو محقق معلوم کر سکیں کہ ان کے خاندانوں کی تاریخ کس حد تک ان بچوں میں جرم کی پیش بینی کر سکتی ہے۔

سرناف میڈنک (Sarnoff Mednick) ماہر نفسیات ہیں۔ جریدہ سائیکالوجی ٹوڈے (مارچ 1985) میں وہ لکھتے ہیں:

ہمارا مطالعہ پرزور طریقے سے یہ واضح کرتا ہے کہ مجرمانہ طرزِ عمل جینیاتی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ چونکہ جینیاتی ترسیل میں حیاتیاتی عوامل شامل ہوتے ہیں اس لئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حیاتیاتی خصوصیات لازمی طور پر مجرمانہ طرزِ عمل کی ذمہ دار ہیں، خصوصاً ان مجرموں میں جو بہت سے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔''

واقعہ یہ ہے کہ کیلیفورنیا یونیورسٹی کے ماہر نفسیات سرناف میڈنک اور امریکہ اور ڈنمارک میں ان کے ساتھیوں نے ڈنمارک میں 1927 اور 1947 کے درمیان کئی ہزار لے پالک لڑکوں کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ سے یہ واضح ہوا کہ مجرمانہ ریکارڈ والے اصلی والدین کے لڑکوں میں جنہیں غیر مجرم والدین نے گود لے لیا تھا، ان لڑکوں کے مقابلے میں مجرمانہ رجحانات زیادہ تھے جن کے اصلی والدین تو جرائم سے مبرا تھے مگر انہیں گود لینے والے والدین کا ریکارڈ مجرمانہ تھا۔ جتنی زیادہ دفعہ اصلی والدین سزا یافتہ ہوں گے ان کے لڑکے میں جسے جرائم سے مبرا والدین نے گود لیا، جرم

کے خطرے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ ایسے خطرے کا اس امر سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ اس مخصوص لڑکے کی پیدائش سے پہلے یا بعد میں اس کے اصلی والدین جرم کے مرتکب ہوئے یا بچوں کو عین پیدائش کے وقت یا ایک دو سال کے بعد گود لے لیا گیا۔ ان نتائج کی توثیق ان جائزوں نے کر دی جو لے پالک بچوں کے متعلق سویڈن یا امریکہ میں ہوئے۔

حیاتیاتی عامل

ان مطالعات کی بنا پر جرمیت میں جینیاتی عوامل کی دین کو ماہرین معاشرتی علوم اور ماہرین جرمیات قبول کرتے ہیں۔ اگر کہیں اختلاف ہے تو اس بات پر ہے کہ جرم میں ان عوامل کی دین کس حد تک ہے اور مجرم والدین سے بچوں کو مجرمیت کی ترسیل کس طرح ہوتی ہے۔

جڑواں بچوں اور گود لئے گئے بچوں کے مطالعوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محض جینز ہی جرائم کے ذمہ دار نہیں ہیں کیونکہ یہ مشاہدہ بھی کیا گیا ہے کہ اگر گود لینے والے والدین مجرم ہیں اور لڑکوں کے سگے والدین مجرم نہیں ہیں، تو بھی لڑکوں میں مجرمیت کے رجحانات میں تھوڑا سا اضافہ ہو جاتا ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ توام بچوں میں سے اگر ایک مجرم ہو تو دوسرا بھی لازمی طور پر مجرم ہوگا۔ اگرچہ مجرمیت میں حیاتیاتی دین کافی ہے لیکن اس کی صحیح مقدار کا تعین غالباً ناممکن ہے کیونکہ اس کے ناپنے کے پیمانے بڑے بھونڈے ہیں۔

والدین سے بچوں کی طرف جرائم کے رجحانات کی ترسیل کرنے والی کڑی پر بھی غور کرنا چاہیے۔ کوئی بھی اس بات پر یقین نہیں کرتا کہ مجرمانہ جین بھی ہوتے ہیں، لیکن دو ایسے وصف ہیں جو کسی حد تک وراثت میں ملتے ہیں اور وہ مجرمانہ طرز عمل کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ ہیں ذہانت اور مزاج (یا افتادِ طبع)۔ سینکڑوں مطالعات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں جتنے جین مشترک ہوں گے ذہن اور افتادِ طبع یا مزاج کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے اتنے ہی مشابہ ہوں گے۔

جرم اور ذہانت

ایک بڑے نمونے میں 1920 میں ذہانت کے امتحان (آئی کیو ٹیسٹ) میں جرائم کا ارتکاب کرنے والوں نے 91 سے 93 تک پوائنٹ حاصل کئے جبکہ پوری نفری کا سکور 100 تھا۔

MashalBooks.org

جرائم کا ارتکاب کرنے والوں نے آئی کیو ٹیسٹ کے دوران تحریری امتحان کے مقابلے میں زبانی امتحان میں کمتر کارکردگی دکھائی لیکن دونوں صورتوں میں وہ اوسط سے کم ہی رہے۔

ماہرین کو مجرمانہ طرزِ عمل اور آئی کیو کے درمیان تناسب کا بڑے عرصے سے پتا تھا لیکن بہت سے ماہرین نے اسے اہمیت نہیں دی اور کچھ ماہرین کا خیال تھا کہ اس باہمی رشتے کی توجیہ سماجی مرتبے اور آئی کیو کے درمیان تناسب سے کی جاسکتی ہے۔ ایسے ماہرین کا خیال ہے کہ کمتر آئی کیو کی بجائے معاشرتی اقتصادی حالات ہی جرائم کے محرک بنتے ہیں۔ کچھ ماہرین کو دآئی کیو کو ہی محل نظر ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا یہ ٹیسٹ واقعی ان لوگوں کی ذہانت کو ناپ سکتے ہیں جو قانون شکنی کا رجحان رکھتے ہیں؟ وہ ماہرین یہ دلیل دیتے ہیں کہ مجرموں کا امتحان میں کم نمبر لینا ان کے ثقافتی طور پر محروم پس منظر کی بنا پر ہوسکتا ہے یا اپنے معاشرے کی اقدار سے لاتعلقی کی بنا پر ہوسکتا ہے نہ کہ ذہانت کی کمی کی بنا پر...... یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے جائزوں میں شریک ہونے والے اشخاص وہ ہیں جو جرم کے ارتکاب کے بعد پکڑے جاتے ہیں۔ جن مجرموں کا آئی کیو بلند ہوتا ہے وہ بھاگ جانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

لیکن یہ سب اعتراضات اتنے موثر نہیں ہیں جتنے کہ یہ دکھائی دیتے ہیں یا سمجھے جاتے ہیں کیونکہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو غربت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کے مقابلے میں جو ایسے ہی حالات میں رہتے ہوئے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، ان کا آئی کیو زیادہ بلند ہوتا ہے۔

یہ غلط فہمی بھی عام ہے کہ پسماندہ معاشرتی پس منظر رکھنے والوں پر ٹیسٹ کا اطلاق ہی غلط ہے۔ اگر اس تنقید سے مراد یہ ہے کہ یہ ٹیسٹ مختلف سماجی سماجی گروہوں کے لئے صرف تعلیمی اہلیت یا ملازمت میں کارکردگی کی پیش گوئی کرتا ہے تو یہ تنقید غلط ہے۔ نیشنل اکیڈمی آف سائنسز کے ایک حالیہ مطالعے سے نظر آتا ہے کہ ''مختلف گروہوں پر یہ ٹیسٹ ایک ہی قسم کی پیش گوئی کرتے ہیں'' اس عقیدے کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتا ہے کہ غیر مجرموں کے مقابلے میں مجرموں کا آئی کیو کم ہوتا ہے۔

اگر آئی کیو اور جرم میں کوئی باہمی تعلق ہے تو اس تعلق کی وضاحت کیا ہوسکتی ہے؟ اس کی وضاحت یہ امر ہے کہ اول آئی کیو کا کم ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ زیر بحث شخص میں اپنے افعال کے

ممکنہ نتائج یا ضابطہ اخلاق کو سمجھنے کی اہلیت نہیں ہے۔ دوم، سکول میں شاید اسے مشکلات پیش آئی ہیں جن کی وجہ سے اس میں مایوسی اور پھر ناراضگی اور اس کے بعد غصہ اور قانون شکنی کا رجحان پیدا ہوا ہو۔ شاید وہ اپنا اظہار کرنے میں مہارت نہیں رکھتا اور اس لئے وہ اظہار کی دوسری صورتیں اختیار کرتا ہے جیسے جسمانی تشدد یا طاقت کا غیر ضروری استعمال وغیرہ۔

جیمز کیوولسن اور رچرڈ جے ہیرنسٹائین اپنی محولہ بالا کتاب کرایم اینڈ ہیومن بیہویر، (Crime and Human Behaviour) میں لکھتے ہیں:

''ایک متوسط مجرم اگرچہ جسمانی طور پر معمول سے اتنا مختلف نظر نہیں آتا مگر جسمانی ساخت کے لحاظ سے وہ بڑا منفرد ہوتا ہے۔ وہ حیاتیاتی عوامل جن کے عنوانات ہم چہرے یا جسم کی ساخت میں دیکھتے ہیں یا والدین اور بچوں کے باہمی تعلق میں نظر آتے ہیں، سب جرائم کی طرف آمادگی ہے جس کا اظہار نفسیاتی خصوصیات میں نظر آتا ہے اور جن کو حالات متحرک کرتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ان نفسیاتی خصوصیات میں ذہانت اور شخصیت بھی شامل ہوں اور متحرک کرنے والے عوامل میں خاندان، سکول اور معاشرے میں اس کے تجربات ہوں۔''

مزاج یا افتادِ طبع اور جرم

بار بار جرم کرنے والوں میں جرائم کے لئے آمادگی میں ذہانت سے زیادہ مزاج یا افتادِ طبع کا دخل معلوم ہوتا ہے۔ اضطراریت، معاشرتی ماحول کے متعلق بے حسی، دوسروں کے لئے گہری اور پائیدار جذباتی وابستگی کا فقدان یا خطرات مول لینے کی خواہش، یہ وہ خصوصیات ہیں جن کا تعلق اونچے درجے کے قانون شکنوں میں ہوتا ہے۔ مزاج کسی حد تک وراثت میں ملتا ہے، گو اس حد تک نہیں جس حد تک ذہانت۔ تمام والدین کو معلوم ہے کہ پیدائش کے بعد ان کے بچوں کا برتاؤ کیسا ہے۔ وہ نرم خو ہیں یا چڑچڑے ہیں، شرمیلے ہیں یا بےباک ہیں۔ اگرچہ بچے کی نشوونما کے دوران بہت سی خصوصیات بدل جاتی ہیں لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جو قائم رہتی ہیں جیسے زود حسی اور جارحیت پر آمادگی۔ جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا ہے دوسری خصوصیات کی طرح یہ بھی رفتہ رفتہ تبدیل ہو کر غیر روایتی، گستاخانہ اور سماج دشمن رویے کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

ماہر سماجیات لی لروبنز (Lee Robins) نے 500 سے زیادہ بچوں کی تیس سالہ زندگی کا

مطالعہ کیا ہے۔ یہ بچے 1920 میں ایک چائیلڈ گائیڈنس کلنک میں بطور مریض شریک تھے۔ یہ محترمہ کرانک سوشیو پیتھی کے پیش روعوامل میں دلچسپی رکھتی تھیں جو سماج دشمن شخصیت کی ہی ایک صورت ہے اور جس میں مجرمانہ رویہ ایک علامت ہے۔ اس کے مطالعے میں شامل لوگ بالغ سوشیو پیتھ جن کو سائیکلوسز، ذہنی پس ماندگی یا نشے کی لت تھی، بلا استثنا اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے سماج دشمن تھے۔ نصف سے زیادہ سوشیو پیتھ مردوں میں بارہ سال کی عمر سے پہلے بڑی نمایاں علامات تھیں۔ بچپن کی نمایاں مقدم علامتوں میں کام چھوڑ کر بھاگ جانا، سکول میں ناقص کارکردگی، چوری، عاقبت نااندیشی، تن آسانی، اضطرار اور جرم کے احساس کا فقدان شامل تھے۔ بچپن میں یہ علامات جتنی زیادہ ہوں گی اتنا ہی سوشیو پیتھی کا خطرہ بھی زیادہ ہوگا۔

دوسرے مطالعے بھی ڈاکٹر لی کے نتائج کے توثیق وتوسیع کرتے ہیں۔ جان جے کانجر (John J. Conger) اور ولبر ملر (Wilber Miller) نے خطا کار لڑکوں کے ایک سامپل کی زندگیوں کا مطالعہ کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تیسرے گریڈ کے اختتام تک ان بچوں کے اساتذہ کو خطا کار بچے نظر آجاتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ برے طریقے سے گود لئے گئے تھے۔ بحیثیت ایک فرد کے یا ایک جماعت کے ان میں اپنے ساتھیوں کے حقوق کا بہت کم خیال تھا اور اپنی ذمہ داری قبول کرنے کا احساس بھی کم ہی تھا۔ بزرگوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ نامناسب تھا۔

بچپن کے مسائل

ان خصوصیات کی بنا پر، جو سنگین اور بار بار واقع ہونے والے مجرمانہ رویوں کی جھلک پہلے سے ہی دکھا دیتی ہیں، طرز عمل کے ان نمونوں سے جیسے زود حسی، غیر معمولی چڑچڑاپن اور عصبی بیماریوں کی علامات جیسے خلاف معمول دماغی ہیجان یا اضطراری حرکات کا پتا لگایا جا چکا ہے۔ چند لوگوں میں تو ان کا پتا پہلے چند برسوں میں ہی لگ جاتا ہے۔

قبل از وقت پیدا ہونے والے بچے یا وہ بچے جن کا پیدائش کے وقت وزن کم ہوتا ہے، مخصوص مسائل کے حامل ہوتے ہیں۔ اپنے ماحول میں مخالف حالات کے سامنے وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ اس بنا پر بھی ان میں مجرمانہ رجحانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ بچوں کا خیال

MashalBooks.org

رکھنے والے والدین اس کی تلافی کر سکتے ہیں لیکن بے اعتنا اور بے توافق والدین ان میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ قبل از وقت پیدائش یا وزن میں کمی کی وجہ والدین میں ضرورت سے زیادہ شراب نوشی، منشیات کا استعمال یا قبل از پیدائش نگہداشت میں غفلت کے باعث ہو سکتی ہے۔ اس کمی کی وجہ غربت اور ضروری معلومات کا فقدان بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں مجرمیت حیاتیاتی نہ کہ جینیاتی عوامل کا نتیجہ نظر آتی ہے۔ اب معلوم ہو گیا ہے کہ نارمل بچوں کے مقابلے میں ایسے بچوں میں برے برتاؤ کا شکار ہونے کا اندیشہ زیادہ ہے۔

مارگن او۔ رینالڈ(Morgan O.Reynolds)، کرایم بائی چوائس (Crime by Choice) اڑدین میں لکھتے ہیں:

''بہت کم مباحث ایسے ہیں جو جذبات کو اتنا مشتعل کرتے ہیں جتنا کہ وہ مسائل جو وراثت اور ماحول کی اضافی اہمیت سے متعلق ہوں۔ یہ مباحث انتہائی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جینز ہی تقدیر ہیں اور ماحول کی کوئی اہمیت نہیں یا پھر اس کے برعکس۔ لیکن کوئی جاندار ایسا نہیں جو جینز سے مبرا اور ماحول سے لاتعلق ہو۔ انسانی خصوصیات اور طرزِ عمل کو اکثر وراثت متاثر کرتی ہے۔ اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ انفرادی خصوصیات کی بنیاد جینز پر ہے خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو۔ اس امکان کو قطعی رد نہیں کیا جا سکتا کہ قانون کی پابندی یا مجرمیت کے رجحان کی بنیاد جیسیاتی ہے۔

سیاسی ردِعمل

یہ بیان کہ انسانی کردار کی وضاحت خصوصاً مجرمانہ کردار کی وضاحت میں حیاتیات اہم کردار ادا کرتی ہے، بعض اوقات شدید سیاسی اور نظریاتی ردِعمل پیدا کرتا ہے۔ اس تنقید کی بنا پر کہ یہ ایک بھونڈی جبریت ہے، کچھ نقاد اس موضوع کی شہادت کی نفی کرتے ہیں جبکہ دوسرے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس شہادت کو صرف سائنسی جرائد تک محدود کر دینا چاہیے۔ ان سائنس دانوں پر، جنہوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ انسانی طرزِ عمل پر کروموسومز(Chromosomes) کے غیر معمولی ہونے کا مطالعہ کرنا چاہیئے، دوسرے سائنس دانوں نے زبردست حملے کئے ہیں۔ بالکل اسی طرح ان سائنس دانوں پر شدید تنقید کی جاتی ہے جو ان اعداد و شمار کو شائع کرتے ہیں جن سے

MashalBooks.org

ذہانت اور مزاج کا موروثی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کو اندیشہ ہے کہ کسی ایسے دعوے سے کہ موروثی عوامل جرمیت کو متاثر کرتے ہیں، یہ مراد لی جاسکتی ہے کہ سفید فام لوگوں کے مقابلے میں سیاہ فام لوگوں میں جرائم کی بلند شرح کے ذمہ دار جینیاتی عوامل ہیں۔ لیکن کسی ذمہ دار کتاب میں ابھی تک کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا گیا۔ جو اعداد و شمار اکٹھے کئے جا چکے ہیں وہ صرف یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عمر، جنس، ذہانت اور دوسرے انفرادی عوامل میں نسل انتہائی غیر اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چنانچہ جرائم کے اسباب کے متعلق کسی مطالعے کو سب سے پہلے انفرادی عوامل پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ نسلوں میں فرق کی کئی توجیہات ہوسکتی ہیں اور ان میں سے کسی کا تعلق حیاتیات سے نہیں ہے۔

جرائم میں حیاتیاتی عوامل کے خلاف اتنا شدید ردعمل بے معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اکتشافات اس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ ''مجرم پیدا ہوتے ہیں اور انہیں جیلوں میں بند کر دینا چاہیے''۔ اس کے برعکس جرائم پر قابو پانے کے لئے یہ اکتشافات نئے اور تخیلی طور پر صحت مند طریقے تجویز کرتے ہین۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسری بیماریوں جیسے ذہنی اور جسمانی بیماریاں، الکحل ازم، سیکھنے میں مختلف قسم کی عدم استعداد، نشہ بازی سے متاثر ہونا وغیرہ میں حیاتیاتی عوامل کی کارکردگی کا پتا چلانا۔ ہمیں اب معلوم ہوا ہے کہ مختلف قسم کے ذہنی دباؤ کا علاج بڑی کامیابی سے ہوسکتا ہے۔ تھوڑے عرصے میں ہمیں الزایمیز (Alzheimers) بیماری کے علاج کا بھی پتا لگ جائے گا۔ شراب نوشی کی لت میں پڑے ہوئے لوگوں کو اس وقت بہت مدد مل جائے گی جب ان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ کچھ لوگوں میں شراب نوشی کی طرف رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد شاید وہ اس کے قریب بھی نہ جائیں۔ رغبت دلانے کا کیمیاوی علاج اب ایک حقیقت پسندانہ امکان ہے۔ آہستہ سیکھنے والے کچھ لوگوں کو خاص پروگراموں کے ذریعے مدد دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح کچھ اور بیماریوں کا علاج بھی ہو سکے گا۔

صبر آزما طریقوں سے برسوں بعد عورتوں اور مردوں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد تمبا کو نوشی یا خوراک اور بیماری کے رشتے کا پتا چلا ہے۔ اسی طرح برسوں کے مطالعے کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ دوسرے خارجی تجربات سے مل کر ذہانت، مزاج، ہارمونز کا لیول اور دوسری صفات یعنی خاندانی اور سکول کا ماحول کیسے پیچیدہ اور لطیف طریقوں سے انسانی کردار کی تشکیل کرتے ہیں۔

ضابطہ اخلاق کی کمزوری

شروڈر(Schroeder)ایک سینئر صحافی ہیں۔ ان کے خیال میں غربت اور دوسرے معاشرتی حالات میں جرائم کی وجوہات تلاش کرنا عبث ہے۔ جرائم کی وجہ ضابطہ اخلاق کی کمزوری ہے جس کی بنا پر انسان خیروشر میں امتیاز نہیں کرسکتا۔ چنانچہ یہ لازمی ہے کہ مجرموں کی غلط کاریوں پر نظام انصاف اور مجرموں سے متعلقہ خاندان ان کو سزا دیں۔

جرائم سے خوف کی بنا پر لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ انہیں اپنے گھروں اور محلوں میں قیدی بنادیا گیا ہے۔ وہ اکیلے میں خوف کھاتے ہیں۔ وہ جانے پہچانے راستوں میں ہٹ کے چلتے ہیں اور زیادہ خریدوفروخت کرنے سے گھبراتے ہیں۔ وہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل ہونے سے خوف کھاتے ہیں اور اجنبیوں سے ڈرتے ہیں۔

ہماری دنیا میں جرائم اور تشدد کا یہ بڑھتا ہوا طوفان کیسے آیا؟ اجنبیوں اور بالکل معصوم لوگوں کے خلاف نوجوان لڑکوں کا گینگ کی صورت میں مجرمانہ رویہ کیوں بڑھتا جارہا ہے؟

ان دہشت ناک مسائل کی کچھ وجوہات ہیں اور کوئی معاشرہ بھی جرائم کی اس بڑھتی ہوئی لہر سے اس وقت تک نپٹ نہیں سکے گا جب تک کہ وہ ان کی وجوہات کا درست طریقے سے سراغ نہ لگالے۔

ہمارے زمانے کا المیہ یہ ہے کہ اگرچہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اور حکومت کے افسر آج سنگین جرائم کی اہم وجوہات سے آگاہ ہیں لیکن وہ ان کا سدِ باب کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتے۔

MashalBooks.org

جرائم کی غلط وجوہات

اکثر ماہرین جرمیات، ماہرین معاشرت اور سرکاری حکام مسئلے کا غلط حل پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ پولیس کی نفری میں کمی کو جرائم کا سبب سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اسلحہ کے حصول میں آسانی اور انصاف کے ناقص نظام کو جرائم کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ ایسے ماہرین بھی ہیں جو تشدد بھری تفریح یا غربت کو جرائم کا سبب شمار کرتے ہیں۔ یہ امور جرائم کے مسئلے کو بڑھانے میں مدد ضرور دیتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی اکیلا عامل جرائم کی پوری پوری تشریح نہیں کرسکتا۔ جرائم کی بنیادی وجوہات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

شروڈر کے خیال میں مجرمانہ رویے کی بڑی وجہ غربت نہیں۔ یہ اگرچہ درست ہے کہ افلاس زدہ کچی آبادیاں ایسے معاشرتی حالات پیدا کرتی ہیں جو مجرمانہ رویے کو بڑھاوا دیتے ہیں لیکن یہ بذات خود مجرمانہ رویہ پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں ایسے غریب افراد کی اکثریت ہے جو جرائم پیشہ نہیں اور نہ ہی تشدد پسند ہیں۔ ان کی صرف ایک چھوٹی سی اقلیت مجرمانہ رویہ اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، جس کی وجوہات بڑی واضح ہیں۔

ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ متوسط اور اونچے طبقوں کے خاندانوں، تجارت پیشہ لوگوں اور سکولوں میں احمقانہ جرائم جیسے چوری، بددیانتی اور تشدد میں کیوں اضافہ ہو رہا ہے۔

اولیں وجہ

جرائم کی اولین وجہ صحیح کردار کا فقدان ہے۔ معاشرے کی صحیح اقدار کو نہ اپنانا اور شر کی، خواہ اس کا کوئی مخرج ہو، مزاحمت نہ کرنے میں افراد کی ناکامی جرائم کا پہلا سبب ہے۔ جب بچے اور بالغ خواہ وہ غریب، امیر یا درمیانے طبقے کے ہوں اپنے اندر مجرمانہ رجحانات پیدا کرتے ہیں یا اس طرح ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہو، تو اس کا نتیجہ بڑا واضح ہے۔ وہ مجرم بن جاتے ہیں۔

مجرمانہ سوچ اور مجرمانہ رویہ غلط روحانی رویے اور غلط اقدار کی پیداوار ہیں۔ یہ رویہ مجرموں میں کچھ حاصل کرنے کی خواہش سے پیدا ہوتا ہے، خواہ اس میں دوسروں کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچتا ہو۔ قانون کے اندر رہ کر صبر و استقلال سے کام کرکے اپنی خواہش کی تسکین کا اس رویے میں

MashalBooks.org

فقدان ہوتا ہے۔ مسائل کو صبر اور پرامن طریقے سے حل کرنے کی خواہش کی کمی اور بے صبری بھی اس قسم کے رویے کی ذمہ دار ہیں۔

ڈسپلن کی ضرورت

ایک تجربہ کار پولیس افسر نے بڑے واضح الفاظ میں اس سوال کا جواب دیا تھا کہ مجرموں کی تعداد اتنی زیادہ کیوں ہے اور اتنے سارے بچے کیوں غلط کار بن جاتے ہیں؟ اس کے الفاظ یہ تھے ''میں اپنے تیس سالہ تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جرائم کی سب سے بڑی وجہ ڈسپلن کا فقدان اور اپنے آپ کو ڈسپلن کا پابند نہ کرنا ہے۔ اگر کوئی خاندان اپنے بچے کو ڈسپلن نہیں سکھاتا اور بچے میں بھی اپنے آپ نظم و ضبط کی خواہش پیدا نہیں ہوتی تو بعد میں عدالتوں کے ذریعے ان کو ڈسپلن کا پابند کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے بچے بالآخر عدالتوں تک ہی پہنچتے ہیں۔''

ولیم مارچیسن (William Marchison) کنزرویٹو کرانیکل (Conservative Chronicle) (فروری 10,1988ء) میں لکھتے ہیں:

''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سب گورے کالے، براؤن، یعنی جو کچھ بھی ہم ہیں معاملات کو سلجھائیں۔ رنگ معاشرے کو تقسیم نہیں کرتا۔ تقسیم کرنے والا اصلی خط وہ ہے جو اچھے اور برے لوگوں میں فرق کو پیش نظر رکھتا ہے یعنی ایک وہ لوگ جو معاشرے کی ذمے داریوں کو قبول کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو ان الفاظ کے معنوں سے نا آشنا ہیں۔''

والدین اور معاشرے کے بزرگوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ بچوں کو سمجھائیں کہ وہ عدم استحکام، بدکاری، بزرگوں کی حکم عدولی اور جھوٹ جیسے جذبات اور احساسات کو اپنے کردار میں پہچانیں، ان کی مزاحمت کریں اور ان پر فتح پائیں۔ وہ معاشرے کے دوسرے لوگوں کا احترام کریں اور املاک کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ اگر معاشرہ اپنے بچوں کی اوائل عمری میں ہی ان خطوط پر تربیت نہیں کرتا تو یہ امر یقینی ہے کہ اسے جرائم کے مہیب مسائل کا سامنا کرنا ہوگا۔

جرائم سے نجات پانے کے لئے مستحکم اور بااخلاق خاندان اشد ضروری ہیں۔ یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ ایک مستحکم خاندانی نظام طلاق اور علیحدگی کی بنا پر بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ بچوں کی صحیح خطوط پر تربیت اس لئے نہیں ہو سکتی کہ ان کے والدین زندگی کے دوسرے

کاموں اور سرگرمیوں اور عیش وعشرت میں مصروف رہتے ہیں۔

کئی دہائیوں سے اخلاقی فلسفہ اضافیت خیر وشر یعنی نیکی اور بدی کے درمیان فرق کو پیش نظر نہ رکھنا کئی گھروں، سکولوں، کالجوں اور یہاں تک کہ مذہبی اداروں میں بھی ایک فیشن بن چکا ہے۔ اخلاقی فلسفہ اضافیت (Relativism) نے کئی نتائج پیدا کئے ہیں جو سراسر شرانگیز ہیں اور معاشرے کے لئے مہلک ہیں۔

مجرمانہ رویہ معاشرے کے تمام طبقات میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا زیادہ ارتکاز ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور دوسری اقوام کے شہروں کے اندرونی اقلیتی محلوں میں نظر آتا ہے جہاں متحدہ خاندان کا تصور پارہ پارہ ہو چکا ہے۔

ان بچوں کی اکثریت کے لئے باپ کی صورت میں کوئی ماڈل نہیں ہوتا۔ جسے وہ اپنا سکیں۔ ان کے لئے کامیاب زندگی کا ایک ہی ماڈل ہے اور وہ ہے گلی کوچوں میں گھومنے والے غنڈے بدمعاش۔

چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ ہر نسل میں شائستگی، خیر اور بامعنی رواداری کے معنی کم سے کم تر ہوتے چلے جارہے ہیں اور بالآخر ان نوجوانوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جن کے دل دوسروں کے لئے رحم اور شفقت کے جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ صرف اس وقت ہی کچھ بن سکتے ہیں جب وہ کسی دوسرے انسان کی انفرادیت چھین لیں۔

کتنے والدین ہیں جو بچوں کے اچھے کردار کی تعمیر کرتے ہیں؟ کئی بچے ایسے ہوتے ہیں جن کی شخصیت کی تعمیر کے لئے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ توجہ زیادہ راہنمائی اور زیادہ ڈسپلن کی ضرورت ہوتی ہے جس میں شفقت اور محبت شامل ہوں۔

چھپا ہوا دشمن

شروڈر کے خیال میں مجرمانہ ذہنیت کی ایک بڑی وجہ اور بھی ہے جسے کئی گھروں اور جدید تعلیم نے بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ یہ ہیں شیطانی ارواح...... لاکھوں آدمی ایسے ہیں جنہیں ان شیطانی قوتوں کا کچھ پتا نہیں جو انسانوں میں ضرررساں رویے پیدا کرتی ہیں یعنی ایسے رویے جن کو اگر اپنا لیا جائے تو وہ مجرمانہ سرگرمیوں اور ضرررساں افعال کی طرف راغب کرتے ہیں۔

MashalBooks.org

لاکھوں انسان ایسے ہیں جو ان شیطانی قوتوں یا اس شیطان پر یقین رکھتے ہیں جس نے اپنے خالق کے خلاف بغاوت کی تھی اور جن کی مزاحمت اشد ضروری ہے۔ یہ شیطان اور اس کے چیلے ہیں۔ اگر ان کی مزاحمت نہ کی جائے تو یہ عارضی طور پر انسانوں میں داخل ہو جاتی ہیں اور ان سے غیر متوقع جرائم سرزد کراتی ہیں۔

ان شیطانی قوتوں کے اثر کے تحت وہ ابتدائی محرکات پیدا ہوتے ہیں جو مجرمانہ روش اور کئی گناہوں کا باعث بنتے ہیں اور جن کو جرائم کی روک تھام کرنے والے قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں۔

انسانوں کو متاثر کرنے والی شیطانی قوتوں کے اندر ضرر رساں اور مجرمانہ رویوں کے متعلق ہر شخص کا ردِعمل یکساں نہیں ہوتا۔ ان کے خلاف یا حق میں انسان کے ردعمل کا انحصار اس کے کاندانی تجربات، اس کے کردار کی تربیت یا معاشرے میں موجود سماجی اور ثقافتی اقدار، مجرمانہ رویے کے خلاف مزاحمت اور شخصیت اور انفرادی افتادِ طبع پر ہوتا ہے۔ کئی طبیعتیں اور شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو مجرمانہ روش کی طرف زیادہ راغب ہوتی ہیں۔

دنیا بھر میں جرائم کی روک تھام کے لئے خاندان، سکولوں اور عبادت گاہوں میں اخلاقی تعلیم و تربیت سے کہیں زیادہ انسداد کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگوں کو انسداد کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہوتی ہے۔

سزا کی ضرورت

کردار ایک آزاد اخلاقی سرچشمے کی پیداوار ہے۔ ان گھروں میں جہاں بچوں کے سامنے والدین ایک اچھی مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ بچوں کی صحیح اقدار پر پرورش کرتے ہیں، ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جو مجرمانہ حرکات کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ وہ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں وہ پکڑے ہی نہیں جائیں گے اور اگر پکڑے گئے تو سزا سے بچ جائیں گے۔

جرائم صرف اس وقت ہی ختم ہوں گے جب مجرم بننے والے ہر شخص کو یہ یقین ہوگا کہ وہ جلد اور یقینی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ مگر آج ایسا نہیں ہوتا۔ آج کل کا مجرم نوجوان پکڑا تو جاتا ہے لیکن نابالغوں کے لیے انصاف کا نظام اسے جرم کرنے کے لئے واپس گلیوں میں بھیج دیتا ہے۔ یہ نظام انصاف عادی مجرموں کی اتنی بڑی تعداد سے نپٹنے کے لئے ناکافی ہے۔ اس نوجوان مجرم کو

MashalBooks.org

جرم کرنے سے کون روک سکتا ہے جو اپنے ساتھیوں کی نظر میں انصاف کو شکست دے کر ایک ہیرو بن جاتا ہے؟

اس قوم کی اقدار اور نظام انصاف میں یقیناً کہیں ایسی خرابی ہے جس کے مجرموں کے دل میں یہ منحوس خیال بیٹھ جائے کہ جرائم منافع بخش ہیں۔

ایسی اندوہ ناک حالت کا مطلب یہ ہے کہ ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن دل ہی دل میں غیر قانونی اور مجرمانہ افعال سے اپنی زندگیوں میں فائدہ اٹھانا چاہتی ہے اگرچہ وہ اپنے آپ کو مجرم خیال کرنا پسند نہیں کرتی۔

ایسا کیوں ہے کہ مجرموں کی ایک وسیع اکثریت کو پکڑ کر جیلوں میں نہیں ٹھونسا جاتا اور انہیں جلد از جلد قرار واقعی سزا نہیں دی جاتی؟ بسا اوقات یہ اس وقت ہوتا ہے جب مجرموں کے ساتھی اور دوست اپنے اس ساتھی مجرم کے جرائم پر پردہ ڈال دینا چاہتے ہیں، ان کو معاف کر دینا اور چھپا دینا چاہتے ہیں یا ان کی غیر قانونی سرگرمیوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

جرائم کو سہارا دینا

منظّم جرائم کا خاتمہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جوئے بازی، نادہندگی، عصمت فروشی اور بددیانتی کی سرپرستی سے شہری دست کش ہو جائیں۔ منشیات کا غیر قانونی کاروبار اور اس سے پیدا ہونے والے انسانی صحت سے متعلق مسائل اور کرپشن ساری دنیا میں اس لئے موجود ہیں کہ لاکھوں لوگ منشیات کا دھندا کرنے والوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

سفید پوشوں کے جرائم اور کارخانے سے اوزاروں کی چوریوں کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ باقی لوگ بھی ایسا کرتے ہیں۔ کارکنوں کی چوریاں اور ان کی بددیانتی معاشرے میں مجرمانہ اور بددیانتی کی فضا کو تقویت دیتی ہے اور اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ رہائش گاہوں سے چوریوں کے مقابلے میں دکانوں اور کاروباری مراکز کو اپنے کارکنوں کی چوریوں سے تقریباً دس گنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ ڈاکوؤں کے مقابلے میں اپنے کارندوں کی خیانت سے کئی بینک کہیں زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ چوری کے مقابلے میں اپنے کارندوں کی خیانت سے تقریباً دس گنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔

MashalBooks.org

اگر کوئی معاشرہ واقعی جرائم کا سدباب کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ اس معاشرے کی غالب اکثریت، خصوصاً اس کے لیڈروں اور رول ماڈلز کا پایہ اخلاق بہت بلند اور مثالی ہو۔ لوگوں کو یقین ہو کہ بددیانت، دھوکے باز، تشدد پسند اور کرپٹ لوگوں کو معاشرہ ہرگز برداشت نہیں کرے گا اور اہل اقتدار اور دوسرے بااثر لوگ ان کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔ اس کے برعکس ان کو ننگا کیا جائے گا اور انہیں سزا ملے گی۔

بدقسمتی یہ ہے کہ دنیا میں ایسی صورت حال کہیں بھی نہیں۔

MashalBooks.org

تھرل کی جستجو

MashalBooks.org

ولیم ٹکر، جریدہ ویجیلنٹے (Vigilante) (1985ء) میں لکھتے ہیں:

''عام آدمی کی زندگی کی ناکامیاں اور تسکین وتفریح میں تاخیر ایک مجرم کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ معمول کی زندگی کا مقابلہ نہیں کرسکتا جس میں تنہائی ہے، تفریح کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسے ایک مجرم نے بتایا کہ بڑے خطرے مول لینا اور جرائم کی ہیجان خیز روش، جس میں محض طاقت اور چالاکی کی بنا پر منافع بھی شامل ہو، ایک ناقابلِ مزاحمت متبادل ہے۔''

جرائم کی موجودہ سائنس جس امر کو نظرانداز کررہی ہے وہ یہ ہے کہ جرم تفریح بھی ہوسکتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مجرم ہو جو اپنے بے تکلف لمحات میں یہ بات تسلیم نہ کرے کہ جرم کرنے میں اسے ایک مخصوص لذت حاصل ہوتی ہے۔

جرائم کے متعلق کئی نظریات ان امور پر مبنی ہیں کہ ایک مجرم کی خاندانی تربیت اور اقتصادی مقام مجرمانہ رویہ پیدا کرتا ہے یا اسے فروغ دیتا ہے۔ لیکن جیک کاٹز کا خیال ہے کہ مجرمانہ فعل کی دلکشی پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ مادی فوائد کی بجائے کئی لوگ اپنی نفسیاتی تسکین کے لئے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

جرائم اور ان کی انواع پر جن کا جائزہ ان سطور میں لیا گیا ہے، ہم جتنا زیادہ غور کرتے ہیں اتنا ہی یہ عیاں ہوتا ہے کہ جرائم میں اخلاقی جذبات کا برادکل ہے۔ غارت گروں اور دکانوں سے شوقیہ چوری کرنے والوں کا اگر اس وقت پیچھا کیا جائے جب وہ گلی کوچوں اور ڈریسنگ رومز میں گھستے ہیں تو اس کج روی پر ان کی سرخوشی کو دیکھ کر آپ حیرت زدہ ہوجائیں گے۔ اگر آپ ان کو

گرفتاری کی حالت میں دیکھیں تو ان کی شرمساری پر آپ کو اچنبھا ہوگا۔اگر گلیوں میں ان کو مٹک مٹک کر چلتا دیکھیں تو ان کے لئے بدی کی تمام علامات کے پر کشش ہونے پر آپ کو حیرانی ہوگی۔ یہ علامات ان نوجوانوں کو ان گروہوں سے مربوط کرتے ہیں جنہیں ہم گینگ کہتے ہیں۔

پیشہ ور مجرموں کی زندگیوں کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشے کے بڑھتے ہوئے خطرات اور ان سے حاصل ہونے والے منافع کے حساب کتاب سے بے نیاز وہ ایسے لوگ ہیں جن کے لئے جوا کھیلنا اور بدچلنی ایک طرز زندگی ہے۔اپنے مخصوص انداز میں وہ بڑے عقلمند ہیں۔ اپنی بری شہرت پر وہ فخر محسوس کرتے ہیں۔سفا کانہ قتل کے پس پردہ کارفرما نفس پرستی پر اگر ہم غور کریں تو ہم اس قوت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ جو جدید دنیا میں روحانی ابتری کے خوف سے پیدا ہوتی ہے۔

MashalBooks.org

نتیجہ

جرم ایک عمرانی تصور ہے۔ اس کا تعلق ان افعال یا فروگزاشتوں سے ہے جنہیں معاشرہ غیر قانونی قرار دیتا ہے اور جن کے لئے سزائیں مقرر ہیں۔ کئی افعال ایسے ہیں جو غیر اخلاقی ہیں لیکن وہ جرم نہیں ہیں۔ تمام جرائم کے غیر اخلاقی ہونے کے متعلق بھی کوئی متفقہ رائے نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بے شمار ایسے افراد ہیں جو قانون شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن انہیں باقاعدہ مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاتا۔ چنانچہ وہی سوال ایک دوسری صورت میں پھر سامنے آتا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ بے شمار لوگ قانون کی پابندی کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں بہت تھوڑی تعداد انحراف کی مرتکب ہوتی ہے؟ تاہم ان تھوڑے لوگوں کے ان افعال کی ناگوار حیثیت بہت زیادہ ہے اور انہیں سنگین معاشرتی مسئلہ قرار دیا جاتا ہے۔

جرائم کے اتنے اعداد و شمار اکٹھے ہو چکے ہیں جن سے جرم کی وبائی صورت (اپیڈمیالوجی) کا تعین ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جرم اکثر و بیشتر مردانہ سرگرمی ہے۔ عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں شرح جرائم بہت بلند ہے۔ کچھ معاشرے ایسے بھی ہیں جیسے سری لنکا یا الجزائر جہاں یہ تناسب کئی ہزار کے مقابلے میں صرف ایک ہے۔ لیکن ایسے معاشروں میں جہاں عورتوں کو کافی آزادی حاصل ہے اور انہیں مردوں کے برابر سمجھا جاتا ہے، یہ شرح دس کے مقابلے میں ایک ہے۔ معاشرے کے نچلے طبقے اور بڑے شہروں کے نوجوانوں میں شرح جرائم سب سے زیادہ ہے۔

جرائم کے متعلق نظریے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اختلافات اور تنوع کی تشریح

MashalBooks.org

کرے۔ جو نظریہ یہ کہتا ہے کہ جرائم کی وجہ غربت ہے وہ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ عورتوں میں شرح جرائم اتنی کم کیوں ہے۔

کچھ نظریات مجرموں کی جسمانی خصوصیات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ان حیاتیاتی نظریات کا ماخذ لومبراسو کے خیالات میں جن کے مطابق جسمانی نقائص کسی شخص کے مجرمانہ کردار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایسے خیالات بھی پیش کئے گئے ہیں جن کے مطابق مجرمون کے ذہن میں کچھ نقائص ہوتے ہیں یا ان میں ذہانت کی کمی ہوتی ہے۔ لیکن حالیہ جائزوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجرم دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہوتے۔ نفسیاتی نظریات نے مجرمانہ افعال کی سزا کے لئے غیر شعوری خواہش یا دبی ہوئی جارحانہ یا جنسی خواہشات کے ذریعے تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بھی جنس، طبقے، نسل یا ماحولیاتی تنوع یا عارضی اور زمانی تبدیلیوں کی تشریح کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

یہ تمام نظریات اپنی توجہ مجرم پر مرکوز کرتے ہیں لیکن دوسرے تغیر پذیر عوامل کو پیش نظر نہیں رکھتے جیسے وہ حالات جن میں مجرم نے ارتکاب جرم کیا۔ یہ نظریات یہ وضاحت بھی نہیں کرتے کہ اپنے مسائل کے حل کے لئے کچھ لوگ مجرمانہ یا غلط رویہ کیوں اختیار کرتے ہین۔ چنانچہ معاشرتی یا عمرانی علم ایسی تشریحات کی جستجو میں ہے جو مجرمانہ افعال کی بھی ایسے ہی تشریح کرے جیسے وہ غیر مجرمانہ افعال کی کرتا ہے اور کسی معاشرتی نظام میں افراد کے کردار کا کھوج لگائے اور ان کو متاثر کرنے والے دباؤ، جرائم کی علیات اور ان کی وبائی صورت کی وضاحت کرے۔

ایسی ہی ایک تشریح کا آغاز اس امر سے ہوتا ہے کہ تمام معاشروں میں ایک ایسی تفاعلی ضرورت موجود ہے جو اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ افراد آپس میں مل جل کر رہیں اور اس کردار کو اپنائیں جو معاشرہ ان کے لئے متعین کرتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے معاشرہ انہیں ضروری محرکات بھی فراہم کرے۔

یہ نقطہ نظر محرکات اور تعلیم پر مرکوز ہے اور افراد کے انحرافات کی تشریح کرتا ہے۔ ایک فرد کے لئے مسئلہ یہ ہے کہ اس کے لئے معاشرے کے متعین کردہ کردار اور اپنی شخصیت کے درمیان کیسے ہم آہنگی پیدا کرے۔ اس نظریے سے مردوں کے انحرافات کی کئی صورتوں کی تشریح ممکن ہے۔ تمام صنعتی معاشرے متشدد ہونے، جرات مند ہونے اور مہم جو ہونے کو مردانگی کے اجزائے

MashalBooks.org

ترکیبی شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لڑکا جو شغل کی خاطر چوری کرتا ہے (اور نابالغوں کی کافی سے زیادہ غلط کاری اسی ذیل میں آتی ہے) دراصل اپنی مردانگی کو منوانے اور اس کے اظہار کے لئے کرتا ہے۔ اس کے برعکس لڑکیاں بڑی سمجھ داری سے واردات کرتی ہیں۔ وہ کپڑوں، تزئین کے سامان، زیورات اور اپنے استعمال میں آنے والی اشیا چوری کرتی ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جرائم کے محرکات بہت ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک ایسا محرک نہیں ہے جو جرائم کے مسئلے کی پوری پوری تشریح کر سکے۔ جس طرح اس دنیا کے لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح معاشرے کے ہر فرد پر مختلف محرک کام کرتا ہے۔ کوئی اپنے حیاتیاتی ورثے کی بنا پر جرم کی طرف راغب ہوتا ہے تو کوئی اپنی غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ارتکاب جرم کرتا ہے۔ کسی کو معاشرے کی عدم مساوات کھٹکتی ہے اور وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسے کوئی اور راستہ نہیں ملتا تو وہ جرم کا ارتکاب کر کے معاشرے سے بدلہ چکا لیتا ہے۔ دوسرا اپنی اخلاقی کمزوری کی بنا پر جرم کی طرف رجوع کرتا ہے۔

MashalBooks.org

سزائیں

جیل

جیل کا متبادل

بحالی

جرم کا معاوضہ

MashalBooks.org

ابتدائیہ

جرمیات کے علم کی ترقی کے ساتھ یہ تصور ابھرا کہ مجرم بیمار لوگ ہوتے ہیں یا وہ سماجی محرومی کا شکار ہوتے ہیں، اس لئے سزا دینے کی بجائے ان کا علاج کرنا چاہیے۔ اس خیال کے حامی کارل میننجر (Karl Manenger) جیسے ماہر نفسیات کو یقین ہے کہ جرم کے متعلق یہ نیا سائنسی انکشاف سزا کو ایک زائد المیعاد اور دقیانوسی تصور بنا دیتا ہے۔ چنانچہ امریکہ اور چند دوسرے ملکوں میں بحالی کے اس نظریے پر یقین کی بنا پر جیلوں کی اصلاح کے کئی پروگرام شروع کئے گئے ہیں جن کا مقصد مجرموں کو بحالی کے بعد معاشرے میں دوبارہ داخل کر کے انہیں ان کا قانونی مقام دلانا تھا۔

مگر 1970ء کے بعد امریکہ ہی میں اس نظریے پر بڑی تنقید ہوئی۔ جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار نے نفسیاتی طریق کار کی افادیت کو مشکوک بنا دیا۔ کئی خصوصی مطالعات سے معلوم ہوا کہ مجرموں کو دوبارہ معاشرے کا رکن بنانے کا کوئی طریقہ کامیاب نہیں ہو سکتا رابرٹ مارٹنسن (Martinson) کے مطالعے سے یہ مشہور نتیجہ نکلا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ سزا اور دوبارہ بحالی کے مقاصد کے درمیان کشمکش کتاب کے اس حصے میں زیر بحث آئی ہے۔

MashalBooks.org

جیل میں سزا بھگتنی ضروری ہے

(رابرٹ جانسن)(Johnson)اور جیکسن ٹوری(Jackson Tory) دونوں کا خیال ہے کہ مجرموں کو جیل کی سزا بھگتنی چاہیے۔اس لئے جیلوں پر تنقید بھی ہوتی ہے کہ ان میں حفظان صحت کا مناسب انتظام نہیں ہوتا اور ان میں گنجائش سے زیادہ قیدی رکھے جاتے ہیں۔جیلوں کو بند کر دینا چاہیے اور صرف ابتدائی سزاؤں کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔مگر ان دونوں محققین کی نظر میں جیلیں بہت مفید ادارے ہیں اور مجرموں سے بڑی نرمی برت سکتے ہیں۔

سزاؤں کے ذریعے مجرموں کی پھر سے آباد کاری ایک قابل احترام اور مقبول مقصد تھا لیکن اب اس کے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔آج کل ہم مجرموں کو انصاف پر مبنی ایذا دیتے ہیں اور اس پر سزا کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ بہت پہلے افلاطون نے کہا تھا کہ ایک منصفانہ سزا کا مقصد ہمیشہ مجرم کی اخلاقی تربیت اور ذاتی اصلاح ہونا چاہیے۔سزا کے بعد مجرم کو ایک بہتر انسان ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو اسے کم سے کم آفت زدہ شخص کے طور پر معاشرے میں واپس آنا چاہئے۔ افلاطون کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کسی کو ناکارہ کرنے والی اور نقصان پہنچانے والی ایذا کی بجائے اذیت کا عنصر صرف اتنا ہونا چاہیے جس سے مجرم کی اصلاح ہو جائے۔ اگر جیلیں ہی منصفانہ سزا کے مقامات ہیں تو جیل میں بند ہونے کی اذیت پھر سے بحالی کا ذریعہ ہونی چاہیے۔

قیدیوں کے لئے جیل میں وقت کاٹنا مشکل ہوتا ہے لیکن یہ تو جیل کا فطری تقاضا ہے کہ قیدی مشکل سے دو چار ہوں۔اگر چہ جیل میں قیدیوں کو دیرپا نقصان نہیں پہنچتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جیل میں بہت کم مجرموں کی اصلاح ہوتی ہے۔سلاخوں کے پیچھے رہتے ہوئے بہت کم لوگ

کوئی مفید کام سیکھ سکتے ہیں۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ناقص طریقے سے جیل کی فضا سے ہم آہنگ کرتے ہیں اوراس سے ان کو جیل بھیجنے کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔رہا ہونے پر وہ بہتر انسان نہیں بنتے۔بعض اوقات تو وہ بدتر انسان بن کر نکلتے ہیں۔

لیکن جیل میں قیدی ایک شائستہ اور مہذب زندگی بسر کر سکتے ہیں اور آزاد ہونے کے بعد وہ معاشرے میں ایک شائستہ اور مہذب زندگی گزار سکتے ہیں۔دوسرے الفاظ میں جیل جانا یا قید ہونا ایک اصلاحی اور تعمیری تجربہ ہے۔تاہم جیلوں سے ہمیں کوئی زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرنی چاہئیں مگراس سے کم پر سمجھوتا بھی نہیں کرنا چاہئے۔

اصلاحی پناہ گاہ

یہ درست ہے کہ جیل میں بند لوگوں کی ایک بہت معمولی اقلیت جیل کی مشکلات سے عہدہ برآ ہوسکتی ہے۔ان قیدیوں کی مدد کی جاسکتی ہے۔جو ایسا نہیں کر سکتے۔وہ قیدی جو جیل کی زندگی سے تسویہ کر لیتے ہیں جیل میں اپنے لئے ایک گوشہ تعمیر کر لیتے ہیں جو دوسروں کے لئے بھی کارآمد اور مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔جیل کی بدترین زندگی میں یہ پناہ گاہیں بن جاتی ہیں۔اپنے مسائل حل کرنے کے لئے یہاں ریہرسل کی جاسکتی ہے۔ایسے مقامات بارآوری کی جگہیں ہیں پہلے جیل میں اور پھر آزاد دنیا میں۔رونلڈ جے۔پاول (Ronald J. Powell) (مانچیسٹر یونین لیڈر، 18 مارچ 1987ء میں) جیلوں کی ضرورت پرزور دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

''بے حس، مہیب اور سنگلاخ حقائق سے چھٹکارا مشکل ہے۔جیل ان سوالات کا مکمل جواب نہیں اور نہ ہی یہ آخری حل ہے۔لیکن مناسب جیلیں منصفانہ ہونے سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔یہ ایک ناگزیر حقیقت ہیں۔جیلوں میں مزید گنجائش پیدا کرنے سے گریز ان کی اشد ضرورت کو پورا نہ کرنے سے زیادہ خطرناک ہے۔''

قیدیوں کو ایسی پناہ گاہیں مہیا کی جاسکتی ہیں۔ایسا کرنے کے لئے ان کی حراست کی سطح اور ان کی اصلاح کے پروگراموں کے پیشِ نظر ان کے حالات کے ساتھ تسویہ کرنے کی صلاحیت کے مطابق قیدیوں کی درجہ بندی ضروری ہے۔انہیں ایسا اثر پذیر ماحول مہیا کرنا چاہیے جو جیل کے دباؤ کے مطابق ہو۔دوران حراست قیدیوں کے ماحول کے خلاف یا حق میں ردِعمل کا جائزہ

MashalBooks.org

بھی لیتے رہنا چاہیے۔ اگر چہ یہ منصوبہ بہت بڑا ہے لیکن اسے پورا کرنے کے لئے وسائل دستیاب ہوسکتے ہیں۔ قیدیوں کی درجہ بندی کے ایسے نظام موجود ہیں جو قیدیوں کو ایسے گروہوں میں بانٹ دیتے ہیں جن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ہم جیل کی زندگی کے پورے کوائف سے بھی واقف ہیں اور ہمارا عملہ خصوصاً اصلاح کرنے والے افسران لوگوں کو زیر مشاہدہ رکھ سکتے ہیں اور قید کے دوران تسویہ کرنے میں ان کی مدد بھی کرسکتے ہیں۔ ان کی صف بندی اور نگرانی کرنے کا ایسا نظام فراہم کیا جاسکتا ہے جو کسی مخصوص جیل کو ایک اچھی پناہ گاہ میں تبدیل کردے۔

بجٹ کے اندر رہ کر جیل میں ان پناہ گاہوں میں تعلیمی، پیشہ ورانہ اور شفا بخش پروگرام چلائے جاسکتے ہیں۔ جیلوں کے ماحول کو قیدیوں کے تمام ملنے جلتے گروپس کے لئے ایک بامعنی خدمت بجالانی چاہیے۔ خصوصی مسائل کے لئے خصوصی ماحول تیار کرنا چاہیے۔ جیل کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ قیدیوں کو اچھے شہری بننے کے لئے ریہرسل کرنے کے مواقع فراہم کرے۔ ایسا خصوصاً ایسے گروہوں کے لئے ہونا چاہئے جن کا تعلق قلیل آمدنی والے طبقے، زیادہ جرائم کرنے والوں اور واضح طور پر ایسے حالات سے ہو جہاں سے یہ قیدی آئے ہوں اور جہاں ان کی اکثریت کو واپس جانا ہے۔

قید کی اذیت بحالی کا ایک ذریعہ ہوسکتی ہے۔ دراصل چیلنج ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جن سے جیل کی مصیبت کے ذریعے نشوونما ممکن ہوسکتی ہے۔ ایسے چیلنج ضرور قبول کرنے چاہئیں۔ ان لوگوں کے لئے جو قید کی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں قید کی مشکل وقت بڑا تعمیری ہے اور یوں جیل کی زندگی موزوں اور اچھی ہوسکتی ہے۔

جیلوں کی شہرت بہت بری ہے۔ زنا بالجبر، قتل، یرغمال بنانا اور گنجائش سے زیادہ لوگوں کو جیل میں ٹھونسنے کی بہت سی کہانیاں ہیں۔ جیلوں سے رہائی کے جوڈیشل احکام یا جیل میں ظالمانہ سلوک اور غیر معمولی سزاؤں کی کہانیوں کی بھی کافی افراط ہے۔

کیا جیل میں افسروں کے ظلم کا کوئی خاص انداز ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جیلوں میں تشدد کے واقعات میں ملوث خود قیدی ہوتے ہیں۔ جیل کے افسروں کا رویہ بڑا پیشہ ورانہ ہوتا ہے۔ اٹھارویں صدی تک جیلیں بہت کم تھیں اور سرکاری تشدد کو بطور ایک اصول کے قبول کیا جاتا تھا۔ سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو غلام بنالیا جاتا تھا یا ان کو بڑے بہیمانہ طریقے سے قتل کردیا

MashalBooks.org

جاتا تھا۔ امریکی ریاست شمالی کیرولائنا میں حرام کاری کو شامل کر کے کم از کم تیں جرائم کی سزا موت تھی۔

جیلیں سنگین سزاؤں کا متبادل ہیں

صرف دوسوسال پہلے جیلیں سنگین سزاؤں کے لئے بنائی گئی تھیں۔ زندان خانے ایک ہزار برس سے چلے آ رہے تھے۔ حاکم وقت شورش پسند لوگوں کو زندان میں بند کر دیتا تھا۔ یہ زندان خانے جیلیں نہیں تھیں اور جیلیں بھی قید خانے نہیں تھے۔ ملزموں کو جیلوں میں اس لئے رکھا جاتا تھا کہ عدالتی کارروائی کے وقت وہ حاضر رہ سکیں۔ مقروض لوگوں کو بھی قرض کی ادائیگی تک جیلوں میں رکھا جاتا تھا۔ لیکن سزا کے طور پر کسی کی آزادی سلب کرنے کے خیال کی حمایت بینجمن فرینکلن کے زمانے تک نہیں ہوئی تھی۔

امریکہ کے ڈاکٹر بنجمن رش نے، جو اعلان آزادی پر دستخط کرنے والوں میں سے تھا اور ایک نمایاں طبیب تھا، اپنے گھر 9 مارچ 1787ء کو کویکر عقیدے کے چند دانشوروں کے سامنے ایک مقالہ پڑھا۔ اس نے اس میں روایتی جسمانی سزاؤں کے بجائے آزادی سلب کرنے کا (قید تنہائی) اور بائبل کے مطالعے کے ذریعے تائب ہونے کا خیال پیش کیا۔ اس خیال کی بنا پر پنسلوینیا پرزن سوسائٹی قائم ہوئی جہاں توبہ تائب کرنے کا عمل شروع ہوا تا کہ وہاں قانون شکن لوگوں کی بحالی ہو سکے۔

انیسویں صدی تک امریکی جیلیں اس انسان دوستی کے سطح تک نہ پہنچ پائیں۔ اکثر جیلوں میں لوگوں کو من مانے قانون نافذ کرنے کے لئے سخت اذیت ناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ نیویارک کی آبرن جیل میں قیدیوں کو آپس میں بات چیت کرنے کی ممانعت تھی۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کوڑے مارے جاتے تھے۔ انہیں فرش کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیا جاتا تھا یا بغیر روشندان کے کسی کھڈے میں بند کر دیا جاتا تھا۔ جب وہ زنجیروں کے ساتھ دیوار سے بندھے ہوئے برہنہ حالت میں ہوتے تھے تو انہیں زور دار دباؤ والی پانی کی دھار کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ قیدیوں کو ریاست کا غلام سمجھا جاتا تھا۔

انیسویں صدی کی امریکی جیلوں کے مقابلے میں آج 167 اقوام میں سے چند ایک کو چھوڑ

MashalBooks.org

کر امریکی جیلیں پرتعیش مقامات ہیں۔ سونے کے لئے ننگے فرش کی بجائے گدے، برتنوں کی بجائے غسل خانے، اچھا صحت مند کھانا، گرم کمرے اور ورکشاپیں، وکیلوں تک رسائی، لائبریری، ٹیلیفون، قانون امداد، جیل کی انتظامیہ اور مشکلات کے ازالے کے مواقع، یہ سب کچھ امریکی قیدیوں کو میسر ہے۔

آج کل امریکی جیلوں میں قیدیوں کو تفریح، پیشہ ورانہ تربیت اور تعلیم کی سہولتیں بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ دن کے وقت کالج جانے کی سہولت بھی دی جاتی ہے۔ ان تمام سہولتوں پر سخت حفاظت والی جیلوں میں اس سے ذرا کم خرچ اٹھتا ہے جو ٹیکس ادا کرنے والے برداشت کرتے ہیں۔ سب سے بڑی سہولت افسروں کے ظلم سے نجات ہے۔ قیدی ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں لیکن جیل کے محافظ بیچ بچاؤ کر دیتے ہیں۔

آج کل کی امریکی جیلیں کوئی من مانا قانون نافذ نہیں کر سکتیں اور نہ ہی کسی معقول قانون کا من مانے طریقے سے اطلاق کر سکتی ہیں کیونکہ وفاقی حکومت اور عدالتیں انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے ہر وقت مداخلت کرتی رہتی ہیں۔ شہری حقوق کی بحالی کے انقلاب کے پیشِ نظر، جو 1960 میں زور پکڑ گیا تھا، وارڈن اور محافظ اپنی مرضی نہیں چلا سکتے۔ 1978ء تک جس کے اعداد وشمار دستیاب ہو سکے ہیں، وفاقی عدالتوں میں قیدیوں کی طرف سے شہری حقوق کے تحت 8720 مقدمات چل رہے تھے۔ جیلوں کے افسران ان الزامات کے خلاف اپنی مدافعت میں کافی وقت صرف کرتے ہیں۔ الزامات یہ ہوتے ہیں کہ جیل کے افسروں کی انتظامی کارروائیوں سے امریکی آئین کی چوتھی، آٹھویں اور تیرھویں ترمیم میں عطا کئے گئے حقوق کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ عدالتی مداخلت کے خطرے نے ڈاک کی سہولتوں، پریس کو انٹرویو اور مذہبی عبادات پر پابندیوں کو کم کر دیا ہے۔ اب قیدی اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے آسانی کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ قیدی کی کوٹھڑی، جسمانی تلاشی اور دوسری جیلوں میں منتقلی پر امریکی عدالتیں متواتر نظر ثانی کرتی رہتی ہیں۔ انہوں نے طبی اور دانتوں کی حفاظت، خوراک، تنہائی، نہانے کے لئے شاور، گرمی اور دوسری سہولتوں کے معیار مقرر کر دیے ہیں جن کی غیر موجودگی امریکی عدالتوں کی نظر میں ظالمانہ اور غیر معمولی سزا کے مترادف سمجھی جا سکتی ہے۔

تیسری دنیا میں قانون شکنی کرنے پر امریکیوں کو قید ہونے پر پتا چلتا ہے کہ مہذب جیلوں کو

MashalBooks.org

چلانا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔43ایسے ملک ہیں جن کا جی این پی(GNP) فی کس500ڈالر یا اس سے کم ہے جیسے کہ نیپال اور پاکستان ہیں۔ یہ امریکی جیلوں جیسے پروگرام نہیں چلا سکتے اور نہ ہی قیدیوں کو وہ سہولتیں مہیا کر سکتے ہیں جو امریکی جیلوں میں ملتی ہیں۔غریب ملکوں میں یہ دستور ہے کہ قیدی کا خاندان ہی اسے خوراک مہیا کرتا ہے۔ایسا قیدی جس کے دوست یا رشتے دار نہیں ہوتے فاقوں مر سکتا ہے۔علاج معالجے کے سلسلے میں تو بہتر یہی ہے کہ قیدی بیمار ہی نہ پڑے۔

لیکن جی این پی ایک مہذب قید کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا۔روس کے لیبر کیمپ اور سائی کیڑی جیل خانے جسمانی سزاؤں اور برین واشنگ کے لئے بدنام ہیں۔سیاسی قیدیوں کے مقابلے میں قاتلوں اور ڈاکوؤں پر کم ظلم کیا جاتا ہے۔یہ بھی بہت بڑا ظلم ہے۔

MashalBooks.org

جیلوں کا متبادل

فکری ادارے رینڈ کارپوریشن کے کریمنل جسٹس پروگرام میں پروگرام آفیسر جون پٹیر سیلیا کی رائے ہے کہ امریکہ میں پانچ لاکھ سے زیادہ لوگ جیلوں میں بند ہیں اور ان پر ہر سال دس بلین ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں۔ ان اعداد و شمار کے باوجود کچھ لوگوں کو یقین ہے کہ جرائم کم نہیں ہو رہے اور وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جیلیں غیر موثر ہیں۔ وہ تجویز کرتے ہیں کہ جیل بھیجنے کی بجائے متبادل سزائیں دینی چاہئیں جیسے کہ کمیونٹی خدمات۔

سوال یہ ہیں:

کون سے عوامل جیلوں کے مقابلے میں وسیع تر متبادل راستے اختیار کرنے سے روکتے ہیں؟

جیل کے متبادل طریقوں کے کیا فائدے ہیں؟

جیلوں کے غیر معیاری ہونے کی وجوہات کیا ہیں؟

جیل کی سزائیں حکومت کے وسائل پر شدید دباؤ ڈالتی ہیں۔ کئی ریاستوں میں جیلوں پر اخراجات کے لئے کئی مفید کام روک دیے جاتے ہیں اور یوں جو پیسہ بچتا ہے وہ جیلوں میں خرچ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کیلیفورنیا میں جیلوں کے بڑھتے ہوئے اخراجات نے غریبوں کے لئے طبی خدمات اور تعلیم پر اخراجات کو 200 ملین ڈالر سے کم کر دیا ہے۔

اس خطیر رقم کے خرچ کرنے کے باوجود امریکی جیلیں اپنی گنجائش سے دس فیصد زیادہ کام کر رہی ہیں اور پھر بھی امریکہ میں جرائم پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ پچھلے پندرہ برسوں میں قیدیوں کی تعداد دوگنی ہو چکی ہے۔ پھر بھی پرتشدد جرائم کی شرح بڑھتی جا رہی ہے۔ آزمائش کے طور پر

MashalBooks.org

رہا ہونے والوں کی شرح قیدیوں سے کہیں زیادہ ہے اور ان میں سے نصف بڑے مجرم بن چکے ہیں اور کئی پرتشدد جرائم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔

قاتلوں کے لئے جیلوں میں جگہ کی کمی

یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے کہ ججوں کے پاس سوائے جیل بھیجنے یا آزمائش پر رہا کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں۔ سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو طویل مدت کے لئے قبول کرنے کی جیلوں میں کوئی گنجائش نہیں۔ ان لوگوں کو پروبیشن یا پیرول پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ان کی تعداد اتنی ہو چکی ہے کہ پروبیشن یا پیرول افسروں کے پاس ان کی موثر نگرانی کے لئے وقت نہیں ہے۔ نگرانی صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ پیرول افسر مہینے میں صرف ایک مجرم کو دیکھ سکتا ہے۔ ماضی کے مقابلے میں جیل میں قید رہنے کا اوسط وقت کم ہو گیا ہے۔ ماضی میں یہ مدت 18 ماہ تھی جو کم ہو کر صرف 12 ماہ رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ شاید جیلوں میں مزید قیدیوں کے لئے جگہ کی کمی ہو۔

اکثر امریکن اس بات پر متفق ہیں کہ اس معاملے کو کسی نہ کسی طرح سلجھانا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ ریاستیں جیلوں کے متبادل پروگراموں پر تجربات کر رہی ہیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب بیشتر لوگوں کا اصرار تھا کہ جرائم کو سختی کے ساتھ دبانا چاہیے۔ ایسے اصرار کے پیش نظر سیاسی طور پر ان تجربات کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن جرائم کی رفتار بڑھنے سے، لازمی سزاؤں کے قوانین، کئی ریاستوں میں، جیلوں کے احوال کو غیر قانونی قرار دیتے تھے۔

اگرچہ ستر کی دہائی کے وسط سے جیلوں پر اخراجات ہر سال دس فیصد بڑھ رہے ہیں لیکن امریکہ کی 27 ریاستوں میں عدالتیں جیلوں میں گنجائش کے متعلق احکام صادر کر چکی ہیں۔ چونکہ نئی جیلیں تعمیر کرنا ریاستوں کے مالی وسائل پر بوجھ ہوگا اس لئے ٹیکس ادا کرنے والے جیلوں کے متبادل پروگراموں کے متعلق سوچنے پر رضامند ہیں بشرطیکہ ان کے ذریعے جرائم پر قابو پایا جا سکے اور مجرم کو قرار واقعی سزا ملے۔

ان پروگراموں کی وجہ سے سزاؤں کے تصورات اور انتخاب میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں گی یا جیلوں میں گنجائش نہ ہونے کے مسئلے کا فوری حل ہوگا۔ ماضی میں بڑے عرصے سے اس قسم کی بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔ اگرچہ یہ پروگرام عارضی نوعیت کے ہی کیوں نہ ہوں،

مجرموں کی اصلاح کے فلسفے میں تبدیلی کا یہ ایک اہم موقع فراہم کریں گے۔

بیشتر پروگراموں کا دارومدار لوگوں پر ہے لیکن روایتی آزمائشی رہائی سے یہ بڑے مختلف ہیں۔ سزایافتہ مجرم لوگوں میں بھی کڑی نگرانی میں رہتا ہے۔ اس کا فائدہ دوہرا ہے۔ اسے سزا دینا اور مزید جرائم کے ارتکاب سے روکنا۔ ان پروگراموں میں شدید نگرانی کے تحت آزمائشی رہائی اور الیکٹرانک مشینوں کی زیرنگرانی گھر ہی میں نظربندی سے لے کر خوف دلانے کے لئے تھوڑے عرصے کے لئے جیل بھیجنا شامل ہیں۔ لیکن اکثر پروگراموں کا مقصد مجرموں کو ملازمتیں فراہم کرانا، سکول بھجوانا، خدمت خلق کرنا اور مدعیوں کو ان کے نقصان کا معارضہ ادا کرنا ہے جو اس مجرم کے ہاتھوں انہوں نے اٹھایا۔ پروگرام افسر بغیر اطلاع دیے ایسے مجرموں کے پاس اچانک پہنچ جاتے ہیں اور انہیں منشیات کے ٹیسٹ سے بھی گزارتے ہیں۔

MashalBooks.org

بحالی

MashalBooks.org

فرانسس ایلین نے انکم ٹیکس اور سکیورٹی کی خلاف ورزی کے لئے تین ماہ جیل میں گزارے اور سزا کے طور پر پندرہ گھنٹے کمیونٹی خدمت کی۔ اس نے اپنا وقت ڈیزائننگ اور مجرموں کی امداد کرنے والے گروہوں کی سربراہی کرتے گزارا۔ وہ اس تجربے سے گزر چکی ہیں۔ ان کے خیال میں "یہ دل کے شدید دورے سے بحالی کی طرح ہے۔ تم اپنے آپ کو کیسے بحال کر سکتے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ جرم سے شرم، پشیمانی اور عزت نفس کے احساس زیاں سے کیسے نمٹا جاسکتا ہے جو برباد ہو جاتے ہیں۔"

ان درمیانی قسم کی سزاؤں میں امریکی قوم کی دلچسپی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہ قابل فہم ہے۔1985ء میں صرف دو آدمی گھروں میں نظر بند اور الیکٹرانک طریقے سے زیرنگرانی تھے۔ آج ایسے پچاس لوگ ہیں۔ جیل کے مقابلے میں ایسے پروگرام سستے ہیں۔ گھر میں نظر بندی کی لاگت 500 سے8000 ڈالر بنتی ہے یعنی انہیں جیل میں ڈالنے سے دس ہزار ڈالر کم۔ مزید براں چونکہ ان لوگوں کو کام کرنا پڑتا ہے اس لئے وہ مقامی اور حکومت کے ٹیکس بھی ادا کرتے ہیں اور ان کے خاندانوں کو ویلفیئر (Welfare) کی رقم بھی ادا نہیں کرنی پڑتی جو اکثر ایسے خاندانوں کو ملتی ہے جن کے سربراہ جیل چلے جاتے ہیں۔

ان طریقوں کے سخت اور سستا ہونے کے باوجود ان پر تنقید کرنے والے بھی بہت ہیں۔ بیشتر مجرموں کی اصلاح آزمائشی رہائی اور پیرول افسروں کی نگرانی میں کمیونیٹی میں ہی ہو جاتی ہے۔ لیکن روایت پسند لوگ سمجھتے ہیں کہ سنگین جرائم کے لئے، (اگرچہ سنگینی کی تعریف امریکہ کے

مختلف حصوں میں مختلف ہے) جیل سے کم سزا نہیں ہونی چاہیے۔ ان کی رائے میں یہ پروگرام خواہ کتنے ہی سخت ہوں وہ جرم کی سنگینی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ ایسی تنقید پر بڑی احتیاط سے غور کی ضرورت ہے۔ تاہم اصلاح کرنے اور سزا دینے کے لئے یہ تنقید کوئی جواز پیش نہیں کرتی۔

ان متبادل طریقوں کو اس معیار پر پرکھا جانا چاہئے کہ یہ کس حد تک لوگوں کو جرائم سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ابھی تک ایسے پروگراموں کے تحت آنے والے مجرموں میں سے دس فیصد سے کم مجرموں کو دوسری بار سزا ملی ہے۔ ان کے جرم خفیف ہی تھے۔ اس کے مقابلے میں روایتی آزمائش پر آنے والے اور جیلوں سے چھوٹے ہوئے مجرموں کی 50 فیصد تعداد جرائم کا دوبارہ ارتکاب کرتی ہے۔ یہ متبادل طریقے نہ صرف سستے ہیں بلکہ یہ جرائم کا زیادہ موثر طریقے سے انسداد کرتے ہیں۔ بہرحال ان نتائج پر غور کرنے کے لئے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

املاک کے خلاف جرائم

چونکہ یہ پروگرام ابھی تجرباتی سطح پر ہیں، امریکی جج ایسی سزائیں دینے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اکثر پروگرام صرف املاک کے خلاف ایسے جرائم تک محدود ہیں جن میں مجرموں کا سابقہ ریکارڈ بہت معمولی ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ طریق کار گرفتاری کی کم تر شرح کی بھی تشریح کرتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی شہادت نہیں جس کے مطابق بیشتر مجرموں کو (جن میں تشدد والے مجرم بھی شامل ہیں) ایسے پروگراموں میں شامل کیا جائے تاہم ایسے شواہد موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ کن ریاستوں میں ایسے مجرم موجود ہیں۔ اور سارے ملک میں نصف سے زیادہ مجرم املاک اور مفاد عام کے جرموں میں ملوث ہیں۔ ان میں سے بیشتر ان پروگراموں کے تحت آنے والے مجرموں جیسے ہیں۔

سزاؤں کے ان متبادل طریقوں کو اپنانے سے حکومت مجرموں کی اصلاح پر خرچ میں بری بچت کر سکتی ہے اور ساتھ ہی نئی جیلیں تعمیر کرنے یا موجودہ جیلوں کو توسیع دینے کے اخراجات سے بچ سکتی ہے۔ ان پروگراموں سے جرائم کی شرح میں بھی کمی ہوگی۔ اس کا زیادہ فائدہ جیلوں میں زیادہ سنگین جرائم میں سزا یافتہ لوگوں کی گنجائش کی صورت میں ہوگا۔ دوم املاک کے خلاف جرائم کرنے والے لوگوں کو آزمائشی رہائی کی بجائے ایسے پروگراموں کے تحت لانا زیادہ کامیاب

طریقہ ہے۔ابھی تک کے شواہد بتاتے ہیں کہ متبادل پروگرام جیل کی سزایا آزمائشی رہائی پر رکھنے سے زیادہ کارآمد ہیں۔

سستے اور بہتر

مختصراً یہ پروگرام قید کرنے سے زیادہ کم خرچ ہیں۔آزمائش کے روایتی طریقوں کے مقابلے میں جرائم کا بہتر طریقے سے انسداد کرتے ہیں اور مجرموں کو معاشرے میں دوبارہ داخل ہونے کے لئے بہتر طریقے سے تیار کرتے ہیں۔تاہم ابھی متناسب سزا کے لئے تشویش موجود ہے۔یہ پروگرام مجرموں کو محبوس نہیں کرتے اور نقاد یہ سمجھتے ہیں کہ سزا اور جرم میں کوئی تناسب نہیں ہے۔

اس معاملے کا مضحکہ خیز پہلو یہ ہے کہ ایک سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والے کا قانون کی پابندی کرنے والے شہری کی نسبت سنگین سزا کا تصور کہیں زیادہ شدید ہے۔کئی مجرموں نے ایسے کئی پروگراموں کی مزاحمت کی ہے۔کمیونٹی کے اندر زیرنگرانی رہنے پر مجرم جیل جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔امریکی ریاست آریگان کے ایک تجرباتی پروگرام میں نصف سے زیادہ مجرموں نے متبادل سزا پر جیل کو ترجیح دی۔اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ کچھ مجرموں کی نظر میں جیل کے مقابلے میں متبادل سزا زیادہ سنگین ہے۔

تجزیہ بتاتا ہے کہ جرم اور سزا کا کوئی فوری حل یا آسان جواب موجود نہیں۔لیکن بڑی مشکلوں کے بعد یہ ضرور نظر آیا ہے کہ صرف زیادہ جیلیں تعمیر کرنا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔امریکہ میں ایک جائزے کے مطابق جیل کی بجائے متبادل طریقوں کو لوگوں کی زبردست تائید حاصل ہے جس کی بنیاد اس یقین پر ہے کہ معاشرے کو نئی راہیں تلاش کرنی چاہئیں کیونکہ پرانے طریقے زیادہ مہنگے ہونے کے علاوہ جرائم پر قابو پانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔

جرم کا معاوضہ

MashalBooks.org

سزا کے متعلق تیسرا نظریہ چارلس کولسن (Charles Colson) کا ہے۔ کولسن 1969 سے 1972 تک امریکہ کے صدر رچرڈ نکسن کے خصوصی مشیر تھے اور واٹر گیٹ سکینڈل میں انہیں سات ماہ کی سزا ہوئی تھی جو انہوں نے جیل میں کاٹی۔ اس لحاظ سے ان کے خیالات ذاتی تجربات ومشاہدات پر مبنی ہیں اور ان کے نظریات کو ایک ذہین آدمی کے نظریات سمجھنا چاہیے۔ یہ صاحب اب عیسائیوں کی ایک تنظیم پریزن فیلوشپ کے چیئرمین ہیں۔

امریکی جیلوں کو جرائم کا گریجوایٹ سکول کہا جاتا ہے۔ بات بڑی معقول لگتی ہے۔ ان کے خیال میں کچھ لوگوں کی املاک اور ان کی خلوت چھین لو، ان کو مسلسل ڈراؤ، دھمکاؤ اور لوگوں سے بھری ہوئی کوٹھڑیوں میں بند رکھو اور کسی مفید کام سے محروم کر دو تو اس کے نتیجے میں وہ ایک ایسے نچلے طبقے میں تبدیل ہو جائیں گے جو تلخی سے بھرا ہوا ہوگا اور معاشرے میں کوئی مفید کام کرنے کی بجائے اس سے بدلہ لینے پر تل جائے گا۔ اگر جیل میں ایک تشدد نہ کرنے والا مجرم جاتا ہے تو جیل اسے ہر وقت تشدد پر آمادہ شخص بنا کر باہر بھیج دیتی ہے اور پھر اس کی گزر اوقات تشدد پر ہی ہوتی ہے۔ جیل تشدد کرنے والے ملزم کو قبول کرتی ہے لیکن اسے عادی قاتل بنا کر باہر بھیج دیتی ہے۔

کولسن نے اس عمل کا بلاواسطہ مشاہدہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب وہ جیل گئے تھے تو انہیں جان کا خطرہ لاحق تھا۔ انہوں نے اپنے چاروں طرف تشدد پر آمادہ لوگوں کو دیکھا جو وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ تشدد پر آمادہ اور غصے کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ انہوں نے برسوں اس عمل کو ان جیلوں میں بھی دیکھا جن کا انہوں نے معائنہ کیا تھا۔

مہنگی ناکامی

جیلوں میں مجرموں کے بند کرنے کو یہ مہنگی ناکامی قرار دیتے ہیں۔ جیلوں پر کافی روپیہ خرچ ہوتا ہے اور ان کے خیال میں یہ سب ضائع جاتا ہے۔ مسائل کے حل کے دوسرے سرکاری طریقوں کی طرح اس مسئلے کے یہ حل بھی بڑے مہنگے ہیں۔ امریکہ میں جیل کی ایک کوٹھڑی بنانے پر 80 ہزار ڈالر خرچ ہو جاتے ہیں اور اس میں بند ہونے والے مجرم پر ہر سال 17000 ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ یہ رقم کسی طالب علم کو ہارورڈ یونیورسٹی بھیجنے کے اخراجات کے برابر ہے۔ قیدیوں کے حد سے زیادہ ہجوم کی بنا پر یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ان کو رکھنے کے لئے مزید جیلوں کی تعمیر پر دس ملین ڈالر خرچ ہوں گے۔ ان میں صرف موجودہ مجرم ہی رہ سکیں گے۔

ان کے خیال میں یہ بڑی واضح حقیقت ہے کہ جیلیں خواہ کتنی ہی شائستہ کیوں نہ ہوں ان میں ایسا ماحول ہوتا ہے جو اس میں بند لوگوں کے لئے تباہ کن ہوتا ہے۔ اگر ان کی رہائی کو طویل سزاؤں کے ذریعے ملتوی کر دیا جائے تو بھی رہا ہونے پر جیلوں میں رہنے والے معاشرے کے لئے مضر ثابت ہوں گے۔

متبادل طریقے

کولسن پوچھتے ہیں کہ تشدد سے مبرا مجرم کو جیل میں رکھ کر ٹیکس ادا کرنے والے کو اتنی زیادہ قیمت ادا کرنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے۔ جب کہ جیل میں رہنے سے یہ لوگ زیادہ ناراض اور غصیلے ہو جائیں گے اور رہا ہونے پر ارتکاب جرم کرنے لگیں۔ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ ان کو جیل کے باہر کسی کام پر لگا دیا جائے جہاں سے وہ روپیہ کما کر متاثرہ فریق کو معاوضہ ادا کریں۔ ایسے پروگرام کیوں نہ شروع کئے جائیں جہاں مجرم اپنے جرم کا معاوضہ ادا کرے؟ اس قسم کی سزاؤں کی مثالیں عہد نامہ عتیق میں بھی ملتی ہیں۔ کسی نے ایک بیل چرایا تھا، اس نے اس کا معاوضہ پانچ بیلوں میں ادا کیا۔ آج جدت پسند جج اس اُصول کو محدود پیمانے پر نافذ کر رہے ہیں۔

وہ تمام قانونی نظام جن پر مغرب کا قانونی نظام مبنی ہے، اصرار کرتے ہیں کہ مجرم اور مدعی آپس میں مل کر فیصلہ کریں۔ جرم کے ارتکاب سے مدعی کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ایسے قانونی نظاموں میں جہاں مشترکہ مفاد کو گزند پہنچتا تھا اور معاشرے کو اس میں دلچسپی ہوتی تھی اور اس کی ذمہ داری

ہوتی تھی کہ اس کا ازالہ کیا جائے اور مجرم کو سزا ملے اور وہ نقصان کی تلافی کرے وہاں بھی ایسے جرم کو حکومت کے خلاف جرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس کے برعکس آج کل ایسا ہو رہا ہے۔

ایک حقیقی تبدیلی

دوئم، ہرجانہ ادا کرنے سے مجرم کو اپنی بحالی کا ایک موقع ملتا ہے جس سے وہ اپنے کردار میں ایک حقیقی تبدیلی لاسکتا ہے۔ یہ مقصد صرف قید کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ انسان کو ایک مفید کام سے محرومی اور بے مقصدیت سے زیادہ نقصان پہنچانے والی اور کوئی چیز نہیں۔ زار روس کے زمانے میں دوستوفسکی دس سال تک جیل میں رہا۔ وہ لکھتا ہے ''اگر کسی شخص کو بالکل ملیامیٹ کرنا ہو یا اسے قطعی فنا کرنا ہو اور اسے خوفناک سزا دینی مقصود ہو تو اسے قطعی بیکار اور غیر معقول کام سونپ دینا چاہئے۔'' ہماری جیلوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیلوں میں تشدد کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

جیک کیمپ(Kemp) اپنی کتاب ''کرائم اینڈ پنشمنٹ ان ماڈرن امیریکا'' (Crime and Punishment in Modern America,1986) میں اس خیال کی ان الفاظ میں تائید کرتے ہیں:

''بیشتر لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ ایک نقب زن مال مسروقہ واپس کرے اور نقصان کی تلافی کرے اور اتنے وقت کے ضیاع کا ہرجانہ ادا کرے جو عدالتوں میں جانے آنے پر صرف ہوتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ املاک کے سرقے میں ایسا کیوں نہیں ہو رہا۔ ہرجانے کے خیال کو پسند کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ہرجانے کا تصور سامی روایت اور عقل کی بالادستی پر مبنی ہے۔ عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید دونوں کے مطابق اپنے ہمسایوں کے ہاں چوری کرنے والوں کے لئے لازمی ہے کہ وہ مال مسروقہ کی مالیت سے دوگنا یا چار گنا ہرجانہ ادا کر کے اپنے جرم کی تلافی کریں۔ بغیر تشدد والے جرائم میں ہرجانہ ادا کرنا جیل جانے کے مترادف ہے۔ ہرجانے کا اصول اپنانے سے جیلوں پر دباؤ کم ہو جائے گا اور جیلوں کو چلانے اور نئی جیلوں کی تعمیر پر اخراجات کم ہو جائیں گے۔ ٹیکسوں کا بوجھ کم ہو جائے گا۔

ہرجانہ یا معاوضہ ادا کرنے سے ایک مجرم کو اپنے فعل کے نتائج کا پورا پورا احساس ہو جائے

MashalBooks.org

گا اور وہ اپنی اصلاح کی کوشش کرے گا۔ ماہر نفسیات البرٹ ایگلاش (Albert Eglash) کے خیال میں ہرجانہ ادا کرنے سے احساس جرم اور اس کے ساتھ تشویش بھی کم ہوجاتی ہے جو بصورت دیگر مزید جرائم کا سبب بنتی ہے۔

سوم، ہرجانے کا اصول جیل خانوں کے نظام سے کم خرچ ہے۔ نئی جیلوں کی تعمیر یا پرانی جیلوں کی توسیع کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جیل کی آبادی کم ہوجائے گی اور اس کے ساتھ ہی جیل کا عملہ جو بدمعاشیاں کرتا ہے وہ بھی کم ہوجائیں گی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہرجانے کا نظام جرائم کا انسداد کرسکے گا؟

جرائم کا سدِ باب کرنے میں جیلیں اپنا فرض ادا نہیں کرسکیں۔ ان ملکوں میں جہاں قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جیسے کہ امریکہ ہے، وہاں جرائم بھی اتنے ہی زیادہ ہیں لیکن معاوضے کے پروگراموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی حد تک جرائم کی روک تھام کرسکتے ہیں کیونکہ وہ فرد کی ذمہ داری کو بحال کرتے ہیں اور اس طرح فرد معاشرے سے کافی حد تک ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ بار بار جرم کرنے کے رجحان کو روکنے کا یہ بڑا موثر طریقہ ہے۔

کئی ملکوں میں فوجداری انصاف کے افسر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سزا کی نوعیت یا سنگینی جرائم کو نہیں روکتی بلکہ سزا کا یقینی اور لازمی ہونا ایسا امر ہے جو جرائم کو کم کرسکتا ہے۔ فان نیس (Van Ness) کہتا ہے ''جرائم کی روک تھام کے لئے کوئی بھی سزا کافی ہے بہ شرطیکہ وہ فوری اور یقینی ہو۔ چنانچہ ہرجانے یا معاوضے کے پروگرام اگر موثر طریقے سے چلائے جائیں تو جرائم کو روکنے میں وہ کافی موثر ثابت ہوں گے۔''

کولسن اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں معاوضہ ادا کرنے والوں موثر پروگرام جیلوں سے زیادہ مفید اور موثر طریقے سے جرائم کا سدباب کرسکیں گے۔ وہ اپنا ایک تجربہ بیان کرتے ہیں:

''میں نے ایک مجرم سے بات کی جس نے اپنی عمر کے 28 میں سے 19 برس جیل میں گزارے تھے۔ اس کے خلاف منشیات کا جرم ثابت ہوچکا تھا۔ اس کے لئے عمر قید کی سزا لازمی تھی۔ میں نے پوچھا ''آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''میں ورلڈ ٹریڈ بلڈنگ کی 80 ویں منزل پر لوہا اٹھانے کا کام کرتا تھا۔ مجھے اٹھارہ ڈالر فی

گھنٹہ مزدوری ملتی تھی لیکن ایک قدم غلط پڑنے پر میں وہاں سے گر کر مر سکتا تھا۔منشیات سے میں تین لاکھ ڈالر فی ہفتہ کما تا تھا اور ایک قدم غلط پڑنے پر میں صرف جیل جا سکتا تھا۔ یہ سودا اچھا تھا۔''

جرم کا فوری فائدہ اتنا زیادہ ہے کہ کئی مجرم جیل جانے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہیں لیکن اگر اس کا معاوضہ ادا کرنا یقینی ہو تو جرم سے فوری منافع کا تصور ختم ہو جاتا ہے، جرم سے حاصل ہونے والی رقم سے معاوضہ کہیں زیادہ ہونا چاہئے۔ منشیات کا دھندا اور منظّم جرائم کرنے والوں کی گرفتاری کے وقت ان کی املاک منجمد کر دینی چاہئیں اور سزا ہونے پر ضبط کر لینی چاہئیں۔ مجرم کو معاوضہ ادا کرنے کے لئے پروگرام کے تحت کام پر لگا دینا چاہئے۔

اخلاقی نقطہ نظر کے مطابق جرم ذمہ دار آدمیوں کے غلط فیصلے کا نتیجہ ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے۔اس کا لازمی اور منصفانہ طریقہ سزا ہے جس میں کمیونیٹی کو معاوضہ ادا کرنا، کڑا جرمانہ اور جہاں مجرم خطرناک ہوں، جیل بھیجنا شامل ہیں۔جیلیں افراد کا علاج نہیں کر سکتیں۔ وہ مجرموں کو صرف قید کر سکتی ہیں۔

پیشہ ور مجرموں کو جیل میں بند کرنا

جرائم پیشہ مجرم اور سزا کے مسئلے پر یوجین ایچ۔میھون ایک حد تک کولسن سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ ماضی میں مشہور انگریزی رسالے ریڈرز ڈائجسٹ کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ عادی مجرموں کو جیل ہی میں بند کر دینا چاہئے۔

کچھ مطالعات سے یہ تاجر ملتا ہے کہ مجرموں کا ایک چھوٹا سا گروہ جرائم کی بڑی تعداد میں ملوث ہوتا ہے۔ان کی رائے میں ان عادی مجرموں کو معاشرے سے علیحدہ کر کے جیلوں میں بند کر دینا چاہیے۔ وہ درج ذیل سوالات کو زیر بحث لاتے ہیں:

- جرائم کی شرح اتنی بلند کیوں ہے؟
- عادی مجرموں کی پہچان کیا ہے؟
- بچوں کے معاملات میں انصاف میں کون سی تبدیلیاں ہونی چاہئیں؟
- ایک مطالعے کے مطابق چوری اور نقب زنی کی وارداتوں میں وہی مجرم بار بار ملوث ہوتے ہیں۔ان پر نظر رکھنے سے جرائم میں کمی ہو سکتی ہے۔نظر رکھنے کا طریقہ کار یہ ہے:

MashalBooks.org

۱۔ علاقے کے لوگوں کا پولیس سے تعاون اور چوکیداری نظام۔

۲۔ پندرہ سے بیس برس کی عمر کے لوگوں کی تعداد میں کمی کا واقع ہونا۔

۳۔ پولیس کی پیشہ ور مجرموں کی طرف زیادہ توجہ۔

آج سے تقریباً دس سال پہلے پیشہ ور مجرموں کے متعلق ہمارے پاس کوئی زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ یونیورسٹی آف پن سلوینیا کے ماروِن ولف گینگ نے1945 میں پیدا ہونے والے 9945مردوں پر تحقیق شروع کی۔ یہ سب ایک ہی علاقے فلاڈلفیا کے رہنے والے تھے۔ اس تحقیق کے نتائج حیران کن تھے:

۱۔ زیرِ تحقیق لوگوں میں627ایسے نوجوان تھے جو18 برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے پانچ پانچ دفعہ گرفتار ہو چکے تھے۔

۲۔ وہ اس علاقے میں ہونے والے جرائم کے دو تہائی حصے کے ذمہ دار تھے۔

۳۔ ایک واردات میں پہلی مرتبہ گرفتار ہونے سے پہلے وہ 8 سے گیارہ وارداتیں کر چکے تھے جن میں وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے تھے۔

۴۔ مجرموں کی اس تعداد میں14 قاتل بھی تھے اور ہر ایک کو صرف چار سال قید کی سزا ہوئی تھی۔

5۔ یہ سب مجرم زیرِ تحقیق تعداد کا سات فیصد تھے۔

یہ تجربہ پھر اسی علاقے میں1958 میں پیدا ہونے والے لوگوں پر دہرایا گیا۔ زیرِ تحقیق لوگوں کی تعداد12160 تھی۔ ان میں مجرموں کی کل تعداد982 تھی جو پھر سات فیصد بنتی ہے۔ ان سب مجرموں کی عمریں اٹھارہ سال یا اس سے کم تھیں۔

پہلی اور دوسری تحقیق میں ایک فرق تھا۔1945 کی تحقیق کے مقابلے میں یہ مجرم زیادہ پر تشدد جرائم کے مرتکب ہوئے تھے۔ زنا کی وارداتوں کی تعداد دو گنا، قتل کی تین گنا اور ڈکیتی گنا تھی۔ ولف گینگ کی رائے میں یہ لوگ کم عمری میں ہی وارداتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں اور انہیں جلد از جلد پکڑنا چاہئے۔

ان لوگوں کو جیل میں بند کرنا آسان لگتا ہے۔ لیکن اگر ان اعداد و شمار کا اطلاق پورے امریکہ پر کیا جائے تو ایسے مجرموں کی تعداد1.22 ملین ہوگی جو اس وقت جیلوں میں بند مجرموں کی تعداد سے دگنی ہے۔ جیلیں پہلے سے ہی مجرموں سے بھری پڑی ہیں۔

MashalBooks.org

رینڈ کارپوریشن نے2190پیشہ ور مجرموں پر تحقیق کی اور پتا چلا کہ:

۱۔ وہ کئی اور وارداتوں میں بھی ملوث تھے لیکن گرفتاری سے بچ گئے۔ ان کی ایک چھوٹی سی اقلیت ایک سے زیادہ جرائم کی مرتکب تھی۔

۲۔ نقب زنی کرنے والے آدھے مجرموں نے ایک سال میں چھ چھ وارداتوں کا ارتکاب کیا تھا۔

۳۔ دس فیصد سے زیادہ مجرموں نے ۲۰ سے زیادہ وارداتوں کا ارتکاب کیا تھا۔

۴۔ ڈاکوؤں کی آدھی تعداد نے ایک سال میں پانچ پانچ وارداتیں کی تھیں۔

۵۔ اوسطاً دس فیصد مجرم87وارداتوں میں ملوث تھے۔

۶۔ منشیات کا دھندا کرنے والوں نے ایک سال میں100 وارداتین کی تھیں۔

سارے عادی مجرم ایک جیسے نہیں ہوتے لیکن ان میں سے کسی ایک کو ایک سال کے لئے بند کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے چار وارداتوں کو روک دیا ہے۔

بار بار جرم کا ارتکاب کرنے والوں کی شناخت کے دو معیار ہیں: اول، وہ عمر جب وہ واردات شروع کرتے ہیں اور دوم، منشیات کا استعمال۔

صرف امریکہ کے تمام سنگین جرائم کے نصف کا ارتکاب 18 سال سے کم عمر والے لڑکے کرتے ہیں۔ اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ جرم کرنے والے تیرھویں سال سے ہی وارداتیں شروع کر دیتے ہیں اور سولھویں سال تک وہ پکے لٹیرے اور نقب زن بن جاتے ہیں جو کئی وارداتوں کا ارتکاب کر چکے ہوتے ہیں۔ اپنی زندگی کا دوسرا جرم کرتے وقت ان کی عمر ایک اہم سبب ہے۔ اگر پندرہ سال کی عمر سے پہلے وہ دوسری واردات کریں تو گمان غالب ہے کہ تیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ کم از کم درجنوں وارداتیں کر چکے ہوں گے۔ ولفگینگ کہتے ہیں کہ تیسری واردات پر ان کے ساتھ بالغ مجرموں جیسا قانونی سلوک کرنا چاہیے۔

رینڈ والوں کے خیال میں وہ مجرم جو روزانہ پچاس ڈالر ہیروئن پر خرچ کرتے ہین یا الکحل اور باربی چوریٹ دونوں کا استعمال کرتے ہیں، سنگین جرائم کا بار بار ارتکاب کرنے کے اہل ہیں۔

امریکہ میں بالٹی مور کے 242 نشہ باز گیارہ برسوں میں تقریباً نصف ملین جرائم کا ارتکاب کر چکے تھے یعنی اوسطاً 2056 اور سالانہ 187۔

MashalBooks.org

رینڈ والوں کے سروے کے مطابق بڑے بڑے مجرموں کے مندرجہ ذیل خدوخال ہیں:

ا۔ جو سولہ سال کی عمر سے پہلے سزا پا چکا ہو۔
۲۔ جو نوجوانی میں جیل کاٹ چکا ہو۔
۳۔ جس نے حالیہ گرفتاری سے پہلے ہیروئن یا باربی چوریٹ کا استعمال کیا ہو۔
۴۔ جس نے لڑکپن میں ہیروئن استعمال کی ہو۔
۵۔ جو حالیہ گرفتاری سے ایک یا دو سال قبل ملزم رہ چکا ہو۔
۶۔ جو حالیہ گرفتاری سے قبل نقب زنی یا ڈکیتی میں سزا پا چکا ہو۔
۷۔ جو حالیہ واردات سے پہلے ایک یا دو سال تک جیل میں رہ چکا ہو۔

اس سات نکاتی معیار کا اطلاق کیلی فورنیا کے 781 سزا یافتہ مجرموں پر کیا گیا اور اسے درست پایا گیا۔

مارٹن سن کی تحقیق کے مطابق سپیشل بحالی کے تحت رہنے والے چار لاکھ مجرموں میں سے صرف ستر فی صد دوبارہ گرفتار نہیں ہوں گے۔ لیکن بحالی کا کوئی پروگرام بھی جرم کے دوبارا رتکاب کو روکنے میں مفید ثابت نہیں ہوا۔

ایک صدی بیشتر امریکہ میں ہر مجرم کو جیل بھیج دیا جاتا تھا۔ اب پکڑے جانے والوں میں سے صرف نو فیصد جیل جاتے ہیں۔ مارٹن سن کے خیال میں امریکہ نے یہیں غلطی کی کہ نت نئے تجربات کی خاطر ایک بڑے کامیاب طریقے کو خیر باد کہہ دیا۔

ماہرین جرمیات نے بڑی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اگر پولیس، استغاثہ اور جج صاحبان ان کے مطابق کام کریں تو فوجداری نظام انصاف بڑا موثر اور کامیاب ہوسکتا ہے۔ جیلوں میں مجرموں کی تعداد کم ہوسکتی ہے، گھر اور سڑکیں محفوظ ہوسکتی ہیں۔

مگر لیزا شفرن (Lisa Schifron) کے خیال میں قانون نافذ کرنے والے پیشہ وروں مین ایک مفید خیال زیرغور ہے۔ اسے انتخابی سلبی صلاحیت کہا جاتا ہے۔ اگر یہ خیال مزید پختہ ہوجائے تو اس سے پیشہ ور مجرموں کی پہچان آسان ہوجائے گی۔

مجرمانہ کردار کی مثالی صورت کے مطابق پیشہ ور مجرم اپنا پیشہ چھوٹی عمر (یعنی دس اور بیس برسوں کے درمیان) سے ہی شروع کردیتے ہیں۔ اگر وہ قانون کی ابتدائی خلاف ورزی پر ہی

MashalBooks.org

شناخت ہو جائیں تو ان کو ملنے والی سزائیں اس خطرے کی عکاسی کریں گی جو معاشرے کو درپیش تھے۔ اس طرح موضوعی اور من مانے معیاروں کو بدلا جا سکتا ہے جو آئندہ مجرمانہ کردار کا اندازہ لگاتے وقت استغاثہ، جیل کے افسران اور جج صاحبان پیش نظر رکھتے ہیں۔

MashalBooks.org

پیشہ ور مجرموں کا علاج جیل نہیں

کچھ لوگوں کے خیال میں پیشہ ور بار بار جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو معاشرے سے علیحدہ کر کے جیل میں بند کر دینا چاہیے۔لیکن سٹرک ہاف (Struck Hoff) کی رائے میں ایسا کرنا قابل عمل نہیں۔کون کہہ سکتا ہے کہ کس قیدی کو بند رکھا جائے اور کس کو چھوڑ دیا جائے؟ چنانچہ کچھ قیدی بلا جواز بند ہو جائیں گے اور کئی عادی مجرم باہر آ جائیں گے اور پھر ارتکاب جرم شروع کر دیں گے۔

معاشرے سے عادی مجرموں کو دور رکھنے کی خاطر ان کی مجرمانہ صلاحیت کو سلب کرنا یعنی جیل میں بند رکھنا یا شخصی آزادی کو محدود کرنے کے دوسرے طریقے 1975 سے فوجداری نظام انصاف میں زیر بحث ہیں۔

منتخب مجرموں کو جیل میں بند رکھنے کے اصول کی اپنی تاریخ ہے۔اوپر ہم ولفگینگ کی تحقیق کو زیر بحث لا چکے ہیں اور یہ دیکھ چکے ہیں کہ مجرموں کی ایک چھوٹی سی اقلیت بار بار جرائم کا ارتکاب کرتی ہے۔اس طرح ایسے مجرموں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

ولفگینگ کے مطالعات کے تین برس کے اندر شلومو (Shlomo) اور شنر (Shinner) نے ایک ایسا فارمولا تیار کر لیا جس کے مطابق پرانے پیشہ ور مجرم ایک سال میں دس جرموں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ان مجرموں کو پانچ سال تک بند رکھنے سے جرائم میں 80 فیصد کمی کی جا سکتی ہے۔

مگر ان تخمینوں کو سٹیونز کلارک نے 1974 میں اور ڈیوڈ گرین برگ نے 1975 میں اور سٹیفن فان ڈائین نے 1977 میں چیلنج کر دیا۔ان کا اندازہ تھا کہ اس طریق کار سے 80 نہیں

بلکہ صرف 4 فیصد کمی ہوگی۔ دوسرے مطالعات نامکمل رہے تاہم سب نے اس پر اتفاق کیا کہ ابھی بہتر تخمینوں کی ضرورت ہے۔

اس طریق کار کے متعلق سموئل واکر نے ''سیس اینڈ نان سیس اباوٹ کرائم''
Sense and Nonsense about Crime میں کئی اہم سوالات اٹھائے ہیں:

۱۔ کیا ہم جرائم کی کمی کو بالکل درست طریقے سے ناپ سکتے ہیں؟

۲۔ کیا ہم پرانے پیشہ ور مجرموں کی صحیح طریقے سے نشان دہی کر سکتے ہیں اور ان کی مستقبل میں مجرمانہ سرگرمیوں کے متعلق صحیح پیش گوئی کر سکتے ہیں؟

۳۔ کیا ان پرانے اور پیشہ ور مجرموں کو قید کرنے کے لئے نئی جیلوں کی تعمیر کی ضرورت ہوگی؟ اگر ہوگی تو یہ روپیہ کہاں سے آئے گا؟

۴۔ کیا ہم آئین کی خلاف ورزی کئے بغیر اس طریق کار کو اپنا سکتے ہیں؟

۵۔ اس حکمت عملی کے ذیلی اثرات کیا ہوں گے؟

ان سوالات میں ایک اور سوال کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ جرائم کی استعداد کی انتخابی سلبی صلاحیت میں کون کون سی سزائیں شامل کی جا سکتی ہیں؟

پیشہ ور مجرموں کا انتخاب کر کے ان کو نااہل بنانا ان کے سابقہ یا آئندہ کردار کے متعلق پیش گوئی پر منحصر ہے۔ بار بار جیل خانے والے یا پیشہ ور مجرموں کا سالانہ تعداد کا تخمینہ جتنا زیادہ ہوگا مجرموں کو بند کرنے والا فارمولا جرائم کی شرح میں اتنی ہی زیادہ کمی دکھائے گا۔ ایسی پیش گوئیوں میں ایک قباحت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک عادی مجرم کی وارداتوں کے ارتکاب کے متعلق جرائم کی اوسط بے معنی لگتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر چند قانون شکن ہر سال 100 وارداتیں کرتے ہیں تو اس سے سب عادی مجرموں کے جرائم کے ارتکاب کی اوسط متاثر ہوگی۔ ایک دوسری قباحت بھی ہے کہ پرانے مجرم کی ابھی تک کوئی متفقہ تعریف سامنے نہیں آئی۔

چند مجرموں کو منتخب کر کے ان کی جرائم کے ارتکاب کی صلاحیت کو سلب کرنے کا تقاضا ہے کہ ان لوگوں کو پکڑ کر جیلوں میں بند کر دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم ان پرانے مجرموں کو شناخت کر سکتے ہیں؟

پولیس کے مطابق امریکہ کی ایک ریاست الینائے میں اسی ہزار مجرموں میں صرف

MashalBooks.org

22ایسے تھے جن کو بلند شرح پر جرائم کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ پولیس یہ نہیں بتا سکتی کہ بلند شرح سے ان کی مراد کیا ہے۔ وہ صرف قیاس ہی دوڑا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ محض ایک اندازہ ہی ہے اور پولیس کو یہ معلوم نہیں کہ ان 22افراد میں سے کون جیل سے جا رہا ہے اور کون آ رہا ہے۔ پھر پولیس والوں کو یہ بھی یقین نہیں کہ ان 22افراد میں سے کتنوں پر پولیس کے چالاک مخبروں نے غلط الزام تراشی کی ہے یا کسی دوسرے شہری نے غلط معلومات فراہم کی ہیں۔ چنانچہ پولیس کہتی ہے کہ ان کو مجرموں کا پتا ہے تو ان کو خود اپنے آپ پر یقین نہیں ہوتا۔

اعداد وشمار

امریکہ میں جج کے سامنے پیش ہونے والے ملزم کے خلاف الزامات پر مبنی فہرست پیش کی جاتی ہے لیکن اس سے ملزم کے سابقہ کردار پر کوئی روشنی میں پڑتی۔ اعداد وشمار کے اعتبار سے یہ فہرستیں ناقص ہوتی ہیں۔ ان میں وہ جرائم درج ہوتے ہیں جن کا ملزم نے ارتکاب کیا ہوتا ہے اور بیان کئے جانے والے الزامات میں سے آدھے قانونی پیچیدگیوں اور کارروائی کی مشکلات کی بنا پر خارج ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ججوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ اصلی قانون شکن کون ہے۔

پھر ایسے بھی قانون شکن ہیں جن کی شہرت تو بری ہوتی ہے لیکن انہوں نے کوئی زیادہ جرم نہیں کئے ہوتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں جرم کرنے کا طریقہ نہیں آتا اور ہر دفعہ جب جرم کرنے لگتے ہیں تو پکڑے جاتے ہیں۔

اعداد وشمار میں یہ دو صورتیں ان جرائم کو فہرست میں شامل کرنا جنہیں شامل نہیں کرنا چاہئے اور ان کو شامل نہ کرنا جن کو شامل ہونا چاہئے ...... فالز نیگٹوز False Negetives اور فالز پوزیٹو False Positive کہلاتی ہیں۔ پیش گوئیوں کے بہترین طریقوں کے باوجود ان میں دو طرح کی اغلاط درآتی ہیں۔ اگر پیش گوئی 60 فیصد بھی صحیح ہو تو یہ ایک کارنامہ ہے۔ یہ جاننا کہ مجرموں کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جن کی مجرمانہ سرگرمی سے جرائم سرزد ہوں گے، ایک بات ہے لیکن ان میں سے ایسے مجرم کو چھانٹ لینا دوسری بات ہے۔ بعض لوگ کچھ وجوہات کی بنا پر ایکچوریز (Acturaries) کی جدولوں کے مطابق زندگیاں نہیں گزارتے اور ہم میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی روش بدل لیتے ہیں۔ چنانچہ مجرموں کی اعداد وشمار کی جدولوں سے ان کی انتخابی

MashalBooks.org

سلبی کی غرض سے انتخاب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

واکر کا خیال ہے کہ نظریاتی اعتبار سے یہ سلبی سیاسی طور پر بڑی پر کشش لگتی ہے لیکن اس پر عمل کرنے کے اخراجات تباہ کن ہیں۔ فان ڈائین کے شرکاء کے تخمینے کے مطابق ہر دوسرے جرم پر پانچ سال کی لازمی سزا سے صرف اواہائیو جیل کی آبادی میں 5 فیصد سے 6 سو فیصد کا اضافہ ہو جائے گا۔ 13,000 سے بڑھ کر آئندہ پانچ برسوں میں 25,000 ہو جائے گی۔ اصلاحی اداروں کی تعمیر پر 5 سے 120 ملین ڈالر لاگت آئے گی اور ان سب سے جرائم کی شرح 25 سے 28 فیصد کم ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکی معاشرہ یہ قیمت ادا کر سکتا ہے؟ اور کاسٹ بینیفٹ (Cost-Benifit) کے تناسب کا تخمینہ کیسے لگایا جائے گا؟

یہ طریق کار کچھ آئینی سوالات بھی اٹھائے گا۔ جرائم کی بنا پر کچھ مجرموں کو جیل میں رکھا جائے گا یا کسی اور وجہ سے جیسے طرز زندگی، ریس کھیلنا، ملازمت میں مقام، ان کے سماجی طبقے یا مرجم کی سابقہ زندگی کے واقعات؟ ایسی انتخابی سلبی میں معاشرے کو پیش آنے والے خطرات کی پیش گوئی اور آئندہ ہونے والے جرائم کی تعداد شامل ہیں۔ ایسی پیش گوئیوں کی بنیاد تبدیل ہونے والے کئی عوامل پر ہے جیسے رہائش کا استحکام، ازدواجیت اور ملازمت کی ہسٹری، خاندانی سہارا اور کئی اور تبدیل ہونے والے معاشرتی عوامل جو مجرمیت کے ساتھ منفی یا مثبت طریقے سے منسلک ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بار جیل جانے والے پرانے مجرم پر جو چھوٹی سی رہزنی کرتا ہے مگر اس کے متعلق پیش گوئی بڑی اچھی ہے، اس سلبی کا اطلاق ہونا چاہئے یا ایک نابالغ پر جو پہلی دفعہ جرم کا ارتکاب کرتا ہے لیکن اس کے متعلق پیش گوئی اچھی نہیں ہے، اس پابندی کا اطلاق ہونا چاہیے؟ دوسرے الفاظ میں کیا یہ پیش گوئیاں انصاف پر مبنی ہوں گی اور کیا یہ صحیح ہوں گی؟

عدالتوں اور پولیس پر اس منتخب سلبی کا کیا اثر ہوگا؟ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ پولیس اور عدالتیں اپنے علم اور تجربے کے مطابق پہلے ہی اس حکمت عملی پر عمل پیرا ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تشدد پسند مجرموں پر امریکی عدالتیں پہلے ہی عمل کر رہی ہیں۔ خصوصاً جب جرم کا ارتکاب اجنبی پر کیا جائے۔ پیشہ ور اصلاحی ادارے پوری طرح آگاہ ہیں کہ پر تشدد جرائم کا ارتکاب کرنے والوں سے جیلیں پہلے ہی بھری ہوئی ہیں۔ تھوڑے تشدد میں ملوث مجرموں کو کہیں اور بھیجا جا رہا ہے۔ عدالتیں اس حکمت عملی کا بے لچک اطلاق ان لوگوں پر بھی کرنے لگی ہیں جن کو جیل کی

MashalBooks.org

بجائے دوسری قسم کی سزائیں دی جارہی ہیں۔اس سے اصلاح طلب دائرہ اور وسیع ہوجائے گا جو مستقبل کے لئے ایک اچھا شگون ہے مگر اخراجات کا بڑھنا اور معاشرے کی پالیسی کے متعلق سوالات اہم ہوجاتے ہیں۔

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ نظریاتی اعتبار سے یہ حکمت عملی بہت اچھی ہے لیکن عملی لحاظ سے یہ خوفناک حد تک مشکل کام ہے کیونکہ انسانی رویوں کے متعلق سائنسی قسم کی پیش گوئیاں کرنے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔فوجداری نظام انصاف ابھی تک کوئی ایسا طریقہ دریافت نہیں کرسکا جو پیشہ ور مجرموں کو شناخت کرلے اور اس کے ساتھ ہی ایسے مجرموں کی بڑی تعداد کو(جو پیشہ ور نہیں ہیں)غلطی سے پیشہ ور مجرم قرار نہ دے اور قانون شکنی کرنے والوں کی صحیح شناخت کرسکے۔فوجداری نظام میں یہ مسئلہ بڑا اذیت ناک ہے۔ایسا نظام جو ایسے لوگوں کو جیل میں بند کردے جن کو وہاں بند کرنا مناسب نہیں، ناقابل قبول ہے۔یہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر یہ مسئلہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔

MashalBooks.org

انسداد

زیادہ سے زیادہ سزائیں
جیل بھیجنا علاج نہیں
منشیات پر سے پابندی اٹھانا
پابندی اٹھانے کی مخالفت
بے روزگاری اور جرائم
شہریوں کی انسدادی کارروائی
معاشرتی تنظیمیں
ماحولیاتی ڈیزائن میں تبدیلی

MashalBooks.org

جرائم میں خوف کا عنصر

MashalBooks.org

تمام معاشروں میں جرائم ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اگرچہ مختلف معاشروں میں جرائم کم یا زیادہ ہوتے رہتے ہیں مگر صنعتی معاشروں میں جرائم کی شرح بڑی بلند ہے۔ امریکہ میں یہ شرح سب سے زیادہ ہے۔

چالیس پچاس سال پہلے ہمارے ہاں بھی اتنے جرم نہیں ہوتے تھے اور ان کی نوعیت بھی بڑی سادہ تھی۔ لیکن تھوڑی بہت صنعتی ترقی، سیاسی عدم استحکام، غلط قسم کی مذہبیت اور متواتر مارشل لاء اور نظم و نسق کی مسلسل بگڑتی ہوئی صورت حال نے ان کی نوعیت بدل دی ہے۔ اس پر مستزاد یہ امر ہے کہ 1947ء سے ہی ہمارا معاشرہ جڑوں کے بغیر ہے۔ چالیس پچاس سال قبل ہمارے ہاں کے جرائم میں تشدد کا عنصر اتنا زیادہ نہیں تھا اور قتل کے محرکات بھی بڑے واضح ہوتے تھے۔ زنا بالجبر، اغوا برائے تاوان وغیرہ قسم کے جرائم اتنے زیادہ نہیں تھے۔ گینگ ریپ یعنی اجتماعی زیادتی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ دہشت گردی کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا۔ 1957 میں محرم الحرام کے موقع پر موضوع سیت پور (ضلع مظفر گڑھ) میں ایک ہی وقت سات قتل ہوئے اور سارا پنجاب لرز گیا۔ آج کل صرف لاہور میں روزانہ پانچ سات قتل ایک معمول ہے۔ پولیس کی حراست میں قتل کی وارداتیں بہت کم سننے میں آتی تھیں لیکن آج یہ معمول بن گیا ہے۔

ماہرین نے جرائم کو کم کرنے کے بہت سے معاشرتی اور انفرادی حل تجویز کئے ہیں جیسے کڑی اور لمبی سزائیں، قانون نافذ کرنے والے اداروں کو مزید مضبوط اور فعال بنانا، ماحول میں تبدیلیاں، نوجوانوں کی ملازمتوں کے لئے تربیت وغیرہ۔

کچھ ماہرین ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ معاشرے میں ایسے لوگ ہمیشہ موجود رہیں گے جن کا رجحان قانون شکنی کی طرف رہے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ لوگ خود اس طرح بدل جائیں کہ جرم کرنا مشکل ہو جائے جیسے کہ مقامی چوکیداری نظام وغیرہ۔

مندرجہ ذیل سطور میں جرم میں تخویف کے متعلق مباحث اور تجویزیں اختصار کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

MashalBooks.org

1۔زیادہ سے زیادہ قید کی سزائیں

ڈین ہاگ(Deen Hog) ماہر جرمیات ہیں۔ان کی نظر میں معاشرے کا مخلوط النسل ہونا (امریکہ انگلستان، اور کئی دوسرے مما لک) حد سے زیادہ شخصی آزادی کے علاوہ جینیاتی، معاشرتی،نفسیاتی ذہانت کی کمی،بکھرے ہوئے خاندان، والدین کی بچوں کے ساتھ بدسلوکی وغیرہ بھی جرائم کے ذمہ دار ہیں۔لیکن ان سب کا اجتماعی علاج ناممکن ہے۔معاشرے میں غربت،عدم مساوات اور فلاکت زدہ خاندانوں کو بھی جرائم کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ان کا علاج تو ممکن ہے مگر یہ ایسی بیماریاں ہیں جو علاج کے بعد پھر لوٹ آئیں گی۔

یہ سب علمی دلچسپی کی باتیں ہیں اور عملی طور پر یہ لاحاصل ہیں۔

امریکہ ہی کو لیں جو دنیا کے امیر ترین ملکوں میں سے ہے۔اس میں جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے۔مندے میں یہ شرح کم ہو جاتی ہے اور خوشحالی میں بڑھ جاتی ہے۔جب درمیانی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ شرح اور بھی بڑھ جاتی ہے۔لٹیروں اور نقب زنوں کے لئے یہ بہت بڑا محرک ہے۔

ڈین ہاگ جرائم کی وجوہات کی مندرجہ بالا تجزیے سے اتفاق نہیں کرتے۔ان کے خیال میں جرائم میں زیادتی کی وجہ خود فوجداری نظام انصاف ہے جس کے تحت بہت سے لوگوں کو استغاثے کی سماعت کے دوران ضمانت پر رہا کر دیا جاتا ہے۔کچھ معاشروں میں انہیں آزمائشی رہائی مل جاتی ہے اور کہیں وہ پیرول پر معاشرے میں واپس آجاتے ہیں۔پوری سزا نہ بھگتنے کی وجہ سے ایسے لوگ جرائم کا دوبارہ ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔

MashalBooks.org

جرائم کی تخویف کے لئے ہماری واحد اُمید فوجداری نظام انصاف ہے۔ سزاؤں کے نظام کو مضبوط بنانا بڑا مہنگا کام ہے۔ ان کے لئے سیاسی اصلاحات کی ضرورت ہے جو بذات خود بڑا مشکل کام ہے۔ مزید برآں اس کے لئے زیادہ باصلاحیت پولیس اور قابل ججوں کی ضرورت ہے۔ شروع شروع میں نئی جیلوں کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد جب جرائم پر پورا قابو پالیا جائے گا تو ان جیلوں کی زیادہ ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ جرائم کا انسداد ہو چکا ہوگا۔

درسی کتابوں میں سزا کے چار مقاصد بیان کئے گئے ہیں:

۱۔ انصاف

۲۔ خوف

۳۔ ارتکاب جرم کی صلاحیت کی سلبی اور

۴۔ ملزم کی اصلاح

خوف سب سے زیادہ مؤثر عامل ہے جو جرائم کی شرح یا رفتار پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ جرم صرف اس وقت سرزد ہوتا ہے جب دوسرے ذرائع کے مقابلے میں جرم سے زیادہ منافع کی توقع ہو۔ چنانچہ جرم کو روکنے کی کوئی قیمت بھی اتنی زیادہ نہیں جس سے جرم بطور ایک پیشے کے زیادہ منافع بخش نہ رہے۔ کچھ لوگ خطرات مول لے کر خوش ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ارتکاب جرم میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ صرف سزا کا خوف ہی ایسا ہتھیار ہے جس سے جرم کو روکا جا سکتا ہے۔

رالف ایڈم فائین (Ralph Adam Fine) اپنی کتاب ''ایسکیپ آف دی گلٹی'' (Escape of the Guilty) میں لکھتے ہیں کہ ''سزائیں اور مجرم سے نقصان کا معاوضہ وصول کرنا فوجداری نظم انصاف کے اہم اجزا ہیں۔ جرائم کے متعلق مطالعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہم سزا کو یقینی اور فوری بنا دیں تو اس سے جرم سے متوقع منافع یا فائدے جرم کی قیمت سے کم ہو جائیں گے۔ ہمیں غربت، بیکاری اور بکھرے ہوئے خاندانوں کے خلاف اپنی مہم جاری رکھنی چاہئے لیکن سزاؤں کو نافذ کرنا اور ان کا انصاف پر بھی مبنی ہونا اشد ضروری ہے۔ سزا کے خوف کے یقینی ہونے سے مجرم خائف ہو جاتے ہیں۔

نظام انصاف کے ذریعے جرائم کی شرح کو قابو میں رکھنے کے لئے یا اسے کم کرنے کے لئے

MashalBooks.org

سزا کے امکانات اور اس کی شدت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک پیشہ ور ملزم کو ارتکاب جرم کے مواقع نظر آتے ہیں لیکن عام لوگ انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ

''جرم کوئی منافع بخش فعل نہیں انہوں نے اپنے اندر یہ اخلاقی پابندی پیدا کر لی ہوتی ہے۔ جرم کے خلاف سزا اخلاقی مزاحمت پیدا کرتی ہے۔ جیمز فٹز سٹیفن کہتے ہیں '' کچھ لوگ قتل کرنے سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ انہیں خوف ہوتا ہے کہ انہیں پھانسی مل جائے گی۔ (قتل سے کوئی فائدہ متوقع نہیں)۔ ہزاروں لاکھوں لوگ قتل سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ انہیں اس سے خوف آتا ہے (یہ اخلاقی رکاوٹ ہے)۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں یقین ہے کہ اگر وہ قتل کریں گے تو انہیں پھانسی مل جائے گی۔ (سزا کا امکان اخلاقی رکاوٹ پیدا کرتا ہے جو انسان کے ضمیر میں پہنچ کر قانون کے احترام کی عادت پیدا کرتا ہے) قانونی سزا کا ناگزیر ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ یہ اکثر لوگوں کو مجرم ''ہونے'' سے زیادہ مجرم بننے سے روکتی ہے۔ سزا اس لئے بھی ناگزیر ہے کہ اس سے قانون پر اعتماد بحال ہوتا ہے اور ممکنہ مجرموں کے لیے سزا باعث عبرت ہوتی ہے۔

ہمارے نظام انصاف کا تعلق نسبتاً دو چھوٹے گروہوں سے ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے اپنے اندر اخلاقی پابندیاں نہیں سموئیں اور وہ پیشہ ور مجرم بن گئے ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے نارمل اخلاقی پابندیاں اپنائی ہوئی ہیں لیکن تحریص کے غیر معمولی مواقع ملنے سے وہ گمراہ ہو گیا ہے۔ عادی مجرموں کو ممکنہ خطرات یا خوف سے روکا نہیں جا سکتا۔ سزا کا قانونی خوف اس لئے اہم ہے کہ یہ لوگوں کو مجرم بننے کی بجائے مجرم ہونے سے روک دیتا ہے۔ مجرم کو سزا دینا اس لئے ضروری ہے کہ قانونی خطرات پر اعتماد پختہ ہو جائے اور دوم آئندہ ممکنہ مجرم بننے والوں کو عبرت حاصل ہو۔

جرم سے حاصل ہونے والے منافع میں کمی

کتابوں میں اکثر بتایا جاتا ہے کہ جرائم کی شرح کا انحصار نفسیاتی وجوہات پر ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ نفسیاتی عوامل صرف یہ تعین کرتے ہیں کہ کون جرم کرے گا۔ وہ جرائم کی شرح کا تعین نہیں کرتے۔ جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے مقابلے میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو جرم کا

ارتکاب کر سکتے ہیں مگر وہ نہیں کرتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے بہت سے لوگ ڈاکٹر بن سکتے ہیں لیکن نہیں بنتے۔ سوال تو یہ ہے کہ اتنے سارے لوگوں میں سے چند لوگ کیوں مجرم بنتے ہیں یا بننا چاہتے ہیں؟ اس شرح کے تعین کرنے میں کون سے عوامل کام کرتے ہیں۔

دوسرے پیشوں کی طرح متوقع منافع ہی جرم کرنے والوں کی تعداد کا تعین کرتا ہے۔ جرم کا خالص منافع عدالتوں کی نافذ کردہ لاگت کو نکال کر منڈی میں مال مسروقہ کی قیمت پر ہے۔ سزا کا یہ خطرہ بذات خود جرم کی ''لسٹ پرائس'' ہے، جس میں سے سزا ملنے کے امکان کو منفی کر دیا جاتا ہے۔ املاک سے متعلق جرائم کے منافع کا انحصار مال مسروقہ کی مارکیٹ پرائس پر ہے۔ جو جرائم املاک سے متعلق نہیں وہ اس شرط کے پابند نہیں۔ ایسا معاملہ زنا بالجبر، تشدد اور اس قسم کے دوسرے جرائم ہیں جن سے مجرم اسی وقت فائدہ اٹھالیتا ہے۔ کئی جرائم ملے جلے ہوتے ہیں۔ زنا بالجبر کا مجرم اپنے شکار کو لوٹ بھی سکتا ہے۔ بہرحال جرائم کا مرکب کیسا ہی کیوں نہ ہو اس کی لاگت میں اضافہ عدالتوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ اگر مجرم کو ملنے والے منافع کو کم کر دیں تو مجرم بھی کم ہو جائیں گے۔ جب لاگت میں اضافہ ہوگا تو قانون تقلیل منافع خود بخود نافذ ہو جائے گا۔

نظریاتی اعتبار سے ہم اخلاقی پابندیوں اور تعلیم وغیرہ میں اضافہ کر کے جرائم کی تعداد کم کر سکتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر سزائیں ناگزیر ہیں۔ مثال یہ ہے کہ اگر ہم گندگی ختم کرنا چاہتے ہیں تو جگہ جگہ گندگی اکٹھی کرنے والے ڈبے رکھ سکتے ہیں لیکن جب تک سزا کا خوف نہ ہو ان کو کوئی استعمال نہیں کرے گا۔ صرف تعلیم اور ڈبوں سے کچھ نہیں ہوگا۔

مجرم اپنی پسندیدہ چیز کے حصول کے لئے غیر قانونی ذرائع بڑے باشعور طریقے سے استعمال کرتا ہے۔ غیر قانونی کام سے اسے زیادہ منافع کی توقع ہوتی ہے۔ لیکن معاشرہ بری بے شعوری سے کام لیتا ہے۔ ایک طرف تو معاشرہ جرم کو منافع بخش بناتا ہے اور دوسری طرف اس کے ارتکاب پر اعتراض بھی کرتا ہے۔ تاہم ماہرین عمرانیات اور نفسیات ہمیں یہ بتاتے نہیں تھکتے کہ مجرموں میں نہ تو کوئی شعور ہوتا ہے اور نہ وہ نفع نقصان کی پرواہ کرتے ہیں۔ اس لئے سزا کا خطرہ انہیں جرم کرنے سے نہیں روک سکتا۔ یا یہ کہ مجرم پکڑے جانے کے خطرے کو محسوس ہی نہیں کرتے۔ اس لئے انہیں سزا کا کوئی اندیشہ ہی نہیں ہوتا۔

مجرم جرائم کا ارتکاب اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں وہ پکڑے نہیں جائیں گے

MashalBooks.org

لیکن انہیں پکڑے جانے کا خطرہ ضرور لاحق ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ سزا کے لازمی ہونے اور اس کی شدت سے متاثرہ ضرور ہوتے ہیں۔

جرم کا ارتکاب کرتے وقت مجرم بھی حساب کتاب لگاتے ہیں۔ حساب کتاب کرنا ہماری سرشت میں ہے لیکن ہمیں اس سے آگہی نہیں ہوتی۔ جب ہم سستی چیز یا ریسٹورانٹ کا انتخاب کرتے ہیں تو ہم حساب کتاب نہیں کرتے کیونکہ ہم نے ایک عادت اپنالی ہوئی ہے کہ کون سی چیز کہاں سستی مل سکتی ہے۔ ایسے ہی مجرم بھی محرکات اور رکاوٹوں کو محسوس کرتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ محرک یا اس کی عدم موجودگی مختلف لوگوں پر مختلف حالات پر مختلف طریقے سے اثر انداز ہوتی ہے۔ قانون کی پابندی کرنے والوں پر اثر انداز ہونے والا عدم محرک مجرموں پر کارگر نہیں ہوتا۔ ایسے عدم محرکات جو سب لوگوں پر کام کریں ناپید ہیں۔ تاہم قانونی عدم محرک بہت سے نوجوانوں کو مجرمانہ رویے سے روک سکتا ہے۔ ان پر اکثر حرص غالب آجاتی ہے۔ لیکن ہماری سزائیں اور پابندیاں اتنی کم ہیں کہ مجرموں کو وہ اتنا نہیں روک سکتیں جتنا کہ انہیں روکنا چاہیے۔

بہت سے ملکوں کے نظام ہائے انصاف بہت کم لوگوں کو سزائیں دیتے ہیں۔ یہ سزائیں بھی ناکافی ہوتی ہیں۔ تاہم اگر نظام انصاف زیادہ موثر ہو تو بیشتر لوگ جرائم سے کنارہ کشی کرلیں گے۔ امریکی نظام تین فیصد سے کم مجرموں کو سزا دیتا ہے۔ جرم کرتے وقت ان لوگوں کے دلوں میں پکڑے جانے اور اس کے بعد سزا پانے کا خطرہ اتنا زیادہ نہیں ہوتا جو انہیں ارتکاب جرم سے روک سکے۔ یہ خطرہ وہی لوگ مول لیتے ہیں جو جرم کو پیشہ بنالیتے ہیں۔ سزا کے موجودہ امکانات جرائم کو روکنے کے لئے ناکافی ہیں۔ اگر سزاؤں میں پانچ فیصد کا اضافہ کر دیا جائے تو شرح جرائم نصف ہو جائے گی۔

ان امور کی تائید مارگن اور رینالڈ اپنی کتاب کرایم بائی چوائس 1985 (Crime by Choise) میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس امر کی شہادت موجود ہے کہ مجرم بڑے باشعور ہوتے ہیں اور اپنی سرگرمیوں کے لئے پوری ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ وہ جرائم کا انتخاب کرتے ہیں اور اپنی گفتگو میں اس کا آزادانہ اظہار بھی کرتے ہیں۔ محرکات ان میں ردعمل پیدا کرتے ہیں۔ جب گرفتاری کے خطرے، سزا کی شدت اور سزا پانے کے امکانات میں اضافہ ہوگا تو جرائم خود بخود کم ہو جائیں گے۔''

MashalBooks.org

کم سن مجرموں کو دی جانے والی رعایت اگر ختم کر دی جائے تو شرح جرائم میں خود بخود کمی واقع ہو جائے گی۔ کم سن بچوں کے خلاف مقدمات کی سماعت ان عدالتوں میں ہونی چاہیے جہاں بالغ مجرموں کے خلاف کارروائی ہوتی ہے۔

MashalBooks.org

2۔جیل بھیجنا علاج نہیں

ایک ماہرعمرانیات ڈان سی گبنز(Don C. Gibbons) جرائم کے انسداد کی مندرجہ بالا تجاویز سے اتفاق نہیں کرتے۔ان کی نظر میں یہ سب ترکیبیں آزمودہ اور بیکار ہیں۔خاص طور پر امریکہ میں یہ اتنی کارگر ثابت نہیں ہوئیں جتنی کہ ان سے توقع کی جاتی تھی۔اس مقصد کے لئے وہ امریکی نظام عدل، جیلوں اور گرفتار ہونے والے ملزموں کے اعداد وشمار سے اپنے دلائل کو تقویت دیتے ہیں۔وہ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ یہ اقدامات جرائم کی شرح کو متاثر نہیں کرتے۔

قانون پر مبنی اقدامات پر وہ غیر روایتی اقدامات کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ جاپان کی مثال دیتے ہیں جہاں شرح جرائم بہت کم ہے۔جاپان میں نظم ونسق پولیس اور نظام عدل کے ہاتھوں میں اتنا نہیں جتنا کہ اس کا انحصار وہاں کے معاشرے پر ہے۔اس معاشرے میں خاندانی استحکام اور ثقافتی روایات غالب ہیں۔تجربہ شاہد ہے کہ جاپان میں ان علاقوں میں جہاں قانونی لحاظ سے غیر رسمی اور سماجی تعلقات مضبوط اور موثر ہیں، وہاں پولیس اور نظام انصاف کے ذمے بہت تھوڑا کام ہے۔لیکن جہاں یہ عناصر موجود نہیں وہاں معاشرہ بکھرا ہوا ہے اور لوگ ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن گئے ہیں۔اس مثال کے معانی بڑے واضح ہیں۔تمام معاشروں میں خصوصاً امریکہ میں غیر رسمی سوشل کنٹرولز کو تقویت دینا ضروری ہے اور صرف حکومت اور پولیس پر انحصار اتنا مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔

مغربی معاشروں میں ہر وہ ترکیب جو انسانی ذہن سوچ سکتا ہے، انسداد جرائم کے معاملے میں بری طرح ناکام ہوچکی ہے۔ان ترکیبوں میں تاریخی لحاظ سے اہم اقدامات جیسے کوڑے مارنا،

MashalBooks.org

کالا پانی، قید کرنا یا چہرے کو داغ دینا شامل ہیں۔آج کل کے ماہرین بھی انسداد جرائم کے لئے ایسی ہی ترکیبوں کی سفارش کر رہے ہیں۔ جرائم پر قابو پانے کے روایتی طریقے بڑے متنوع ہیں۔ان کو دو زمروں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پہلا اور مقبول زمرہ وہی ہے جو انیسویں صدی میں انگلستان میں رائج تھا۔ یہ قانون شکن اور ممکنہ قانون شکن اشخاص کے دلوں میں دہشت اور تشدد کے ذریعے جرم کے خلاف خوف پیدا کرنا ہے اور معاشرے کو پیشہ ور مجرموں سے پاک صاف کرنا ہے۔

کچھ لوگ ان اقدامات پر احتجاج کرتے ہیں تاہم یہ اتنے بیہمانہ نہیں جتنے کہ روس میں ہوا کرتے تھے۔ یہ امر اہم ہے کہ بحالی کے پروگراموں کے تحت ان کی قانون شکنی کی ذمہ داری ختم نہیں ہونی چاہیئے۔

دوسرا طریقہ معاشرے کے ساتھ مریضوں جیسا سلوک روا رکھنا اور یہ فرض کرنا ہے کہ جرائم معاشرے کا ہی عکس ہیں۔ اس سے مجرموں کی بحالی اور ان کی معاشرے میں ہم آہنگی کے اقدامات کی طرف توجہ مبذول ہوجائے گی اور قانون شکن اشخاص مجرمانہ سرگرمیوں سے دست کش ہوجائیں گے۔

کیون این۔ رائٹ انسداد جرائم کے موجودہ اقدامات کو عبث خیال کرتے ہیں۔ وہ ان پر اخراجات کو فضول خرچی تصور کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ان سے جرائم کم نہیں ہوں گے۔

ایلیٹ کری بھی پوچھتے ہیں کہ کیا بہت سے لوگوں کو جیل میں بند کرنے سے ہم جرائم پر قابو پالیں گے؟ ان کے مطابق ہم جرائم کی شرح میں کوئی نمایاں کمی نہیں کرسکتے۔ اکثر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ جرائم کی لاگت بڑھانا بڑا سادہ سا کام ہے یعنی ایسے ہی جیسے ٹیکس کم کرنا یا دفاع پر زیادہ رقم خرچ کرنا۔ لیکن تحقیق روز بروز یہ واضح کررہی ہے اور جرمیات کے ماہرین بھی متفق ہیں کہ ایسا کرنے سے جرائم کی شرح میں بڑی خفیف سی کمی ہوگی۔

کئی مغربی ممالک جرائم کی شرح کو کم کرنے کے لئے صحیح جانب پیش قدمی کررہے ہیں۔ ان کی جرائم کم کرنے کی یہ ترکیبیں زیادہ تر سیاسی اور نظریاتی ہیں۔اقتصادی اور معاشرتی اصلاحات مستقبل کی واحد اُمید ہے۔

MashalBooks.org

3۔منشیات پر سے پابندی اٹھانا

منشیات، ان کا استعمال اور ان کی خرید وفروخت ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ضیاء الحق والے مارشل لا اور افغانستان کی جنگ کے بعد پاکستان میں بھی یہ مسئلہ بڑے وسیع پیمانے پر پھیل گیا ہے اور قومی مسئلہ بن چکا ہے۔اخبارات کی اطلاع کے مطابق پاکستان میں منشیات کو استعمال کرنے والوں کی تعداد دس لاکھ ہو چکی ہے۔منشیات کے عادی کئی لوگ خودکشی کر چکے ہیں، قتل کر چکے ہیں اور چوری، ڈکیتی اور راہزنی میں ملوث پائے گئے ہیں۔سیر وتفریح کے صحت مند مواقع کی غیر موجودگی کی بنا پر نوجوان نسل ادھر دوڑی چلی آرہی ہے۔

دوسری طرف منشیات نے ایک غیر قانونی دھندے کی صورت اختیار کر لی ہے جس میں ہمارے قانون ساز اداروں کے اراکین اور سیاست دان بھی شامل ہیں۔ اخبارات کی حالیہ اطلاعات کے مطابق ایسی وارداتیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں جن میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اراکین کے علاوہ ہماری ہوائی فوج کے کچھ افسران بھی ملوث پائے گئے ہیں۔ یہ سب وہ وارداتیں ہیں جو منظر عام پر آچکی ہیں۔اوپر ذکر آچکا ہے کہ منظر عام پر آنے والی ہر واردات کے پیچھے کم ازکم دس سے لے کر پچاس وارداتیں اور ہوتی ہیں جن کا قانون نافذ کرنے والوں یا عوام کو پتا ہی نہیں چلتا۔اس سے بھی اس مسئلے کی شدت کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔

حکومت نے اس مسئلے پر قابو پانے کی پوری کوشش کی ہے لیکن اس ''بیماری'' کا سد باب کرنے میں بوجوہ ناکام ہو چکی ہے۔

علاج کے نام پر ایسے مراکز بھی وجود میں آگئے ہیں جہاں منشیات کے عادی لوگوں کو بظاہر

علاج علاج کی خاطر رکھا جاتا ہے۔ ہماری اخباروں میں روزانہ ان کے اشتہارات آتے ہیں۔ یہ بھی عوام اور ان بدقسمت لوگوں کے بدقسمت لواحقین کو لوٹنے کا ایک ''قانونی'' کاروبار ہے۔ یہاں مریضوں کو باقاعدگی سے منشیات فراہم کی جاتی ہیں۔

نیڈل مان (Nadel Mann) کا خیال ہے کہ منشیات سے پابندی اٹھانے سے جرائم کو کم کیا جاسکتا ہے۔ اس پابندی کی وجہ سے منشیات استعمال کرنے والا ہر شخص مجرم بن جاتا ہے۔ پابندی کی وجہ سے منشیات کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ منشیات کے عادی لوگ ان گراں قیمت اشیا کو خریدنے کے لئے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس سے منظّم جرائم پیدا ہوتے ہیں۔ اس پابندی کو نافذ کرنے والے سرکاری کارندے بددیانت اور راشی ہوجاتے ہیں۔ یہ معاملہ سراسر ٹیکنیکل بن جاتا ہے اور یہ علاج نہیں۔ اس طرح تمام قوانین منسوخ کردیں تو سب جرائم ختم ہوجائیں گے۔ جناب نیڈل مان کی یہ دلیل خاصی کمزور ہے۔

منشیات اور جرائم ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اکثر لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ جرائم منشیات کا لازمی نتیجہ ہیں۔ تاریخی لحاظ سے منشیات سے متعلقہ جرائم کا تعلق منشیات کے مقابلے میں ان سے متعلق قوانین سے زیادہ ہے۔ منشیات اور جرائم میں ربط کی چار صورتیں ہیں جن میں سے تین اسی وقت ختم ہوجائیں گے جب منشیات پر سے پابندی اٹھالی جائے گی۔

منشیات کا پہلا تعلق تشدد اور دوسرے جرائم سے ہے۔ ان جرائم کا ارتکاب منشیات کا عادی ان کے اثرات کے تحت کرتا ہے۔ یہی وہ تعلق ہے جو عوام کو نظر آتا ہے۔ منشیات سے جرائم کا یہ تعلق ان پر سے پابندیاں اٹھانے کے بعد بھی باقی رہے گا۔ یہ درست ہے کہ منشیات کے عادی، لوگوں کی فطری رکاوٹ اور ذمہ داری کے احساس کو کم کرکے جارحانہ اور سماج دشمن رجحانات کو تقویت دیتے ہیں اور جرائم کی طرف راغب کرتے ہیں۔ لیکن منشیات میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو شراب سے زیادہ کسی پرتشدد جرم کی طرف راغب کرتی ہو۔ امریکہ اور دوسرے بیشتر ممالک میں شراب پر کوئی پابندی نہیں۔ 1982 کے ایک جائزے کے مطابق امریکہ میں پرتشدد جرائم میں ملوث مجرموں میں سے 54 فیصد نے شراب کے نشے کی حالت میں ارتکاب جرم کیا تھا۔

جن جرائم کا ارتکاب منشیات کے عادی کرتے ہیں ان میں چوری، راہزنی، نقب زنی اور عصمت فروشی شامل ہیں۔ یہ جرائم منشیات خریدنے کے لئے کئے جاتے ہیں جو اس وقت بہت مہنگی

MashalBooks.org

ہیں۔ کوکین اور ہیروئن کے عادی سینکڑوں بلکہ ہزاروں ڈالر فی ہفتہ خرچ کرتے ہیں۔ اگر منشیات سستی ہو جائیں تو وہ جرائم خود بخود کم ہو جائیں گے جن کا ارتکاب ان کے عادی مجرم کرتے ہیں۔

منشیات اور جرائم کا ایک تعلق ان گروہوں سے ہے جو ان کو فروخت کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بد دیانت بناتے ہیں۔ منشیات کی غیر قانونی منڈیاں اکثر تشدد کا استعمال کرتی ہیں۔ چونکہ ان کی باہمی جھگڑوں کے فیصلے کرنے والا کوئی ادارہ نہیں اس لئے وہ اپنے فیصلے تشدد ہی کے ذریعے کرتے ہیں اور مجرمانہ رجحانات رکھنے والے دوسرے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔

پابندیوں کے یہ تجربات ان دنوں ہو چکے ہیں جب امریکہ نے شراب پر مکمل پابندی عائد کی تھی۔ اس سے شراب کی خفیہ کشید، درآمد اور فروخت شروع ہو گئی تھی۔ ان دنوں یہ گینگ ایک دوسرے پر اسی طرح حملے کرتے تھے جیسے آج کرتے ہیں۔ ایک گینگ دوسرے کا ناجائز اور غیر قانونی مال لوٹ کر لے جاتا تھا۔

شراب کی ناجائز کشید کا کاروبار ہمارے ہاں اور پورے ہندوستان میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ وہاں شراب پر جزوی پابندی ہے۔ چنانچہ ناجائز شراب پی کر وہاں ہزاروں افراد موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ پاکستان میں اقلیتوں کو چھوڑ کر شراب پر مکمل پابندی ہے لیکن یہ دیسی طریقے سے کشید ہو کر بک رہی ہے اور پینے والوں کی موت کا سبب بن رہی ہے۔ اقلیتی برادریوں کے افراد اسے پرمٹ پر خرید کر دوسروں کو مہنگے داموں بیچ دیتے ہیں۔ اس کی سمگلنگ بھی ہوتی ہے۔ اسلام آباد میں کئی سفارت خانے اس کام میں ملوث ہیں۔ کسٹمز اور ایکسائز کا عملہ بھی اس غیر قانونی دھندے میں ملوث ہے۔ چنانچہ جہاں ''نظریاتی'' طور پر شراب پینا غیر قانونی ہے وہاں عملی طور پر دوسرے قوانین کی طرح جیسے گھڑ دوڑ، جہیز اور شادی بیاہ کے کھانوں پر پابندی کا تمسخر ہمارے قانون ساز خود اڑاتے ہیں۔ یہ قانون بھی ناقابل عمل ہے۔ ایک برائی کو ختم کر کے ہم نے کئی اور برائیاں مول لے لی ہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ امر ہے کہ ایسے قوانین بنانا جو ناقابل نفاذ ہوں قانون کے احترام کو کم کرتا ہے اور قانون شکنی کے رجحانات کو بڑھاوا دیتا ہے۔ پاکستان میں قانون کی موجودہ تذلیل کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

امریکہ میں منشیات بہت بڑا مسئلہ ہے اور وہاں کی بدبخت اقلیتوں کے محلے کے محلے ان

MashalBooks.org

قوانین کا شکار ہیں۔ یہ قوانین اس کے استعمال کو روک نہیں سکے۔ عادی لوگوں کے مقابلے میں منشیات کا دھندا کرنے والے متحارب گروہ قانون شکنی کے زیادہ مرتکب ہوتے ہیں۔ ان محلوں میں رہنے والے لوگ ان متحارب گروہوں کو ہیرو سمجھنے لگتے ہیں۔ بچے ان کو اپنا ماڈل بنا لیتے ہیں۔ بالغ لوگوں پر قانون کے سخت نفاذ کی بنا پر لوگ بچوں کو منشیات بیچنے پر لگا دیتے ہیں۔ پھر یہی بچے خود منشیات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اگر منشیات پر سے پابندی اٹھالی جائے تو وہ جرائم خودبخود ختم ہو جائیں گے جن کا ارتکاب منشیات کا دھندا کرنے والے یہ گروہ کرتے ہیں۔ امریکہ یہ تجربہ شراب پر پابندی اٹھانے سے پہلے ہی کر چکا ہے۔ اس پابندی کو ختم کرنے سے پولیس اور اس کا نفاذ کرنے والوں میں کرپشن اور بددیانتی کے جرائم بھی ختم ہو جائیں گے۔

''ان خیالات کی تائید ملٹن فرائیڈ میں مجلّہ ''ریزن'' (Reason) میں اکتوبر 1966ء میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''منشیات پر سے پابندی اٹھانے سے ان بے شمار لوگوں کو فائدہ ہوگا جو ان کے عادی نہیں ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ان گروہوں اور منشیات کے عادی لوگوں کے ہاتھوں لٹتے ہیں اور وہ جو اس وجہ سے بددیانت ہوتے ہیں۔ پابندی اٹھانے سے قانون نافذ کرنے والے اداروں میں کرپشن بھی ختم ہو جائے گی۔ ان قوانین کے نفاذ پر خرچ ہونے والی کثیر رقم بھی بچ جائے گی جسے دوسرے فلاحی کاموں پر لگایا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد کئی ملین ہے جو منشیات استعمال نہیں کرتے لیکن ان قوانین کے ہاتھوں خسارے میں ہیں۔''

اس ساری بحث میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ایسے قوانین وضع کرنے سے جن کا نفاذ مشکل ہو یا ہو سکتا ہو، خود قانون کا احترام ختم ہو جاتا ہے اور معاشرے میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے۔ پاکستان میں یہی ہو رہا ہے۔

4۔ پابندی اٹھانے کی مخالفت

کچھ لوگ، منشیات پر سے پابندیاں ختم کرنے کی مخالفت کرتے ہیں۔

منشیات پر پابندیوں کی مخالفت کرنے والوں کے دو مکاتب فکر ہیں۔ ایک پرانا اور ایک نیا۔ پرانا مکتب ''ہرے راما ہرے کرشنا'' والے زمانے میں زوروں پر تھا۔ پابندیوں کے خلاف ان لوگوں کے دلائل یہ تھے:

ا۔ یہ انفرادی آزادی کا مسئلہ ہے۔

۲۔ معاشرے کے لئے نتائج سے لاتعلق ہو کر لوگوں کو حق حاصل ہے کہ وہ کون سی دوا استعمال کریں اور کون سی استعمال نہ کریں۔

۳۔ منشیات اتنی خطرناک نہیں ہے جتنی کہ وہ سمجھی جاتی ہیں۔

۴۔ معاشرے میں ان کی اشد ضرورت ہے۔

۵۔ یہ کمزور لوگوں کے خلاف طاقتور لوگوں کی سازش ہیں۔

۶۔ لوگ منشیات استعمال ہی اس لئے کرتے ہیں کہ یہ غیر قانونی ہیں لیکن یہ سوچ اب ختم ہو چکی ہے۔

دوسرے مکتب فکر کے دلائل یہ ہیں:

ا۔ منشیات کو روکنے کی سب تدبیریں ناکام ہو چکی ہیں۔

۲۔ ان پر پابندیاں لگانے پر بہت اخراجات اٹھتے ہیں اور معاشرے کو ان کا کوئی فائدہ نہیں۔

یہ سب دلائل ناکامی اور خوف پر مبنی ہیں اور تاریخی تجربے، عمرانی اور معاشرتی حقائق کو نظرانداز کرتے ہیں۔ یہ منشیات کے نفسیاتی اور حیاتیاتی اثرات اور منشیات کے متعلق حالیہ تجربات کی نفی کرتی ہیں۔

MashalBooks.org

جولوگ منشیات پر سے پابندیاں ختم کرنا چاہتے ہیں ان کی ناکامی اور نا اُمیدی قابل فہم ہے لیکن پابندی اٹھانے کا مطالبہ نا قابل فہم ہے۔

پابندی کے خلاف دلائل کو جب انسانی تجربے اور تاریخ کے سیاق وسباق میں دیکھا جاتا ہے تو وہ باطل ٹھہرتے ہیں۔

منشیات پر سے پابندی اٹھانے کا مطالبہ کرنے والوں کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ منشیات کے خلاف جنگ جیتی نہیں جاسکتی، اس لئے پسپائی اختیار کر کے مزید نقصانات سے بچنا چاہئے۔

تاریخ اور تجربے کے پیشِ نظر اس وبا کو ختم کرنے کے لئے سخت اقدامات کرنے ہوں گے۔ لوگوں کو ان کے نقصانات سے خبردار کرنا ہوگا اور عادی لوگوں کی بحالی کے لئے پروگرام شروع کرنے ہوں گے۔ پابندی اٹھانے سے منشیات کا استعمال اور بڑھے گا اور اس سے جرائم میں مزید اضافہ ہوگا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ صرف قانون کی مدد سے یہ جنگ جیتی نہیں جاسکتی اور اس کے لئے انسدادی، تعلیمی اور بحالی کے پروگرام شروع کرنے ہوں گے۔

تجربے نے اس خیال کو جھٹلا دیا ہے کہ پابندی اٹھانے سے منشیات سستی ہو جائیں گی۔ انگلستان میں عادی لوگوں کو محدود مقدار میں ہیروئن مہیا کرنے سے ایک مضبوط بلیک مارکیٹ قائم ہوگئی تھی۔ یہ بھی غلط ہے کہ منشیات کی قیمت کم کرنے سے جرائم کم ہو جائیں گے۔ سستی منشیات سے تو جرائم میں اضافہ ہی ہوگا۔

ایمسٹرڈم میں یہی ہوا۔ پابندی کا نفاذ نہ کرنے سے اور منشیات کی آسان اور سستی دستیابی سے جرائم میں اضافہ ہی ہوا۔ عادی لوگ جو پہلے منشیات خریدنے کے لئے انہیں فروخت کر کے پیسے اکٹھے کرتے تھے، اب چوریاں کر کے خریدتے ہیں۔ ''مجرمانہ رویے اور سوشیوپیتھی منشیات کے استعمال کا ہی نتیجہ ہیں۔ یہ انسانی سوچ کے عمل کو برباد کر دیتی ہیں۔

شراب پر پابندی کا منشیات پر پابندی سے مقابلہ کرنا بالکل غلط ہے۔ شراب پر پابندی کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ شراب ایک مقبول عام مشروب ہے جس کے پیچھے ایک لمبی ثقافتی تاریخ ہے، اور امریکہ میں اس پر کسی اتفاق رائے کے بغیر پابندی لگائی گئی تھی۔ جیسا کہ ان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے، یہ خیالات ایک پیشہ ور وکیل کے نظر آتے ہیں۔ جرمیات کے ماہرین کے تجزیوں سے انہیں دور کا واسطہ بھی نہیں۔

5۔ بے روزگاری اور جرائم

بے روزگاری کے خاتمے سے جرائم کم ہو سکتے ہیں؟

کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ نوجوانوں کے لیے ملازمتوں کے پروگرام شروع کر کے جرائم کو کم کیا جا سکتا ہے۔ ان کے دلائل یہ ہیں:

کسی کو اس بات پر شک نہیں کہ بے روزگاری جرائم پیدا کرتی ہے۔ جتنی بے روزگاری زیادہ ہوگی اتنے ہی جرائم بھی زیادہ ہوں گے۔ بے روزگاری سے پیدا ہونے والی ناکامی اور نا اُمیدی کے احساسات مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتے ہیں: چوری، منشیات، کثرت شراب نوشی، بیوی بچوں کی مار پٹائی وغیرہ۔ بے روزگاری کو ختم کرنے والے پروگراموں سے جرائم میں بھی کمی ہوگی۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ خواہ بے روزگاری زیادہ ہو یا کم جرائم کی شرح بلند ہی رہتی ہے۔ ماہرین یہ بھی جانتے ہیں کہ مجرموں میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ وہ نوجوان ہیں جو خطرے کے دائرے کے اندر ہوتے ہیں (یعنی At-Rist) یہ کسی وقت بھی بے راہ رو ہو سکتے ہیں۔ سماجی، اقتصادی یا تعلیمی مسائل کی بنا پر یہ نوجوان سکول چھوڑ دیتے ہیں اور لیبر مارکیٹ سے باہر ہی رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں خطرہ ہے کہ وہ بے راہ رو ہو جائیں گے اور جرائم پیشہ بن جائیں گے۔ اس مسئلے کو حل نہ کر سکنے سے پوری قوم خطرے سے دوچار ہو سکتی ہے۔

امریکہ میں نوجوانوں کے متعلق اعداد و شمار آنے والے بحرانوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن

MashalBooks.org

کے حل کی بے اندازہ معاشرتی اور اقتصادی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ وہاں ہر سال سات لاکھ لڑکے ہائی سکول چھوڑ جاتے ہیں اور تین لاکھ مسلسل غیر حاضر رہتے ہیں۔ اقلیتوں میں یہ شرحیں اور بھی زیادہ ہیں۔ جاپان میں حالات بڑے مختلف ہیں۔ وہاں ہر لڑکا ہائی سکول پاس کر کے نکلتا ہے اور ناخواندگی کی شرح صفر کر برابر ہے۔

امریکی نوجوانوں کی زندگی پر ناکامی اور جرم چھایا ہوا ہے۔ امریکہ میں بڑے جرائم کی نصف سے زیادہ تعداد میں 21 سال سے کم عمر کے نوجوان ملوث ہوتے ہیں۔ ان جرائم کا شکار ہونے والے بھی اسی عمر کے نوجوان ہوتے ہیں۔ کئی دہائیوں سے نوجوانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد جرائم میں ملوث ہورہی ہے۔ 1960 اور 1980 کے درمیان منشیات میں گرفتار ہونے والوں کی تعداد میں 6000 فی صد کا اضافہ ہوا اور ہائی سکولوں کے سینئر طلبا کی شراب نوشی میں 200 فیصد اضافہ ہوا ہے۔

یہ سارا مسئلہ الجھا ہوا اور بڑا پیچیدہ ہے۔ اس کے عوامل کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کو علیحدہ علیحدہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ نوجوان جو منشیات استعمال کرتے ہیں سکول میں اچھی کارکردگی نہیں دکھاتے اور اس امر کا قوی امکان ہے کہ وہ مجرمانہ روش کی طرف راغب ہوجائیں۔ ان کے لیے باقاعدہ روزگار کے مواقع بھی کم ہوجاتے ہیں۔ ان نوجوانوں کے لئے جو تعلیم ترک کر دیتے ہیں، روزگار کے مواقع اور بھی کم ہیں اور جرائم اور منشیات میں ملوث ہو جانے کے خطرات زیادہ ہیں۔ اس طرح یہ سب عوامل مل کر سماج دشمنی اور خود شکستگی کے ایک دائرے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دائرے میں نوجوان کسی بھی مقام پر یعنی منشیات کا استعمال، خفیف جرائم کا ارتکاب یا سکول میں تعلیم ترک کر کے داخل ہوسکتے ہیں۔ اگر وہ اس چکر میں رہنا جاری رکھیں تو ان کی زندگیوں میں سماج دشمن سرگرمیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس قسم کی سرگرمیاں دوسری غیر صحت مند سرگرمیوں کو تقویت دیتی ہیں۔ جتنی دیر نوجوان اس دائرے میں رہے گا اس کے لئے اس سے نکلنا اتنا ہی مشکل ہوجائے گا۔ امریکہ میں ایک ادارہ نیشنل الائنس آف بزنس ہے جو اس دائرے پر بے روزگاری کے مقام پر حملہ کر کے اسے توڑنا چاہتا ہے۔ ان کی نظر میں امریکی قوم کے حال اور مستقبل میں شرح پیداوار، اقتصادی مسابقت اور عمرانی استحکام کے لئے بے روزگاری کی اتنی بلند شرح بہت خوفناک مضمرات کی حامل ہے۔ اس مسئلے کے حل کے

لئے سرکاری، غیرسرکاری لیڈروں اور خاندانی تنظیموں میں اشتراک عمل بہت ضروری ہے۔ اس مسئلے کو انفرادی طور پر حل نہیں کیا جاسکتا۔ ان خطرات میں گھرے ہوئے نوجوانوں کو اقتصادیات کے بڑے دھارے میں شامل کرنے سے جرائم، منشیات اور دوسرے ناپسندیدہ رجحانات میں کمی کی جاسکتی ہے۔

MashalBooks.org

6۔شہریوں کی انسدادی کارروائی

شہریوں کے اقدامات سے جرائم کم کیئے جاسکتے ہیں۔

کچھ ماہرین جرمیات ایسے بھی ہیں جن کے خیال میں جرائم کی شرح میں اضافے کے اسباب میں بکھرے ہوئے خاندانوں، سکولوں اور معاشرے میں تمام روایتی اقدار کا فقدان اور کردار کی تعمیر میں ناکامی شامل ہیں۔ معاشرتی احساس کی بحالی اور افراد کی خود مرکزیت کے خاتمے سے ہی جرائم کو کم کیا جاسکتا ہے۔

یہ ماہرین جرائم کو کم کرنے کے لئے کوئی امرت دھارا تجویز کرنے کی طرف مائل نہیں ہیں کیونکہ انہیں ان ساری تجاویز کا علم ہے جو عام آدمی تعمیمات کی صورت مُں پیش کرتے ہیں، جیسے زیادہ سے زیادہ مجرموں کو سزائے موت، زیادہ شدید سزائیں وغیرہ۔ سموئیل واکر اپنی کتاب ''سینس اینڈ نان سینس اباؤٹ کرائم''(Sense and Non sense about Crime) میں ایسے اقدامات کا ایک خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ ماہر جرمیات رابرٹ مارٹیسن نے بحالی کے تمام پروگراموں کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ واشگاف اعلان کیا کہ یہ سب پروگرام ناکام ہوگئے ہیں۔ طالب علم اور عوام بھی ان ماہرین کی وجہ سے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ایسے سب پروگرام بے کار ہیں۔

جرائم میں تخویف کے لئے ماہرین کلچر غیر رسمی معاشرتی پابندیوں اور سوشیو اکنامک سسٹم میں بڑے وسیع پیمانے پر تبدیلیاں تجویز کرتے ہیں۔ لیکن ان پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی بنیادی تبدیلیاں کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ ولسن اور ہیرنسٹائن اپنی کتاب ''کرایم اینڈ ہیومن نیچر'' Crime and Human Nature میں کہتے ہیں کہ امریکہ میں پچھلے بیس برسوں میں جرائم میں اضافے

MashalBooks.org

کی وجہ کلچر میں ایسی تبدیلی ہے جس کی بنا پر نوجوانوں کا رجوع ضبط نفس کی بجائے اظہار ذات کی طرف زیادہ ہو گیا ہے۔

لیکن یہ صرف مرض کی تشخیص ہے، علاج نہیں کیونکہ کلچر میں تبدیلیاں پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

نظام عدل مین سرکاری تبدیلیوں کی بجائے غیر رسمی معاشرتی پابندیوں میں اضافے سے یہ امکان ہے کہ جرائم میں کمی واقع ہو جائے۔ قانون کا احترام کرنے والے لوگ جیل جانے اور گرفتاری کے خوف سے جرائم سے گریز نہیں کرتے بلکہ وہ اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ معاشرے میں کچھ اہم لوگ انہیں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ چنانچہ جرائم میں اضافے کی وجہ نظام عدل کی کمزوری کے علاوہ غیر رسمی معاشرتی پابندیوں کی کمزوری ہے۔

عوام اکثر پرانے دنوں کو یاد کرتے ہیں جب شرح جرم کم تھی۔ ان کے خیال میں جرائم میں اس کمی کی وجہ ماضی کا بہتر نظام عدل تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جرائم کی اس شرح کی کمی کی وجہ موثر معاشرتی پابندیاں تھیں۔ خاندانوں، مسجدوں، مکتبوں، سکولوں وغیرہ میں ہر شخص دوسرے کو جانتا تھا، آپس میں میل جول رکھتا تھا اور اس میل جول میں ہر شخص دوسرے پر نادانستہ طور پر نظر بھی رکھتا تھا۔ اس طرح نوجوانوں کی بہتر نگرانی ہو سکتی تھی اور ان کے بے راہ رو ہونے کا خطرہ بہت کم ہو جاتا تھا۔

چین اور جاپان میں جرائم اس لئے کم نہیں کہ ان کا نظام عدل بہتر ہے۔ ان کو ایسی روایتی پابندیوں کی اتنی ضرورت نہیں کیونکہ ان کی اپنی معاشرتی پابندیاں بڑی موثر ہیں۔ ان میں باہمی میل جول زیادہ ہے۔ وہ اپنے نوجوانوں کی بہتر نگرانی کر سکتے ہیں۔

چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں، جہاں آبادی تھوڑی ہوتی ہے، وہاں نوجوانوں کا ہر قدم گنا جاتا ہے اور ایک ایک نظر کا حساب رکھا جاتا ہے۔ اس طرح بھٹکنے والے یا بھٹکے ہوئے اشخاص کا فوراً پتا چل جاتا ہے۔

۱۔ آج کل کی معاشرتی زندگی میں لوگوں کے رویے کی تین صورتیں ہیں۔

۲۔ ہمیں نہیں پتا اور نہ ہمیں معلوم ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔

۳۔ اگر ہمیں پتا بھی ہے تو ہمیں کیا؟

اگر ہمیں معلوم بھی ہے تو ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا کریں۔

MashalBooks.org

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی اپنی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ ہمارا پڑوسی کیا کر رہا ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ہماری زندگی میں جھانک کر دیکھے اور نہ ہم کسی کی زندگی میں جھانکنا چاہتے ہیں۔ ہمیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے ہمسائے کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کیا کرتے ہیں، کن مسائل سے دوچار ہیں اور ہم ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟

دوسری صورت ذرا زیادہ مشکل ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہم کوئی جزیرہ نہیں ہیں اور اس پر ان کو ملامت نہیں کرتے تو ہم جرم کے لئے ایک سازگار ماحول پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ جب ہم دوسروں کے مجرمانہ کردار کو اس لئے نظر انداز کرتے ہیں کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں اور ہمیں اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تو اس وقت ہمیں حیران نہیں ہونا چاہئے جب خود ہمیں تکلیف پہنچے اور دوسرے اس کا احساس نہ کریں۔

تیسری صورت اور بھی مشکل ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ جب ہمیں مجرمانہ سرگرمی کا پتا چلے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اگر ہم مجرم کو روکیں تو وہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اگر پولیس کو اطلاع دیں تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو متحرک کرنے کے لئے شہادت ناکافی ہے یا معاملہ بڑا معمولی ہے جیسے ایک طالب علم کا دوسرے کو چرس بھرا سگرٹ دینا۔

ان تینوں صورتوں سے نمٹنے کے لئے ہمیں رواداری، برداشت اور ایک دوسرے کے کام آنے والا رویہ اپنانا چاہئے۔

MashalBooks.org

7۔معاشرتی تنظیمیں

جرائم کم کرنے کی ایک تجویز یہ ہے کہ معاشرہ خود ایسی تنظیمیں قائم کرے جن سے جرائم پیشہ اور جرائم کا آئندہ ارتکاب کرنے والے لوگوں کو راہ راست پر لایا جاسکے۔ سال 1968 میں نیویارک کے علاوہ برونکس میں ایسی ہی ایک تنظیم کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کا نام آرگس (Argus) ہے۔ یہ اپنے مقاصد میں کافی حد تک کامیاب ہے اور اب بھی بڑی کامیابی سے چل رہی ہے۔ اس کو چلانے والی دو خواتین ہیں: ایک کا نام ایلیزبتھ للٹن سٹروز ہے۔ وہ اس کی ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی امداد کرنے والی میری ٹیلر ہیں جو خود بھی منشیات کی عادی رہ چکی ہیں اور خفیف جرائم کا ارتکاب بھی کرتی رہی ہیں۔

ان دونوں خواتین کا خیال ہے کہ مناسب دیکھ بھال کر کے نابالغوں اور بالغوں کو بھی جرائم کے ارتکاب سے روکا جاسکتا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ ایسی تنظیمیں قائم کرنے کی انسانی اور معاشرتی وجوہات ہیں۔ اگر ان کو مناسب وسائل مہیا کیے جائیں اور ان کو بڑی احتیاط سے چلایا جائے تو یہ اپنے مقاصد میں بڑی کامیاب ثابت ہوسکتی ہیں۔ ان نوجوانوں میں جن کی آرگس نے مدد کی ہے تقریباً ایک تہائی رہزنی، مجرمانہ حملوں اور منشیات میں ملوث تھی۔ بہت سے ایسے نابالغ بھی تھے جن کے متعلق عدالتوں کا خیال تھا کہ ان کو نگرانی کی ضرورت ہے یا ان بچوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا ہے۔ ان کے خاندانوں والے ان سے دست بردار ہو چکے ہیں یا وہ غفلت کا شکار ہیں۔ یہ سب منشیات کے عادی تھے۔ سب تعلیم چھوڑ چکے تھے۔ تقریباً ایک تہائی ایسے بھی تھے جن کے گھر والے یا رشتے دار انہیں وہاں چھوڑ گئے تھے کیونکہ وہ ان کے غلط رویوں کو

MashalBooks.org

برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اُمید تھی کہ آرگس کی مدد سے وہ راہ راست پر آجائیں گے۔ آرگس ان سب لوگوں کی مدد کرنے میں کافی کامیاب ہوئی۔

اس تنظیم کا طریقہ کار یہ تھا کہ اس نے پہلے ان سب لوگوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تا کہ وہ صحت یاب ہوسکیں، نئے طور طریقے سیکھیں، نئی مہارتیں حاصل کریں اور اپنا اور دوسروں کا احترام کرنا سیکھیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کو معاشرے میں واپس بھیج دیا گیا جہاں وہ کامیاب ہوئے اور آگے بڑھتے گئے۔ جو ایسا نہ کر سکے انہیں یہ تنظیم پھر اپنے پاس واپس لے آئی تا کہ ان کی دوبارہ اصلاح کی جا سکے۔ ان خواتین کا خیال ہے کہ ایسی تنظیمیں صرف غریب غربا کے لئے ہی وقف نہیں ہونی چاہئیں۔ ان میں درمیانے طبقے کے بچوں کے لئے بھی گنجائش ہونی چاہئے کیونکہ وہ بھی اقدار کی شکست، پس ماندگی، بدسلوکی، تشدد اور جرائم کا شکار ہیں یا ہوسکتے ہیں۔

ایسی تنظیمیں بھٹکے ہوئے نوجوانوں میں نئی مثبت اقدار پیدا کر سکتی ہیں۔ مثبت اقدار سے مراد قانون کا احترام، اپنی توانائیوں کو مثبت طریقے سے استعمال کرنا اور مشکل میں گھرے ہوئے لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ ان تنظیموں کو توسیع یافتہ خاندانوں کی صورت میں ہونا چاہئے تا کہ ان لوگوں کی ماضی کی محرومیوں کا ازالہ ہو سکے۔

ان تنظیموں کو موثر طریقے سے چلانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان میں وہ سب عناصر موجود ہوں جن کا گھروں، سکولوں اور نظام عدل میں فقدان ہے۔

ایک کامیاب معاشرے کا امتحان اپنے نوجوانوں کو اپنے اندر جذب کرنا اور انہیں اپنے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے۔ یہی وہ کام ہے جو اکثر معاشرے سرانجام نہیں دے رہے۔ اگر ہمیں ترقی کرنا ہے یا اس کرہ ارض پر رہنا ہے تو ہمیں یہ کام کرنا ہوگا۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا کام ہے لیکن کسی راہنمائی یا سہارے کے بغیر ایک چاردیواری میں الگ تھلگ رہتے ہوئے نابالغ مائیں، نانیاں یا والدین اسے اکیلے سرانجام نہیں دے سکتے۔

ان لوگوں کے ماضی میں جھانکنا فضول ہے۔ یہ لوگ اپنی اچھی خدمت کر سکتے ہیں۔ اپنے لاثانی تجربات پر خواہ وہ کتنے ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہوں، اپنی توجہ مرکوز کر کے محسوس کریں کہ واقعی وہ کتنے طاقتور ہیں کہ ان خوفناک تجربات سے صحیح سلامت گزر گئے۔ اس طاقت کو استعمال کر کے وہ اپنا نیا حال اور نیا مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں۔

MashalBooks.org

8۔ ماحولیاتی ڈیزائن میں تبدیلی

کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ شہروں میں سٹورز اور رہائشی عمارتوں کو نئے طریقے سے ڈیزائن کر کے جرائم میں کمی کی جا سکتی ہے۔

انگلستان، امریکہ اور کئی دوسرے مغربی ممالک میں اس خیال کے تحت کہ شہر کے گندے علاقے جرائم کی نرسریاں ہیں، شہری منصوبہ بندی کرنے والوں نے انہیں گرا کر وہاں نئے ڈیزائن کی بلند و بالا تر عمارات تعمیر کر دیں۔ روشنی کا بھی بہتر انتظام کیا گیا اور ان علاقوں میں گشت کرنے والی پولیس کی نفری میں بھی اضافہ کیا گیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی جرائم پھر بھی یہاں پھولتے پھلتے رہے اور کسی طرح بھی کم ہوتے نظر نہیں آتے تھے۔

ماہر تعمیرات آسکر نیومین (Oscar Newman) نے اپنی کتاب ڈیفنس ایبل پلیس (Defensable Place) میں عمارات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور انہیں گمراہی پر مبنی قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ "شہری ماحول کے نئے ڈیزائن معاشرے کو اپنا شکار بنانے کے لئے شاید مجرموں کے بہترین معاون ہیں۔ بہتر روشنی، زیادہ پولیس اور مضبوط تر تالے جرائم کا تدارک نہیں کر سکتے۔"

نیومین کو یقین ہے کہ قابل مدافعت جگہ کو اپنے مقام سے متعلق شدید تر لیکن خفیہ جذبات کو ابھارنا اور شہریوں کو جرائم کے خلاف مزاحمت کے لئے بیدار کرنا چاہئے۔ اس ڈیزائن کا پہلا عنصر شہریوں کا اپنے ہمسایوں کو دیکھنا اور خود بھی دکھائی دینا ہے۔ اس سے شہریوں کی جرائم کے متعلق تشویش کم ہوتی ہے۔ وہ اس علاقے کو زیادہ استعمال کر سکتے ہیں اور مجرم یہ سوچ کر کہ وہ بھی نظر آ سکتے ہیں اور پہچانے جا سکتے ہیں، خود بخود وہ علاقہ چھوڑ دیتے ہیں۔

MashalBooks.org

دوسرا عنصر یہ ہے کہ لوگ صرف دیکھنے پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ جب بھی کوئی واردات ہوتی نظر آئے وہ فوراً پولیس کو مطلع کر دیں۔ نیومین کا مقصد اس طرح شہریوں کی گمنامی کو کم کرنا تھا اور انہیں ایک دوسرے کے قریب لانا تھا۔

نیومین اور ان کے ساتھیوں نے ان خیالات کی تصدیق بھی کی۔ بہت سے ماہرین نے ان خیالات پر تنقید بھی کی ہے۔ نقادوں کا کہنا تھا کہ نیومین کے اصول مشینی طرز کے ہیں اور جرائم جیسے پیچیدہ مظہر پر پوری طرح قابو نہیں پا سکتے۔ کچھ دوسرے نقاد محفوظ علاقے کے تصور ہی کے خلاف تھے۔ لیکن ان خیالات کو مجرموں کے نقطہ نظر سے بھی دیکھنا چاہئے۔ سوشل سائیکالوجسٹ رالف ٹیلر (Ralph Taylor) اور سٹیفن گوفریڈسن (Stephen Gottfredson) کی رائے میں مجرم پہلے اپنے ذہن میں اپنے ہدف کا خاکہ تیار کرتا ہے اور ممکنہ خطرے، مناسب موقعے اور سہولتوں کا جائزہ لیتا ہے۔

سوشل سائیکالوجسٹ اروِن آلٹمین (Irwin Altman) اور باربرا براؤن نے بھی اس مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نقب زن کے ذہن میں پہلے یہ سوالات آتے ہیں:

۱۔ میرے پکڑے جانے کا کتنا امکان ہے؟ مثال کے طور پر دروازے پر کھڑکیاں کہاں واقع ہیں؟ اور یہ گھر سڑک سے کتنا دور ہے۔

۲۔ کیا کوئی حقیقی رکاوٹیں موجود ہیں؟ یعنی کیا گھر کے دروازوں میں مضبوط تالے لگے ہوئے ہیں گیٹ ہے کہ نہیں اور کیا وہاں الارم سسٹم ہے؟

۳۔ کیا کوئی علامتی رکاوٹ جیسے مقامی چوکیدارا سسٹم یا ایسا کوئی نشان موجود ہے؟

۴۔ کیا اس گھر کے مکینوں کی سرگرمی کی کوئی نشانی موجود ہے جیسے اخبار کا دروازے پر پڑا ہونا یا بتیوں کا روشن ہونا؟

۵۔ اس علاقے کی معاشرتی فضا کیسی ہے؟ کیا لوگ اجنبیوں کو گھور کر دیکھتے ہیں اور کیا واردات کے دوران لوگ میری موجودگی کو نظر انداز کر دیں گے؟

مجرمانہ مواقع یا مجرمانہ امکانات کے اس نظریے کو جب عملاً پرکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ان علاقوں میں جرم کم ہوتے ہیں جو زیادہ تر رہائشی ہیں، جہاں گاڑیاں پارک کرنے کے لئے جگہ کم ہوتی ہے اور شاہراہیں نہیں ہوتیں۔

MashalBooks.org

اس موضوع پر مزید تحقیق نے بتایا کہ نقب زدہ گھر اکثر شاہراہوں پر واقع ہوتے ہیں جہاں اجنبیوں کی کثرت ہوتی ہے۔ وہ گھر جہاں نقب زنی نہیں ہوتی دیکھنے میں زیادہ پرائیویٹ نظر آتے ہیں۔ ان میں داخلہ بھی مشکل ہوتا ہے۔ یہ پبلک مقامات سے دور واقع ہوتے ہیں۔ نیز ان پر نمبر یا نام بڑے بڑے حروف میں لکھے ہوتے ہیں۔ ان عنوانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکینوں کی موجودگی، ان کی زندگی کی سرگرمیاں اور زیادہ میل جول والے علاقوں سے مجرم دور ہی رہتے ہیں۔

اس نقطہ نظر کی عملی مثال امریکہ میں دیکھی گئی۔

سیون الیون کی مالک ساؤتھ لینڈ کارپوریشن نے اپنے سٹورز کو لٹیروں سے محفوظ کرنے کے لئے انہیں دوبارہ ڈیزائن کروایا۔ یہ ڈیزائن تیار کرنے والا ان کا مشیر ایک سابقہ نقب زن اور لٹیرا تھا جو پچیس سال قید کاٹ چکا تھا۔ اس شخص نے دکانوں کے اندر چھپنے والی جگہوں کو ختم کر دیا۔ کیش رجسٹر مشین کو بالکل سامنے ایسی جگہ رکھا گیا جہاں وہ ہر آنے جانے والے کی نظروں میں آسکتی تھی۔ دکانوں کے سامنے والے شیشوں پر سے تمام اشتہارات اتار دیئے گئے تا کہ سڑک پر آنے جانے والے لوگ آسانی سے اندر دیکھ سکیں۔ داخلی دروازوں میں تیز روشنی کا انتظار کیا گیا۔ کیش کے لئے ایسی مشینوں کا انتظام کیا گیا جس میں سے ایک وقت میں صرف دس ڈالر نکل سکتے تھے اور اگلے دس ڈالروں کے لئے دو منٹ انتظار کرنا پڑتا تھا۔

ان سب تدابیر کا نتیجہ یہ تھا کہ دوسروں کے مقابلے میں اس کمپنی کی ساٹھ دکانوں میں لوٹ کی وارداتیں 20 فیصد کم ہو گئیں۔ دوسری دکانوں کا اوسط نقصان 698 ڈالر تھا لیکن ان دکانوں کا اوسط نقصان صرف 45 ڈالر تھی۔

مجرم کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی ایک اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ ایسی جگہ واردات کرنا چاہتے ہین جہاں وہ نظر نہ آسکیں اور کوئی آواز باہر نہ جاسکے۔ ایک اور مجرم نے کہا کہ وہ ایسی جگہ تلاش کرے گا جہاں ''زیادہ آنکھیں نہ ہوں۔''

اس ساری تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ عمارات کا بہتر ڈیزائن اور شہری علاقوں کی بہتر منصوبہ بندی سے تحفظ کا احساس زیادہ ہوسکتا ہے۔ لیکن ڈیزائن جرائم کا مکمل حل نہیں۔ بہتر ڈیزائن والے علاقوں سے جرائم ختم نہیں ہوتے بلکہ دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ ماحولیاتی ڈیزائن شہری جرائم کا کوئی آخری حل نہیں ہے تاہم جرائم کا مسئلہ حل کرنے میں یہ کسی حد تک مفید ہوسکتا ہے۔

MashalBooks.org

ہماری پولیس

''تیسری دنیا کے مختلف ممالک میں قائم ہونے والی حکومتوں کے نمونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ماضی آج کے حقائق پر ابھی تک اپنا سایہ ڈالے ہوئے ہے۔ نو آبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد برسوں کی سیاست کاری اور سوشل انجینئرنگ کے باوجود ایک قابل شناخت تصور برسرِ عمل دکھائی دیتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں ریاستی ادارے زمانہ حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے ماضی کی یادوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ عوام کی خدمت کرنے کے بجائے سول انتظامیہ کا مقصد نظم و نسق کو برقرار رکھنا ہے۔ آج بھی معاشرے پر دوغلی غیر شخصی قانونی مشینری مسلط ہے جو نئے سماجی تقاضوں سے قطعی لاتعلق ہے۔ دوہری حاکمیت پر مبنی بندوبست اب بھی موثر حکومتوں کے حصے بخرے کیے ہوئے ہے۔ مخلوط النسل وفاق اور آبادی میں خاصی حد تک تغیر و تبدیل کے باوجود فوجی بھرتی پرانے جغرافیائی پیٹرن پر ہی کی جاتی ہے۔ معاشرہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے لیکن نئے حقائق سے تسویہ کرنے میں ریاست بڑی سست رفتار ہے۔

''مخصوص اداروں کے جو نمونے وجود میں آئے ہیں ان کا علم یقیناً بہت ضروری ہے لیکن یہ (علم) ان اداروں کے باقی بچ رہنے کی وضاحت کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ ان کی (معاشرتی) ابتدا آج کے اداروں کی ایک جلا بخش منطقی تقسیم کرنے سے قاصر ہے۔ بظاہر دکھائی دینے والی صورتوں کی تہہ میں ایک دوسرے کو تقویت پہنچانے والے تعلقات ہیں جو تاریخ کی حرکت اور اس کے رخ کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ اپنے پیدا کرنے والے حالات کے بعد بھی یہ تعلقات اپنی جگہ موجود ہیں۔ اس نقطہ نظر سے تیسری دنیا میں پس ماندگی پیدا کرنے والے حالات تو باقی نہیں

رہے لیکن ان حالات کے پیدا کردہ ادارے (جو ان حالات کے بعد بھی قائم ہیں) باقی بچ رہنے کی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔

پاکستان کی پولیس بھی ایک ایسا ہی ادارہ ہے جو نوآبادیاتی نظام کی پیداوار ہے اور جو اس نظام کے رخصت ہو جانے کے باوجود اسی نوآبادیاتی نظام کے مقاصد کے حصول لیے سرگرم عمل ہے۔ گیارہ پولیس کمیشنوں، کمیٹیوں اور چار بین الاقوامی مشنوں کے باوجود، جنہوں نے اس ادارے کی اصلاح کی زبردست سفارشیں کیں، ہماری پولیس کے نظام میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

1857ء کے غدر کے چار سال بعد پولیس کا نظام 1861ء میں ایک قانون (Actv'1061) کے ذریعے وجود میں آیا۔ اس ایکٹ کو عرف عام میں پولیس ایکٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد نوآبادیاتی نظام کو استحکام وتحفظ فراہم کرنا تھا۔ ذیلی مقصد امن وامان قائم رکھنا تھا کیونکہ امن وامان کے بغیر اصل مقاصد کا حصول مشکل تھا۔ اور ''انگریزی راج کی برکتوں'' میں امن وامان کے بغیر اضافہ مشکل تھا۔ یہ نظم ونسق کی بحالی اور امن وامان کا قیام ہی تھا جس کے دوران سونے میں پیلی ایک نوجوان لڑکی پشاور سے ریل میں سوار ہوتی تھی اور کلکتے کے سٹیشن ہاوڑا پر جا اترتی تھی اور اس طویل سفر کے دوران کسی مائی کے لال کو جرات نہیں ہوتی تھی کہ اس کی طرف انگلی سے اشارہ ہی کر سکے۔

آزادی کے بعد پاکستان کی پولیس کی کارکردگی کا گراف اور جدولیں جو ہمیں ملتی ہیں وہ بہت ہی عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ ان جدولوں کا تعلق تو صرف صوبہ پنجاب سے ہے لیکن یہ پورے پاکستان میں پولیس کی کارکردگی کو بھی منعکس کرتی ہیں۔

MashalBooks.org

تمام درج شدہ مقدمات (پنجاب) 1947ء سے 1995ء تک (جدول نمبر 1)

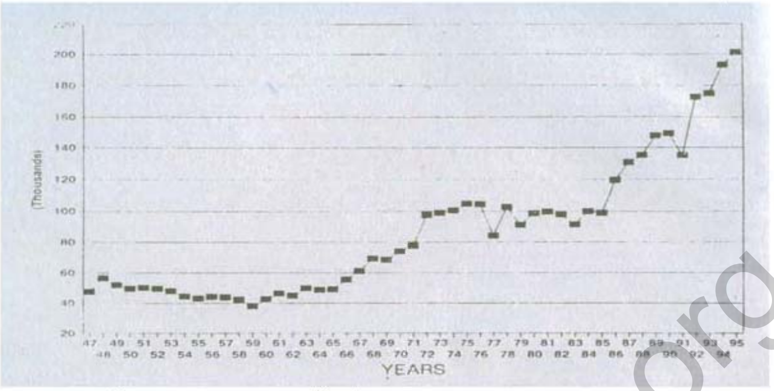

پنجاب میں 1951ء میں کل آبادی 20.5 ملین تھی جو 1995ء میں 71 ہوگئی۔ 1985ء تک شرح جرائم آبادی میں اضافے کی شرح سے کم تر رہی۔ اس کے بعد شرح جرائم آبادی میں اضافے کی شرح سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

قتل (صرف پنجاب میں) 1947ء سے 1996ء کے دوران (جدول نمبر 2)

1947ء میں قتل کی اتنی زیادہ وارداتیں پنجاب میں ہندو مسلم فسادات کو منعکس کرتی ہیں۔ یہ صرف

MashalBooks.org

درج شدہ جرائم ہیں۔ قتل کی وہ وارداتیں جن کی اطلاع پولیس کو نہیں دی گئی یا جو درج نہیں ہوئیں، اس کے علاوہ ہیں۔ 1947ء کے بعد 1983ء تک قتل کی وارداتیں نسبتاً کم رہیں۔ لیکن اس کے بعد ان میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا اور 1995ء میں قتل کی وارداتوں کی تعداد 4500 سے بھی بڑھ گئی۔ اس کی وجہ اسلحہ کے لائسنس کھلے دل سے جاری کرنا اور افغانستان سے اسلحہ کی سمگلنگ ہے۔

اقدام قتل (پنجاب) 1947ء۔1995ء کے دوران (جدول نمبر 3)

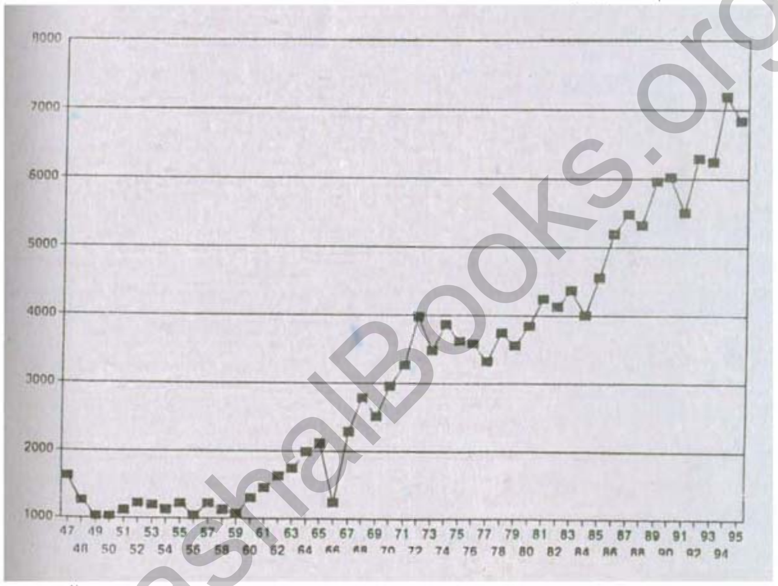

1985ء تک ان وارداتوں کی شرح آبادی کے اضافے کی شرح سے متناسب تھی۔ اس کے بعد اقدام قتل کی وارداتوں میں تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔

MashalBooks.org

ڈاکہ(پنجاب میں)1947ء۔1995ء کے دوران(جدول نمبر4)

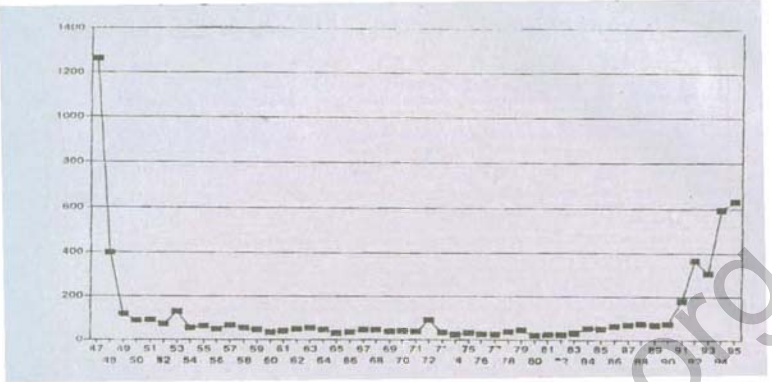

1947ء اور1948ء میں ان وارداتوں میں اضافے کی وجہ ان دنوں لاقانونیت اور افراتفری تھی جس کی وجہ ملک کی تقسیم تھی۔

اس کے بعد اگرچہ شرح آبادی میں300فیصد اجافہ ہوالیکن ڈاکہ زنی میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔لیکن1991ء اور1995ء میں داکہ زنی میں1000فی صد کا اضافہ ہو۔اس دوران تشدد میں ہی نہیں دوسرے جرائم میں بھی اضافہ ہوا۔

MashalBooks.org

بم دھماکے پنجاب میں۔1987ء۔1995ء(جدول نمبر5)

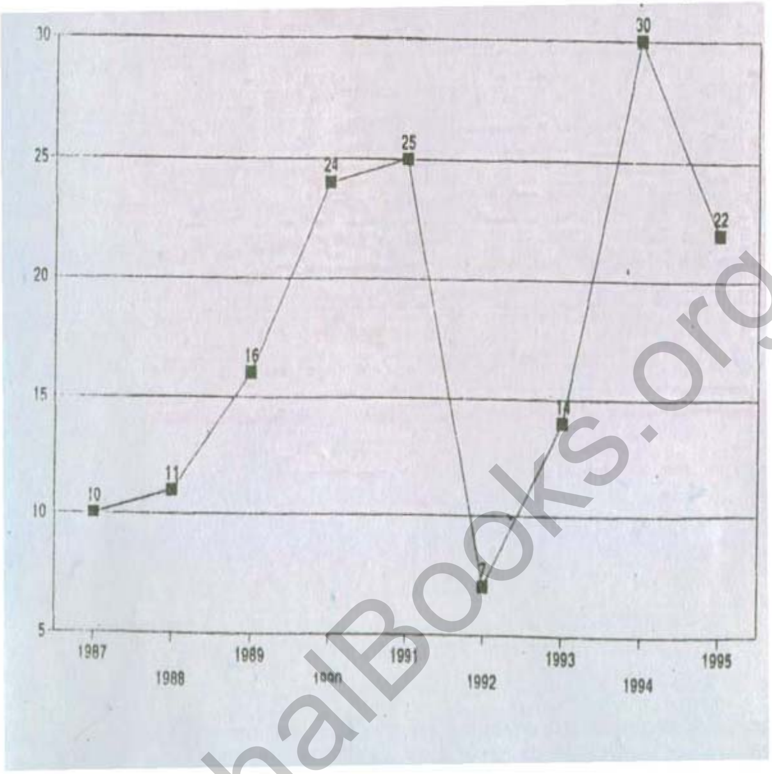

گراف میں موجود نمبر ہی وارداتیں بتاتے ہیں۔

MashalBooks.org

بم دھماکوں میں مرنے والے افراد پنجاب میں1987ء۔1995ء (جدول نمبر6)

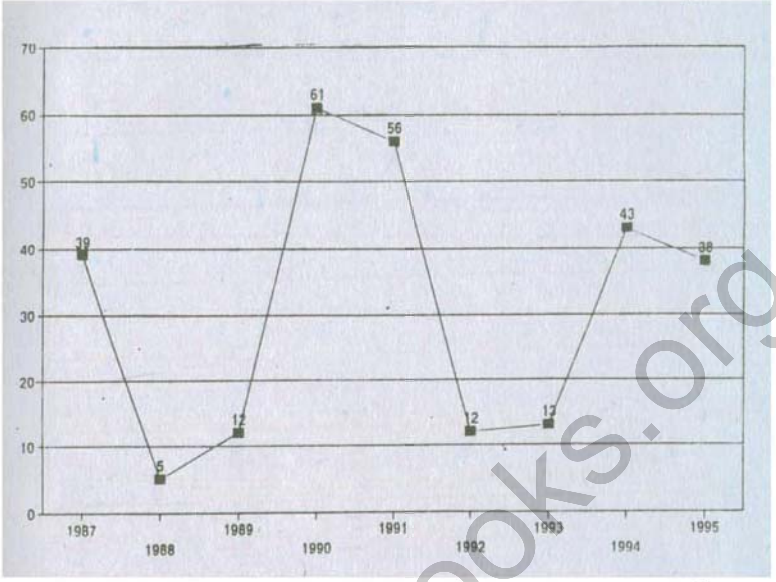

گراف ہی ہلاک ہونے والوں کی تعداد بتائے ہیں۔

راہزنی(Robbery)یا پرتشدد سرقہ (پنجاب میں)1947ء۔1995ء (جدول نمبر7)

ڈاکہ زنی میں اضافے کی طرح ان وارداتوں میں بھی1990ء اور1994ء کے دوران

MashalBooks.org

اضافہ ہوا۔شرح اجافہ 900فیصد رہا۔

پنجاب میں مذہبی فرقہ واریت کی پرتشدد وارداتیں 1987ء۔1995ء کے دوران (جدول نمبر8)

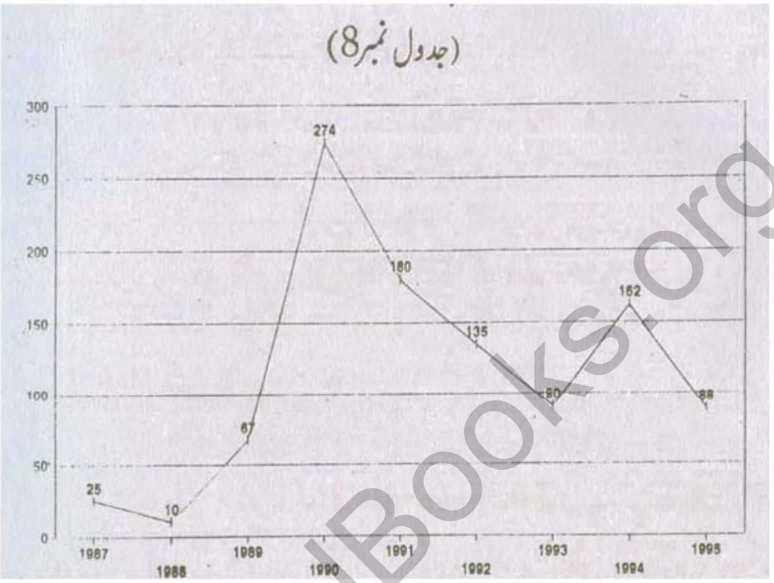

یہ اعدادوشمار بڑے دلچسپ ہیں۔ جیسے جیسے نام نہاد مذہبیت میں اضافہ ہوتا گیا ان وارداتوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔1990ء میں یہ انتہا کو پہنچی۔وارداتوں کی تعداد274 تھی۔ پھر کمی آنا شروع ہوئی جس کی وجہ حکومت کا چوکنا ہونا اور انسدادی کاروائی تھی۔لیکن اگرچہ 1995ء کے بعد کے اعدادوشمار دستیاب نہیں ہوئے لیکن اخباری اطلاعات کے مطابق ان میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا اور1998ء میں ان میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ملتان میں32 آدمیوں کا حالت نماز میں قتل،مومن پورہ کی واردات اور سپاہ صحابہ میں تشدد کے رجحان میں اضافہ۔ضلع مظفرگڑھ میں امام بارگاہ میں16 معصوم اشخاص کا قتل۔پنجاب میں مذہبی فرقہ واریت کی پرتشدد وارداتوں میں ہلاک ہونے والے افراد کی

MashalBooks.org

تعداد1987ء۔1995ء(جدول نمبر9)

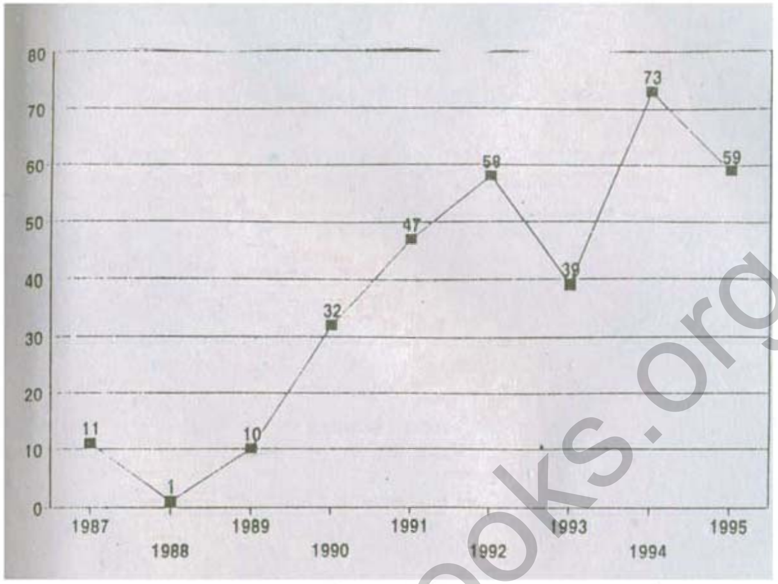

جدول نمبر میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ظاہر کرتے ہیں۔1995ء تک ہلاک شدگان کی کل تعداد301 تھی۔1995ء سے1998ء کے درمیان ان وارداتوں میں اضافہ ہوا اور ان بے گناہ ہلاک شگان کی تعداد میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ان دو برسوں کے اعداد وشمار دستیاب نہیں ہوئے۔یہ صرف تخمینہ ہے جو اخباری اطلاعات پر مبنی ہے۔

پنجاب میں طالب علموں کی پرتشدد وارداتیں1987ء۔1995ء(جدول نمبر10)

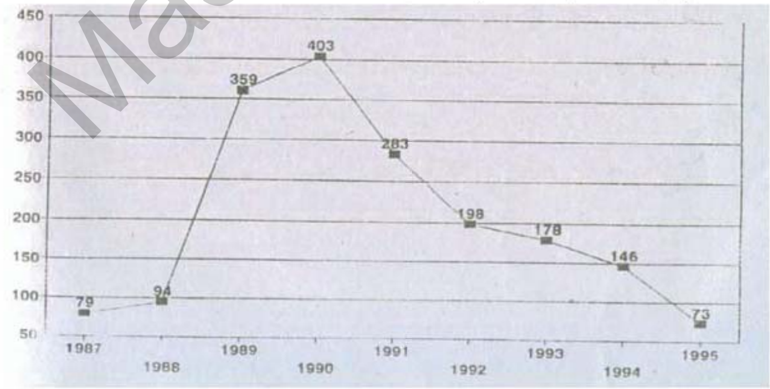

MashalBooks.org

جدول نمبر وارداتوں کا اظہار کرتی ہے۔ سال 1990ء میں یہ وارداتیں اپنے عروج پر تھیں۔ اس سال ان وارداتوں کی تعداد 403 تھی۔ اس کے بعد ان میں بتدریج کمی ہوتی چلی گئی اور 1995ء میں صرف 73ء وارداتیں ہوئیں۔

پنجاب میں طالب علموں کی پرتشدد وارداتوں میں ہلاک شدگان کی تعداد

1987ء۔1995ء (جدول نمبر 11)

ا۔ ہلاک شدگان کی کل تعداد: 230

۲۔ جدول میں دیئے گئے نمبر ہلاک شدگان کی تعداد بتاتے ہیں۔

1990ء میں ان وارداتوں میں 56 افراد جاں بحق ہوئے۔

۳۔ 1990ء کے بعد اس تعداد میں بتدریج کمی ہوتی چلی گئی اور 1995ء میں 6 آدمی ان وارداتوں میں قتل ہوئے۔

پنجاب میں مزدوروں کی پرتشدد وارداتیں 1987ء۔1995ء (جدول نمبر 12)

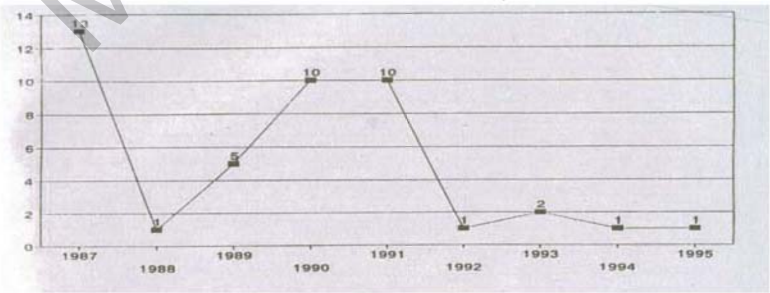

ا۔ مزدوروں کی پر تشدد وارداتیں 1990ء اور 1991ء میں عروج پر تھیں۔

۲۔ 1991ء کے بعد ان میں بھی بتدریج کمی ہوتی چلی گئی۔

پنجاب میں مزدوروں کی پر تشدد وارداتوں میں ہلاک شدگان کی تعداد

1987ء۔1995ء (جدول نمبر 13)

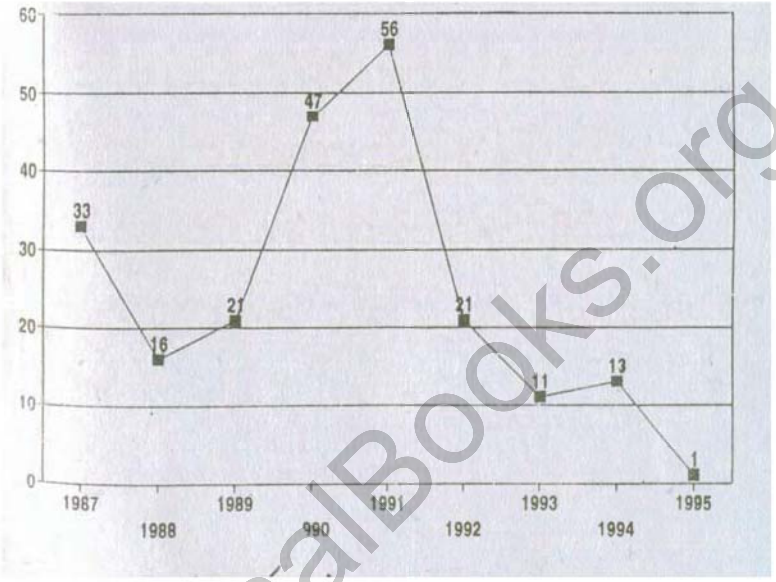

ا۔ ان وارداتوں میں 1991ء میں 56 افراد ہلاک ہوئے۔

۲۔ 1991ءکے بعد ان میں بتدریج کمی واقع ہوتی چلی گئی۔

۳۔ 1995ء میں صرف ایک شخص ہلاک ہوا۔

ڈیرہ غازی خان ڈویژن میں لائسنس والے آتشیں اسلحہ 1980ء۔1996ء

MashalBooks.org

(جدول نمبر14)

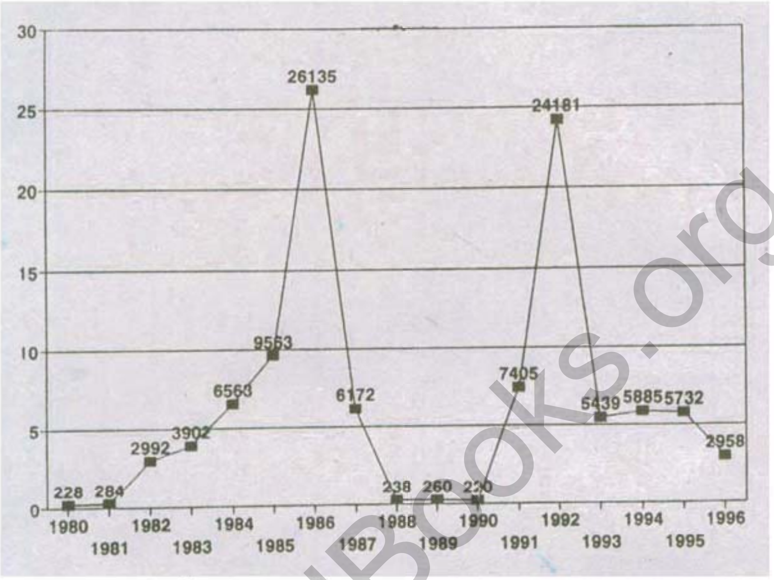

ا۔ 1981ء کے بعد پنجاب کے اس ڈویژن میں آتشیں اسلحہ کے لائسنس بڑی فیاضی سے جاری کیئے گئے1980ء کے سال میں صرف228لائسنس جاری کیئے گئے تھےلیکن1986ء میں 26135لائسنس جاری ہوئے۔1988ء میں یہ تعداد238 کر1996ء تک108157نئے لائسنس جاری کیئے گئے۔

۲۔ ناجائز یابلا لائسنس اسلحہ اس کے علاوہ ہے۔اس زمانے میں اراکین اسمبلی کو لائسنس دینے کا کوٹا مقرر ہوا اور اسلحہ کی تعداد انتہا کو پہنچی۔

MashalBooks.org

ماخذ: روزنامہ دن 28 نومبر 1998ء

عنوان جرم	لاہور	فیصل آباد	گجرانوالہ	ملتان	راولپنڈی	کل تعداد
ا۔قتل	846	508	638	452	297	2741
۲۔اقدام قتل	1495	578	901	544	287	3815
۳۔ضرب شدید	2916	2218	1997	2397	1309	10836
۴۔بچوں کا اغوا	150	610	510	764	299	2343
۵۔اغوا برائے تاوان	11	2	2	2	5	22
۶۔خواتین سے زیادتی اور اجتماعی زیادتی	302	195	115	170	60	842
۷۔ڈاکہ	254	115	46	65	16	496
۸۔سرقہ	1479	490	401	417	105	2892
۹۔سرقہ مویشی	892	1118	375	785	104	3774
میزان	8355	5834	4985	4496	3492	27262

1998ء کے پہلے 240 دنوں کی وارداتیں ڈویژن کے حساب سے

ا۔ لاہور میں روزانہ 3 سے 4 قتل، 12 قاتلانہ حملے، 12 شدید زخمی، 6 بچوں کا اغوا، ایک عورت سے زیادتی، 7 سرقہ اور ایک ڈاکہ ہیں جن کے متعلق مقدمات درج ہوئے۔ ان جرائم کے عنوانات کے تحت سینکڑوں وارداتیں ایسی ہوں گی جن کی اطلاع پولیس کو نہیں دی گئی یا پولیس نے مقدمہ درج کرنے سے انکار کر دیا یعنی اخفائے واردات کی۔

۲۔ لاہور مین سنگین وارداتوں میں اضافے کی شرح 15 فیصد

۳۔ سب سے زیادہ جرائم کا ارتکاب لاہور ڈویژن میں ہوا۔ شاید اس کی وجہ کثرت آبادی ہو۔ یعنی اگر آبادی کم ہوتی تو ممکن ہے جرائم بھی کم ہوتے۔ بہر حال یہ محض ایک قیاس ہے۔

MashalBooks.org

ان گرافوں اور جدولوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ:

۱۔ 1985ء کے بعد پرتشدد جرائم میں زیادہ اضافہ ہوا اور

۲۔ راہزنی اور ڈاکے 91-1990ء میں اپنے عروج پر تھے۔

۳۔ پرتشدد جرائم میں زیادتی کے ساتھ ساتھ آتشیں اسلحہ بھی ہمارے معاشرے میں در آیا۔ سال 1980ء تک اسلحہ کے لائسنس بڑے محدود پیمانے پر جاری ہوتے تھے۔ لیکن اس کے بعد:

i۔ جنگ افغانستان کے ساتھ اسلحہ پہلے قبائلی علاقوں میں اور وہاں سے پورے معاشرے میں پھیل گیا۔ خود کار اسلحہ کے ساتھ ساتھ راکٹ لانچر، اینٹی ٹینک میزائل وغیرہ بھی ہمارے معاشرے میں نفوذ کر گئے۔

ii۔ حکومتوں نے اسلحہ کے لائسنس جاری کرنے میں بڑی فیاضی دکھائی۔ منتخب نمائندوں کو سینکڑوں کی تعداد میں اسلحہ کا کوٹہ دیا گیا۔ یوں آتشیں اسلحہ میں زبردست اضافہ ہوا جس کا نقشہ ڈیرہ غازی خان سے متعلق گراف میں دکھایا گیا۔ جب تک اسلحہ پر روک نہیں لگائی جائے گی اور ان کی تعداد میں کمی نہیں آئے گی تو یہ اندیشہ ہے کہ پرتشدد جرائم میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔

جائز اور ناجائز اسلحہ میں اضافے کے علاوہ مندرجہ ذیل عوامل بھی پرتشدد جرائم میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

۱۔ مذہبیت پر مبنی جماعتوں کی طرف سے نوجوانوں کو مسلح کیا جاتا ہے جو جرائم کا ارتکاب کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔

۲۔ بعض سیاسی جماعتیں بھی اپنے کارکنوں کو مسلح کرتی ہیں۔

۳۔ دہشت گردی۔

۴۔ افغانیوں اور ان کے ہمراہ عرب ریاستوں کے کچھ لوگوں کا پاکستان میں غیر قانونی داخلہ۔ قبضہ گروپ۔ زمین اور اس قسم کی دوسری املاک، موٹر گاڑیوں وغیرہ پر قبضہ کرنے والے منظّم جرائم پیشہ لوگ۔

۵۔ منشیات کا منظّم دھندہ جس میں ہمارے سیاست دان اور منتخب نمائندے بھی ملوث رہے ہیں۔

۶۔ نظام عدل۔ پولیس، عدلیہ اور جیل خانوں کی تنظیموں اور اداروں کا انحطاط اور ان میں تیزی۔

ان سب عوامل کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں قانون کی حکومت ختم ہوگئی اور ہر طرف لاقانونیت

MashalBooks.org

کا راج ہے۔ اور طرفہ یہ کہ قانون نافذ کرنے والا ادارہ یعنی پولیس اور اس کی مختلف صورتیں جیسے F.I.A اور دوسری ایجنسیاں خود سب سے زیادہ لاقانونیت کی مرتکب ہوتی ہیں۔

آخر ایسا کیوں ہے کہ انگریز کے راج میں یہی پولیس عوام کے جان و مال کو تحفظ فراہم کرتی تھی لیکن اب وہی غارت گری پر تلی ہوئی ہے۔ اس سوال کا جواب پنجاب کے ایک سابق انسپکٹر جنرل آف پولیس نے ان الفاظ میں دیا ہے:

''آزادی سے پہلے فوجداری نظام عدل میں پولیس مکمل طور پر انتظامیہ کے ماتحت تھی۔ نوآبادیاتی حکمرانوں کے عزائم اور مقاصد متعین تھے۔ رعایا کو انصاف کی فراہمی ان کے حکومتی مقاصد اور فرائض میں شامل تو تھی مگر برطانوی راج کے مفادات کے تابع۔ عمومی معاملات میں حکمرانوں اور فراہمی انصاف کے اداروں میں مکمل ہم آہنگی تھی۔ لہٰذا انصاف اور امن وامان نے ایک قابل قدر معیار برقرار رکھا۔ اس وقت انتخابی سیاست تھی نہ حلقہ ہائے نیابت اور نہ ہی کوئی دیگر قسم کے پریشر گروپ موجود تھے جو مداخلت کرتے۔ لہٰذا ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس برطانوی راج کے نمائندہ ہونے کے ناطے ریاستی مفادات کے تحفظ کے لیے قانون کے نفاذ کو بہ آسانی یقینی بنا لیتے تھے۔

آزادی کے نتیجے میں اقتدار اعلیٰ بادشاہ اور پارلیمنٹ سے پاکستان کے شہریوں کو منتقل ہوا جسے انہوں نے اپنے منتخب نمائندوں کے سپرد کر دیا۔ یوں فوجداری نظام انصاف کے ادارے سیاسی کنٹرول میں چلے گئے۔ سیاسی نظام میں اراکین اسمبلی کو اپنے ووٹروں کا خیال رکھنا ہوتا ہے لہٰذا مداخلت اور دباؤ کا راستہ کھل جاتا ہے۔ ہر سیاسی عمل کے نتیجے میں جمہوری جوش وجذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ ہم نے سیاسی عمل تو شروع کر لیا مگر اس کے اثرات کو جذب کرنے کے لیے فوجداری نظام انصاف کے اداروں کو تحفظ وتوازن فراہم نہ کیا۔ کسی بھی مشین کو مختلف حالات میں استعمال کرنا ہو تو اس کے کل پرزوں میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں ورنہ وہ مشین صحیح طور پر کام نہیں کر سکتی۔ موجودہ نظام کی مشین اسی کوتاہی کی وجہ سے تباہ ہو رہی ہے۔

بااثر افراد کی روز افزوں مداخلت سے موجودہ نظام انصاف پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ دن رات ہر کسی کے مشاہدے میں ہیں۔ عوام برملا سیاسی مداخلت کو پولیس کی ذمہ داری قرار

دیتے ہیں۔اس بے جا مداخلت کے نتیجے میں پولیس کے اندر اختیارات کے ناجائز استعمال کے رجحان میں بھی اضافہ ہوا اور پولیس کی کارکردگی، غیر جانبداری اور ساکھ بھی مجروح ہو کر رہ گئی۔''

(محمد عباس خان (پی ایس پی) ''پولیس اور جمہوری روح'' سنٹرل پولیس آفس، پنجاب لاہور،؛:4،5۔)

اس سیاسی مداخلت کے کئی روپ ہیں اور کئی سطحیں ہیں۔آغاز محکمہ پولیس میں بھرتی سے ہوتا ہے۔ پولیس میں بھرتی کی تین سطحیں ہیں۔ کانسٹیبل (یعنی سپاہی) اسسٹنٹ سب انسپکٹر۔اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس۔سپاہی ضلع کا ایس پی بھرتی کرتا ہے، اسسٹنٹ سب انسپکٹر کو ایک سلیکشن بورڈ کی سفارش پر ڈی آئی جی بھرتی کرتا ہے۔اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو وفاقی حکومت بھرتی کرتی ہے اور وہ پولیس سروس آف پاکستان (آزادی سے پہلے انڈین پولیس) کا رکن ہوتا ہے۔

مگر اب یہ نظام درہم برہم ہو گیا ہے اور بھرتی کے متعلق قواعد وضوابط کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔میرٹ یعنی اہلیت کی بجائے اب یہ ایک سیاسی عمل بن چکا ہے۔ ماضی قریب میں بااثر شخصیات (ایم۔این۔اے یا ایم۔پی۔اے) کو سپاہیوں کی بھرتی کا کوٹہ تک دیا جاتا تھا۔ اس بنا پر تعلیم اور جسمانی اعتبار سے مطلوبہ معیار سے کہیں کم تر اہلیت کے افراد پولیس میں بھرتی ہونے لگے۔سفارش پر بھرتی ہونے والے یہ افراد محکمے کی بجائے اپنے محسنوں کے زیادہ وفادار رہتے ہیں اور اپنے محکمانہ فرائض کی بجا آوری کی بجائے اپنے محسنوں کی خوشامد اور خدمت گزاری میں مصروف رہتے ہیں۔ان پر محکمانہ قواعد وضوابط کا اطلاق نہیں ہوتا وہ اپنی مرضی سے چھٹی پر جاتے ہیں، اپنی مرضی سے واپس آتے ہیں اور اگر ان کا دل چاہے تو کام کی پابندی بھی کرتے ہیں۔وہ سوائے اپنے محسن کے کسی کو جوابدہ نہیں ہوتے۔

سال1993ء میں نگران حکومت نے پنجاب کے مختلف محکموں میں بے ضابطہ بھرتی کا اندازہ لگانے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی۔ جانچ پڑتال کے بعد کمیٹی نے بتایا کہ 1985ء اور 1993ء کے دوران حکومت کے مختلف محکموں میں تمام قواعد وضوابط کو نظر انداز کر کے 25000 افراد کو حکومت کے مختلف محکموں میں بھرتی کیا گیا۔

اس تعداد میں پولیس کے ایک ہزار انسپکٹر اور اے ایس آئی اور ہزاروں کی تعداد میں پولیس

MashalBooks.org

کے سپاہی شامل تھے۔ خالی ہونے والی تمام اسامیوں کو حکومت کے حامی افراد میں تقسیم کیا گیا، جنہوں نے اپنے نامزد اور منظورِ نظر لوگوں کو بھرتی کروالیا۔

یہ امر بھی سامنے آیا کہ تعیناتی کے احکام سفید کاغذ پر جاری کیے گئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اے ایس آئی اور سپاہیوں کی کئی اسامیاں فروخت کی گئیں۔ ایسا کرنے میں کئی مجرم بھی پولیس میں بطور اے ایس آئی اور انسپکٹر بھرتی ہو گئے۔

''نگران دور کے چند ماہ کو چھوڑ کر پچھلے کئی برسوں میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر صاحبان اور انسپکٹر صاحبان کی سو فیصد بھرتی میرٹ سے ہٹ کر کی گئی۔ صرف ایک صوبے میں میرٹ کو نظر انداز کر کے اور قواعد وضوابط کو نرم کر کے 836 اسسٹنٹ سب انسپکٹر اور 53 انسپکٹر بھرتی کئے گئے جن میں کچھ کی عمریں مقررہ حد سے دس سے پندرہ سال زیادہ تھیں۔ کئی مطلوبہ تعلیمی معیار کے حامل بھی نہ تھے اور چند کے قد مطلوبہ معیار سے 3 انچ کم تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو مجرمانہ ریکارڈ رکھتے تھے۔ سب کے احکامات صوبے کی انتظامیہ کے سربراہ کی طرف سے جاری کئے گئے۔''

(عباس، اردو 6)

''سفارش پر بھرتی ہونے والے اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس افسروں کے ایک گروپ نے ٹریننگ کالج میں تربیت کی سختی اور امتحانات کے انعقاد کے خلاف اپنی انتہائی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ڈسپلن کے تمام تقاضے بالائے طاق رکھتے ہوئے شدید ردعمل ظاہر کیا۔ وہ افسر جنہیں امن وامان قائم رکھنے اور قانون ہاتھ میں لینے والوں کو پکڑنے کا فریضہ سرانجام دینے کی خوش فہمی میں بھرتی کیا گیا تھا، ضابطے اور قانون کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے سہالہ ٹریننگ کالج سے بسوں میں سوار ہو کر جلوس کی شکل میں لاہور پہنچے اور وزیراعلیٰ کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کر کے حکومت پنجاب کو یاد دلایا کہ بھرتی کے وقت ان سے تربیتی امتحان نہ لینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ وعدہ وفا ہو کر رہا۔ بغیر امتحان دیے کامیابی سٹوفکیٹ حاصل کرنے والے ان افسران کے ہاتھوں آج عوام اور معاشرہ جس امتحان سے گزر رہا ہے وہ اسی پالیسی کا نتیجہ ہے جس نے شاید چند لوگوں کو انفرادی سطح پر کوئی فائدہ پہنچایا ہو مگر معاشرے کے اجتماعی مفاد پر تازیانہ بن کر برس رہی ہے۔''

(عباس (اردو): 6۔ انگریزی: 38-)

اس واقعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو لوگ تربیت کے دوران ایسی حرکات کر سکتے

ہیں وہ قواعد وضوابط کے پابند قانون کا نفاذ کرنے والے محکمے میں کیا گل کھلائیں گے اور دوسروں کے لیے کیا مثال قائم کریں گے۔ مختلف افراد کے کسی گروہ کو ڈسپلن ہی ایک جماعت یا فورس کی شکل دیتی ہے۔ اگر ڈسپلن نہ ہو تو کوئی جماعت بھی قائم نہیں رہ سکتی۔

بھرتی میں سیاسی مداخلت کی ایک گھناؤنی مثال اس اسسٹنٹ سب انسپکٹر کی ہے جو کوٹے کی بنا پر بھرتی ہوا تھا۔ ''اسسٹنٹ سب انسپکٹر کا امتحان پاس نہ کر سکنے کی وجہ سے اسے محکمے سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ اس نے نئے احکامات جاری کروا کے خود کو دوبارہ بھرتی کروالیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ اب کی بار بطور ایک انسپکٹر پولیس۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے بنیادی تربیتی کورس سے بھی مستثنیٰ قرار دیا گیا اور جس عرصے میں اس نے اسے ایس آئی کی تربیت حاصل کی تھی اسے انسپکٹر کے تربیتی عرصے میں شمار کیا گیا۔ اس بلند و بالا مقام پر فائز ہونے والا یہ انسپکٹر مزید عنایات سے مستفیض ہو کر لاہور کے ایک نہایت اہم ترین تھانے میں ایس ایچ او تعینات ہو گیا۔ یہ انتخاب تو کسی اور کا تھا مگر اس کی سزا حکومت، محکمہ اور عوام کو یوں ملی کہ اس حضرت نے عدم صلاحیت، ناتجربہ کاری اور کام سے ناواقفیت کی بنا پر افواج پاکستان کے افسروں کے ساتھ تنازعہ کھڑا کر لیا اور پولیس کو افواج پاکستان کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ یہ خاص صورتحال اس حد تک سنگین ہوئی کہ معاملہ وفاقی سطح تک جا پہنچا اور بڑی عرق ریزی کے بعد اسے سلجھایا گیا۔ (عباس، اردو:9انگریزی:38)

محکمے میں مداخلت اور اس کے قواعد وضوابط کو درہم برہم کرنے والی دوسری صورت سفارشی ترقیاں ہیں۔ پولیس کے محکمے میں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں جونیئر افسروں نے اپنے سے سینئر افسروں کو پھلانگ کر ترقی حاصل کی۔ کئی مثالیں ایسی بھی ہیں جہاں کچھ افسروں نے اپنے سے سات سو سینئر افسروں کو پھلانگ کر ترقی حاصل کر لی۔ حال ہی میں پاکستان پولیس سروس کا ایک افسر اپنے سے کم از کم 120 افسروں کو پھلانگ کر آئی جی کے منصب پر سرفراز ہوا۔ یہ شخص حاکمان وقت کا منظور نظر ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے پنجاب پولیس میں ''پولیس مقابلوں'' کا سلسلہ شروع کیا۔

سیاسی مداخلت

تیسری صورت سیاسی لوگوں کی طرف سے اپنی مرضی کے مطابق پولیس افسروں کی پوسٹنگ

MashalBooks.org

اور تبادلے ہیں۔ پاکستان کی پولیس ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں کراچی پولیس میں سیاسی تعیناتیوں اور تقرریوں کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔

محکمے میں رشوت کے زور پر تقرری یا تعیناتی حاصل کرنے کی بھی بہت سی مثالین سامنے آئی ہیں۔ یہ کام تو بہت پہلے بہاولپور میں شروع ہو گیا تھا جہاں ڈی آئی جی اسسٹنٹ سب انسپکٹر کو تین ہزار روپے کے عوض ملازم رکھتا تھا۔ ایک اور گھناؤنی مثال وہ ہے جب ایک صاحب اقتدار شخص ایک آدمی کو بطور اے ایس آئی بھرتی کرانے کے لیے انسپکٹر جنرل آف پولیس پنجاب کے پاس لے گیا۔ آئی جی نے انکار کر دیا۔ وہ شخص باہر چلا گیا لیکن جلد ہی آئی جی کے دفتر کے باہر غل غپاڑے کی آوازیں آنے لگیں۔ آئی جی باہر نکلا تو معلوم ہوا بھرتی ہونے والے آدمی نے اس سیاسی شخص کو دس ہزار رشوت دی تھی۔ جب وہ بھرتی نہ ہو سکا تو وہ اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ یہ مثال ایم اے کے چوہدری کی کتاب Policing in Pakistan میں موجود ہے۔

پولیس کے محکمے میں سیاسی مداخلت کی کئی گھناؤنی مثالیں ملتی ہیں۔ اخبار بین حضرات کو وہ واقعہ ضرور یاد ہوگا کہ ''ایک ٹریفک سارجنٹ نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی پر ایک سیاسی شخص کے خلاف قانونی کارروائی کی تو اسے سیاسی استحقاق کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ صوبے کے آئی جی کو جو اس وقت لاہور سے میلوں دور دورے پر تھا، تبدیل کر دیا گیا، ایس پی ٹریفک کو او ایس ڈی بنا دیا گیا جو دو سال تک او ایس ڈی بنا رہا اور ٹریفک سارجنٹ کو قانون نافذ کرنے کی بنا پر جیل جانا پڑا۔ لوگوں کو یہ بھی یاد ہوگا کہ اس بااثر شخص نے ٹریفک سارجنٹ کے منہ پر ایک تھپڑ بھی مارا تھا۔ دراصل یہ تھپڑ قانون کے منہ پر تھا۔

ضلع سرگودھا کے ایک بااثر فرد نے مقامی ایس ایچ او کے تبادلے کا مطالبہ منوانے کے لیے اپنے حامیوں کی قیادت کرتے ہوئے تھانے کا باقاعدہ گھیراؤ کر لیا۔ ایک دوسرے ضلع سے اپنی مرضی کے تھانیدار کو بلوا کر ایس ایچ او کی کرسی پر بٹھا چکنے کے بعد اس کی تسلی ہوئی اور پھر وہ موقعے سے ہٹنے پر آمادہ ہوا۔

ضلع مظفر گڑھ میں ایک سب انسپکٹر ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر ریٹائر ہونے والا تھا لیکن اس کی ملازمت میں توسیع کر دی گئی کیونکہ اس علاقے کے سیاسی لوگ کسی دوسرے تھانیدار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

روزمرہ کے کام میں سیاسی مداخلت کے واقعے کا تعلق ضلع گوجرانوالہ سے ہے۔ صوبائی کرائم برانچ کی جائنٹ ٹاسک فورس نے سات آدمیوں نے 15 کلوگرام افیون برآمد کرلی اور انہیں تھانے میں بند کردیا۔ ایک بااثر شخص اس واقعے پر بڑا برہم ہوا۔ وہ اپنے حامیوں کے ساتھ زبردستی تھانے میں گھس گیا۔ تھانے میں موجود پولیس والوں کی پٹائی کی۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ملزم مقامی سی آئی اے میں ہے تو وہ وہاں بھی پہنچا۔ آتشیں اسلحہ کا استعمال کیا اور ملزم کو، جس کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی، چھڑا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اس پر پولیس والوں نے مقدمہ درج کرلیا لیکن کوئی قانونی کارروائی نہ ہوسکی۔ آخر چھ سال بعد یہ مقدمہ 1991ء میں خارج کر کے داخل دفتر کردیا گیا۔

پولیس کے روزمرہ کے فرائض کی انجام دہی میں سیاسی مداخلت کی ایک اور صورت بھی ہے، اور وہ تفتیش کے دوران مقدمے کی تفتیش کو اپنے من پسند تفتیشی افسر کے حوالے کروانا۔ ایک سروے کے مطابق ضلع گجرات میں 81 فیصد قتل کے مقدمات کی تفتیش ایک افسر سے دوسرے کو منتقل ہوئی۔ کئی مقدمات کی تو دس دس دفعہ تفتیش ہوئی اور یہ مقدمات غارت ہوگئے۔

ان باتوں سے یہ پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ محکمہ پولیس میں جا دبے جا سیاسی لوگوں کی مداخلت نے ہماری پولیس کو تباہ و برباد کردیا ہے۔ سیاسی مداخلت کے علاوہ کچھ اندرونی عوامل بھی ہیں جن کی بنا پر اس محکمے کا وقار اور کارکردگی بری طرح مجروح ہوچکی ہے۔ کیونکہ اس سیاسی مداخلت کی وجہ سے پولیس کے اندر اختیارات کے ناجائز استعمال کا رجحان بہت بڑھا ہے۔

چند اور عوامل

ابھی تک تو محکمہ پولیس میں بھرتیوں، ترقیوں، تبادلے اور روزمرہ کے فرائض کی ادائیگی میں سیاسی مداخلت زیر بحث تھی۔ لیکن پولیس کو برباد کرنے والے کچھ ایسے عوامل بھی ہیں جن کے لیے پولیس کے اہلکار خود ذمہ دار ہیں۔ ان امور کا تجزیہ کرنے سے پیشتر اس محکمے کے اہلکاروں کی تعلیمی استعداد کا جائزہ لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ تعلیم ہی ہے جو انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔

یوں تو ہماری پوری قوم اپنی پسماندگی کی وجہ سے جاہل ہے اور جتنی جہالت فی مربع کلومیٹر

MashalBooks.org

پاکستان میں پھیلی ہوئی ہے یا جتنی شرح جہالت اس ملک میں ہے شاید کہیں اور نظر نہ آئے لیکن ہمارا محکمہ پولیس اس معاملے میں سب سے آگے ہے۔ پنجاب پولیس کے تعلیمی اعداد وشمار سے یہ صورت حال پوری طرح واضح ہو جاتی ہے:

تعلیمی سطح	شرح فی صد
ناخواندہ	3.60
پرائمری پاس	6.62
مڈل پاس	34.69
میٹرک پاس	44.15
ایف اے پاس	6.32
بی اے	2.37
ایم اے۔ ایل ایل بی	0.06

ماخذ: ایم۔اے۔کے۔ چودھری پولیسنگ ان پاکستان۔

عہدوں کے لحاظ سے تعلیمی حالت کی صورت کچھ یوں بنتی ہے:

عہدہ	شرح خواندگی فی صد
سپاہی	77.25
ہیڈ کانسٹیبل	11.59
اسسٹنٹ سب انسپکٹر	5.82
سب انسپکٹر	3.54
انسپکٹر	1.14
ڈی ایس پی	0.5

ماخذ: ایم اے کے چوہدری، محولہ بالا

پولیس کا محکمہ ذہانت، تعلیم اور اپنے گردوپیش سے مکمل آگاہی کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا دونوں جدولوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس محکمے میں تعلیم کا فقدان ہے۔ جوں جوں عہدہ

MashalBooks.org

بڑھتا جاتا ہے شرح خواندگی اتنی ہی پست ہوتی چلی جاتی ہے۔ سب انسپکٹر (تھانیدار) سے بالاتر افسر، یعنی انسپکٹر، ڈی ایس پی اور ان سے بالاتر افسروں کا کام نہ صرف اپنے ماتحتوں کے کام کی نگرانی ہے بلکہ ان کے فرائض میں اپنے ماتحتوں کی راہنمائی اور قیادت بھی ہے۔ نگرانی، راہنمائی اور قیادت یہ لوگ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ان کی اپنی علمی سطح ان لوگوں سے بلند تر نہ ہو جن کی قیادت اور جن کے کام کی نگرانی اور راہنمائی انہیں کرنی ہوتی ہے۔

سیاسی مداخلت، پست تعلیمی سطح، نااہلیت، ہمارے نام نہاد ''لیڈروں'' کی پولیس کے روزمرہ کے کام کاج میں دخل اندازی اور اوپر درج کی گئی صورت حال کے پیشِ نظر ہمارے پولیس سسٹم پر رپورٹ مرتب کرتے ہوئے جاپانی پولیس افسروں کے مشن، جس کی قیادت سکے کینیچی (Sekiene Kenichi) کر رہے تھے، یہ تجویز پیش کی کہ:

ا۔ پولیس کے کام میں سیاسی غیر جانبداری اور جمہوری کنٹرول کو یقینی بنایا جائے اور

۲۔ پولیس کے ملازمین کی بھرتی اور انتخاب میں صرف قابلیت کو بنیاد بنایا جائے۔

یہاں تک تو پولیس کی تباہی میں بیرونی عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن اس محکمے کی بربادی کی اندرونی عوامل بھی ذمہ دار ہیں۔ نااہلیت، پیشہ ورانہ مہارت کا فقدان، بددیانتی، رشوت، عقوبت خانے، آئے دن کے پولیس مقابلے ایسے عوامل ہیں جو عوام کو نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ''درون خانہ'' بھی کچھ عوامل ہیں جن کی ایک صورت محکمانہ ہدایات کو نظر انداز کرنا ہے۔ مثلاً یہ محکمانہ ضابطہ ہے کہ ہر پولیس سٹیشن کا ہر سال چار دفعہ معائنہ کیا جائے اور اس معائنے کی رپورٹ افسران بالا کو ارسال کی جائے۔ معائنہ کرنے والا گزٹیڈ پولیس افسر ہوتا ہے۔ اس معائنے کے دوران پچھلے تین ماہ میں درج شدہ مقدمات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ مقدمات کی تفتیش صحیح خطوط پر کی جا رہی ہے یا نہیں۔ جہاں کہیں کوئی فروگزاشت ہو اس کا ازالہ کیا جاتا ہے اور تفتیش کنندہ کی راہنمائی بھی کی جاتی ہے۔ یہ بھی جائزہ لیا جاتا ہے کہ کہیں مقدمات میں کوئی جانبدارانہ روش تو اختیار نہیں کی گئی اور جھوٹی گواہیوں کا سہارا تو نہیں لیا گیا۔ پولیس والے مقدمہ کو مضبوط بنانے کے لیے اکثر ایسے اقدامات کرتے ہیں جو جھوٹی گواہیوں اور غلط برآمدگیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ تھانے کے معائنے کے دوران ان کا ازالہ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ پچھلی انسپکشن رپورٹ پر اعلیٰ افسران یعنی ڈپٹی کمشنر، ڈی آئی جی اور ایس پی کے احکامات کی تعمیل ہوئی

MashalBooks.org

ہے یا نہیں۔ اگر کہیں کوتاہی ہوئی تو اس کا ازالہ کیا جاتا ہے۔ تھانے میں پچیس رجسٹر ہوتے ہین اوران کا ایک ایک اندراج چیک کیا جاتا ہے۔اس سے تھانے کے متعلقہ افراد چوکس رہتے ہیں اور انہیں احتساب کا خوف رہتا ہے۔ ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ بھی کسی کو جوابدہ ہیں۔ علاقے کے سارے بدمعاشوں سے ملاقات بھی ہوتی ہے اور اگر پولیس نے کہیں زیادتی کی ہوتو اس کا بھی علم ہوجاتا ہے۔ یہ کارروائی تھانے کے متعلقہ افسران کو چوکس رکھنے کے لیے بڑی اہم ہوتی ہے۔ایک تھانے کے معائنے پر چار دن یعنی کم از 32 گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔

سردیوں کے دنوں میں تھانے کے معالے کے علاوہ اس کی حدود میں واقع دیہاتوں کا دورہ بھی کیا جاتا ہے اور متعلقہ ریکارڈ سب کی موجودگی میں چیک کیا جاتا ہے۔ دیہات کے نمبردار اور دوسرے اہم افراد سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں اور پولیس کی کارکردگی کا معروضی اندازہ بھی ہوجاتا ہے۔ اگر پولیس نے کسی سے زیادتی کی ہوتو اس کا بھی پتا چل جاتا ہے۔عوام اور پولیس کے روابط مضبوط ہوتے ہیں کیونکہ اس سارے سسٹم میں عوام ہی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہی جرائم کی اطلاع دیتے ہیں، وہی تمام کارروائی میں پولیس کی مدد کرتے ہیں۔ گواہیاں بھی وہی دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے تعاون کے بغیر پولیس اپنے فرائض صحیح طور پر سرانجام نہیں دے سکتی۔ ایسے موقعوں پر لوگوں کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ پولیس والوں سے بھی باز پرس ہوسکتی ہے۔

معائنے کی دوسری صورت تھانے کا اچانک معائنہ کرنا ہے۔ کوئی بھی گزیٹڈ افسر بغیر اطلاع کے تھانے میں پہنچ جاتا ہے اور تھانے کی جانچ پڑتال شروع کردیتا ہے۔ روزنامچے اور متعلقہ رجسٹروں کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بغیر ضروری قانونی کارروائی کے کوئی شخص تھانے میں بند تو نہیں۔ یہ رپورٹ افسران بالا یعنی ضلع کے سربراہ کے پاس جاتی ہے اور وہ اس پر ضروری کارروائی کا حکم دیتا ہے۔ایسے اچانک معائنوں سے پورا تھانہ چوکنا رہتا ہے اور پولیس کی غلط کاریوں کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔

ڈی آئی جی کے لیے بھی لازمی ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنے علاقے کے اضلاع کا معائنہ کرے۔ اس سے ضلع کے حکام کی باز پرس بھی ہوتی اور ضروری راہنمائی بھی حاصل ہوتی رہتی تھی۔لیکن یہ سب باتیں شاید اب قصہ پارینہ ہوچکی ہیں۔

ہماری پولیس کا کمزور ترین پہلو جرائم کا سراغ لگانا اور مقدمات کی تفتیش ہے۔ تفتیشی

MashalBooks.org

افسر عموماً ایک نیم خواندہ اے ایس آئی ہوتا ہے۔ اسے نہ قانون کا پورا پتا ہوتا ہے اور نہ وہ یہ جانتا ہے کہ تفتیش کے ابتدائی اقدامات کیا ہیں۔

قتل کے مقدمات کا سراغ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ مگر اس میں بھی ہماری پولیس کی کارکردگی بڑی حوصلہ شکن ہے۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق لاہور میں ایک ہفتے میں قتل کا ایک مقدمہ عدم پتہ ہوجاتا ہے۔ لاہور ہی تقریباً سات آٹھ سال پرانا ایک کیس ہے۔ اس میں تھانہ اسلام پورہ کے علاقے میں ایک ہی خاندان کے تیرہ آدمی قتل کردیئے گئے تھے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ وزیراعلیٰ نے حکم صادر فرمایا تھا کہ ملزموں کو بہتر گھنٹے کے اندر اندر گرفتار کیا جائے۔ مدعی نے بہتر گھنٹوں کی بجائے بہتر مہینے انتظار کیا اور کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر وہ بھی اللہ کو پیارا ہوگیا اور مقدمہ ابھی تک عدم پتا ہے۔

اس صورتحال پر تبصرہ کرنے سے پہلے چند مثالیں 1947ء سے پہلے کی تفتیش کی پیش کی جاتی ہیں۔

مرزا شفیع بیگ پچاس کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ڈی ایس پی تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ جب وہ لاہور میں سب انسپکٹر تھے تو لاہور ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹرنک آیا۔ اس کا والی وارث کوئی نہیں تھا چنانچہ اسے لاہور سٹیشن کے محافظ خانے میں داخل کردیا گیا۔ ایک دودن کے بعد محافظ خانے سے بدبو اٹھنی شروع ہوگئی۔ جب ٹرنک کھولا گیا تو اس کے اندر بوری کے ایک ٹکڑے میں لپٹی ہوئی ٹانگ برآمد ہوئی۔ اس پر مقدمہ درج کرلیا گیا۔

ایسی ہی ٹانگ دہلی ریلوے سٹیشن پر پہنچی اور برآمد ہوئی۔ وہاں بھی مقدمہ درج کرلیا گیا۔ نعش کا باقی حصہ انبالہ پہنچا اور وہاں بھی مقدمہ درج کرلیا گیا۔

اب تینوں مقدمات کو اکٹھا کرلیا گیا اور نعش کا باقاعدہ معائنہ ہوا۔ پتا چلا کہ نعش کسی عورت کی ہے جسے تیز دھار آلے سے قتل کیا گیا ہے اور اس کے ٹکڑے کرکے الگ الگ ٹرنکوں میں بند کرکے مختلف ریلوے سٹیشنوں پر بھجوادیا گیا ہے۔ ٹرنک کا لکاریلوے سٹیشن سے روانہ ہوئے تھے۔ بوری کے جن ٹکڑوں سے یہ اعضا برآمد ہوئے تھے وہ ایک ہی جیسے تھے۔ ان پر لکھائی بھی تقریباً ایک جیسی تھی اور سیاہی کا رنگ بھی ملتا جلتا تھا لیکن نعش کا سر غائب تھا جس سے مقتولہ کی شناخت مشکل ہوگئی تھی۔ یہ مقدمہ لاہور ڈسٹرکٹ پولیس کے حوالے کردیا گیا۔ تفتیش کرنے والے

MashalBooks.org

تجسس میں تھے کہ تفتیش کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ بوری کے ٹکڑوں سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ شاید اس بوری کا تعلق لاہور کی غلہ منڈی سے ہو۔سفید کپڑوں میں ملبوس تفتیشی عملہ غلہ منڈی پہنچا اور معلومات حاصل کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ بوری کے ٹکڑوں پر لکھائی سے (جولنڈے میں ہوا کرتی تھی) یہ اندازہ لگایا کہ یہ ایک خاص آڑھتی کی بوری ہے۔ اسی دوران گم شدہ لوگوں کے بارے میں بھی معلومات اکٹھی کی گئیں۔معلوم ہوا کہ وہ خاص آڑھتی چند دن پہلے اپنی بیوی کے ہمراہ شملے گیا تھا لیکن واپس اکیلے آیا ہے۔ بیوی اس کی شملے میں ہی ہے۔اس آڑھتی سے اس کی بیوی کا شملے میں پتا لیا گیا تو پڑتال پر معلوم ہوا کہ اس پتے پر اس کی بیوی موجود نہیں ہے۔اس پر اس کا جھوٹ پکڑا گیا۔مزید تفتیش پر اس نے اقبال جرم کرلیا۔نہ تشدد نہ تھرڈ ڈگری میتھڈ، نہ عقوبت خانے۔صرف ذہانت اور محنت۔

دوسرا واقعہ بنگال کی پولیس کے متعلق ہے۔ پولیس کے حلقوں میں یہ پکر ڈ رکیس کے نام سے مشہور ہے۔ پکر ضلع بردوان میں ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔اس کے وارث دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی ہی کرتا دھرتا تھا۔ کلکتے سے بردوان جاتے وقت اس نے ہاوڑا ریلوے سٹیشن پر محسوس کیا کہ اسے کوئی چیز چبھی ہے۔ لیکن وہاں بھیڑ اور افراتفری اتنی ہوتی ہے کہ اس واقعے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ دوران سفر اسے بخار چڑھ گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اسے طاعون ہو گیا اور چند دن بیمار رہ کر وہ مر گیا۔ اس کی بیوی کو خیال آیا کہ طاعون تو وبا کی صورت میں پھیلتا ہے۔اسے یہ اکیلا واقعہ بڑا عجیب اور غیر معمولی لگا۔ چنانچہ وہ پولیس کے پاس پہنچی اور مقدمہ درج کرا دیا۔

تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ متوفی کے چھوٹے بھائی کی ایک ڈاکٹر سے دوستی ہے۔ وہ ڈاکٹر بھلائی کے پاسچر انسٹیٹیوٹ میں برائے تربیت گیا تھا۔ وہاں اس کے قیام کے دوران انسٹی ٹیوٹ سے طاعون کے زندہ جراثیم والی ایک وائل گم ہو گئی تھی اور بڑی کوشش کے باوجود اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ پولیس کی شبہ ہوا کہ یہ وائل اسی ڈاکٹر نے غائب کی ہوگی۔ پوچھ گچھ کے دوران ڈاکٹر نے اقبال کیا کہ وہ وائل اس نے ہی غائب کی تھی اور ہاوڑا ریلوے سٹیشن پر جہاں ریل کے آنے جانے کے وقت بڑا ہجوم ہوتا ہے اس نے متوفی کے چھوٹے بھائی کے کہنے پر بڑے بھائی کو طاعون کا انجکشن لگا دیا تھا۔ اس کیس کی تفتیش کی مکمل کارروائی پولیس ٹریننگ کالج، ساردا کے پرنسپل کی میز پر پڑی رہتی تھی۔ان افسروں نے جن کی ٹریننگ وہاں ہوئی ہے شاید اس فائل کو

MashalBooks.org

دیکھا ہو۔

تیسری مثال لاہور کی ہے۔عبدالعزیز پولیس کے ڈی آئی جی تھے۔انہوں نے ایک مشتبہ شخص کے گھر سے چند چیونٹیاں اکٹھی کر کے ایک پڑیا بنائی اور جیب میں رکھ لی۔ اس پڑیا کو لیبارٹری میں بھیجا گیا تو معلوم ہوا کہ چیونٹیوں کے منہ میں انسانی گوشت کے ذرے ہیں۔ پولیس موقع پر پہنچی۔ چیونٹیوں کی لمبی قطار مخصوص جگہ کا پتا بتانے کے لیے کافی تھی۔فرش کھودا گیا اور نعش برآمد کر لی گئی۔ وہ مشتبہ شخص گرفتار ہوا اور قتل کا معمہ حل ہو گیا۔

ایک اور مثال: سی آئی ڈی کا ایک سپاہی دیال سنگھ کالج کے ہوسٹل کے قریب سے گزرا کرتا تھا۔ایک دن اس نے دیکھا کہ ہوسٹل کے ایک کمرے کی نالی سے زرد رنگ کا پانی نکل کر گٹر میں جا رہا ہے۔اس نے کوئی پروانہ کی۔ دوسرے دن بھی اس نے وہی زرد رنگ کا پانی دیکھا۔تیسرے دن وہ گھر سے ایک بوتل لایا اور پانی اس میں ڈال کر دفتر پہنچا۔ وہاں اس نے وہ پانی لیبارٹری میں بھیج دیا جنہوں نے بتایا کہ پانی میں گندھک کی آمیزش ہے۔ ہوسٹل پر چھاپا مارا گیا اور وہ لڑکے گرفتار کر لیے گئے جو بم بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

مجرم لوگ اکثر بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ واردات کے بعد وہ موقع پر اپنے نشانات نہ چھوڑیں۔ان کو پکڑنے کے لیے ان سے زیادہ نہیں تو کم از کم اتنے ہی ذہین لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری پولیس میں ایسے ذہین آدمیوں کی بڑی کمی ہے۔ سیاسی بنیادوں پر سفارش کے زور پر یا نوکری خرید کر بھرتی ہونے والے لوگوں میں نہ تو ضروری ذہانت ہوتی ہے اور نہ ہی ان میں ضروری جوش وجذبہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا اور اپنے محکمے کا نام روشن کریں۔آج جس قسم کی تفتیش پنجاب پولیس کر رہی ہے اس کا ذکر یہاں ضروری ہوتا ہو جاتا ہے۔ان واقعات کا راوی لاہور ہائی کورٹ کا ایک اہم افسر (جج نہیں) ہے۔

تھانہ شہر (ضلع مظفر گڑھ) کے سامنے سڑک پر قتل ہو گیا۔تفتیش شروع ہوئی۔مقتول کی شناخت نہیں کروائی گئی اور نہ ہی ابتدائی رپورٹ میں کسی ملزم کو نامزد کیا گیا۔ پولیس بڑی پریشانی کے عالم میں تھی کہ اس کیس سے کیسے نمٹا جائے۔ چنانچہ پولیس نے جنات کے ایک ماہر کو بلایا۔ اس نے انکشاف کیا کہ وقوعہ کے روز جنات کی برات سڑک پر سے گزر رہی تھی۔مقتول برات کے راستے میں آ گیا۔ چنانچہ جنوں نے اسے ہلاک کر دیا۔

دوسری مثال بھی اسی راوی کی زبانی ہے۔ان کے کہنے کے مطابق یہ واقعہ ضلع ملتان کا ہے اوراس واردات کا سراغ لگانے کے لیے عاملوں کو بلایا گیا۔

ہائی کورٹ کے اس افسر نے پولیس کارکردگی کے ایسے کچھ اور واقعات بھی بتائے جنہیں طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ہماری پولیس کی کارکردگی کا جائزہ بڑی آسانی سے لیا جاسکتا ہے۔

ہماری پولیس کے تفتیشی عملے کی کارکردگی مندرجہ ذیل خطوط پر ہوتی ہے۔

قتل کے مقدمات میں مقتول کی نعش کا نظری معائنہ ہماری پولیس نہیں کرتی۔ ایسا کرنا تفتیش کا لازمی جزو ہے جو کچھ ہماری پولیس کرتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ نعش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادیا جاتا ہے۔پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مقتول کے جسم پر ہر قسم کے تشدد کے نشانات ہوتے ہیں۔ چنانچہ مسل کا پیٹ بھرنے کے لیے تمام کوائف وہاں سے اٹھا لیے جاتے ہیں اور ضمنی مرتب کر کے افسران بالا کو بھیج دی جاتی ہیں۔ وہ افسران بھی تردد نہیں کرتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ مقتول کے جسم پر تشدد کے نشان وغیرہ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اٹھا لیے گئے ہیں اور تفتیشی افسر نے مقتول کی نعش کا مکمل طور پر جائزہ نہیں لیا اور نہ ان نشانات سے کوئی سراغ لگانے کی کوشش کی۔ جس ڈاکٹر کو موت کی وجہ کا تعین کرنا ہوتا ہے اسے اپنی ضرورت کے مطابق تو کوائف مل جاتے ہیں اور وہ رپورٹ مرتب کر لیتا ہے،لیکن پولیس کو بھی اسے اپنے نقطہ نظر سے دیکھنا ہوتا ہے کہ آیا قاتل ایک ہے یا دو ہیں ان سے زیادہ ہیں۔قتل سے پہلے کیا مقتول پر کوئی تشدد ہوا، کوئی گتھم گتھا ہونے کے نشانات ہیں۔ اگر تیز دھار آلہ ہے تو کیا زخم سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مقتول پر وار سامنے سے ہوا، یا پیچھے سے یا کسی اور طرف سے۔اور اگر آتشیں اسلحہ استعمال ہوا ہے تو اس کے متعلق زخم سے کیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس مقتول کے کپڑوں پر بارود کا داغ دھبہ ہے کہ نہیں جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ مقتول پر کتنی دور سے گولی چلائی گئی۔ان باتوں سے ہماری تفتیشی پولیس کو کوئی غرض نہیں۔مقتول کی نعش کو مردہ خانے بھجوانے کے بعد ان کا کام ختم ہو جاتا ہے۔

نعش کے مطالعے کے بعد اگلا مرحلہ جائے واردات کا بغور مطالعہ ہے۔ ہماری پولیس صرف جائے واردات کا نقشہ بنائے گی اور وہیں ان کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ جائے واردات پر ملزمان کے نشانات، فنگر پرنٹس، یا کسی اور غیر معمولی چیز کی تلاش نہیں کرتے۔تفتیش کا پہلا اصول

MashalBooks.org

یہ ہے کہ ہر واردات پر ملزم اپنے نشانات چھوڑ جاتے ہیں۔ انہیں تلاش کرنا تفتیش کرنے والوں کا کام ہے۔

ہماری پولیس کو ان کے ہاں قائم کردہ فورنزک لیبارٹری، فنگر پرنٹس بیورو کا کچھ علم نہیں اور نہ ہی انہوں نے ان سے کبھی کوئی امداد طلب کی۔

پولیس والوں نے اور خاص طور پر تفتیشی عملے نے پولیس سے ریٹائر ہونے والے عملے کو اپنے ہاں رکھا ہوا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا سارا کام وہی کرتے ہیں۔ نہ وہ جائے واردات پر جاتے ہیں، نہ گواہوں سے بیانات لیتے ہیں اور نہ ہی خود سراغ رسائی کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگ صرف تفتیشی عملے کی زبانی ہدایات پر مسل کا پیٹ بھر دیتے ہیں۔ افسران بالا کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ ایسی واردات ہو رہی ہے اور اگر ہو بھی تو اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پنجاب ہائی کورٹ اس امر کا نوٹس لے چکی ہے۔

قتل، مسلح ڈکیتی اور لائسنس والے اسلحے کی چوری سپیشل رپورٹ مقدمات ہیں اور علاقے کے انچارج گزیٹڈ افسر کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ جلد از جلد جائے واردات پر پہنچے اور تفتیش کی نگرانی کرے اور اس کی رپورٹ مرتب کر کے افسران بالا کو بھیجے۔ لیکن ضابطے کے اس نقطے کو پولیس بھلا چکی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جو کام تھانیدار کا ہے وہ کام آج کل ہمارے اے ایس پی اور ڈی ایس پی صاحبان کر رہے ہیں۔

انگریز کے زمانے سے تفتیش کا سائنسی طریقہ کار شروع ہو چکا تھا۔ لیکن اب اسے بالکل پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ تفتیشی افسران کو معلوم ہی نہیں کہ جرائم کے ماہرین سے کسی قسم کی امداد مل سکتی ہے۔ یہاں تک کہ انہیں نہ انگلیوں کے نشانات اٹھانے آتے ہیں اور نہ ہی انہیں معلوم ہے کہ ملزم کی شناخت کے لیے اگر ایسے نشانات اٹھا لیے جائیں تو وہ بڑے کارآمد ہو سکتے ہیں اور ان کی مدد سے ملزم کیفر کردار تک پہنچ سکتے ہیں۔

تفتیش ذہانت اور محنت کا تقاضا کرتی ہے۔ ہماری پولیس میں تعلیم اور ذہانت دونوں کی زبردست کمی ہے اور اگر کسی ماتحت عملے میں ذہانت ہے تو وہ غلط راستے پر لگی ہوئی ہے۔ مقدمات کی تفتیش اور تیاری کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں۔ وزرا کی فوج ظفر موج کی حفاظت بھی پولیس ہی کے ذمے ہے۔ پنجاب کے ایک وزیر اعلیٰ الحمرا آرٹس کونسل میں تشریف

لے گئے تو ان کے حفاظتی دستے میں پچاس پولیس والے تھے۔ ان میں کچھ کو ضلع شیخوپورہ سے طلب کیا گیا تھا۔ ایسے طلب کئے جانے والے ایک سب انسپکٹر نے بتایا کہ وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے مسلسل ڈیوٹی دے رہا ہے۔

لوگ آج قانون کی حکمرانی سے مطمئن نہیں۔ پولیس کی ناقص کارکردگی، جبر وتشدد، رشوت اور غیر معیاری پیشہ ورانہ مہارت کی بنا پر لوگ پولیس سے بدظن ہیں۔ پولیس پر سے لوگوں کا اعتماد ختم ہو گیا ہے اور یہ محکمہ اپنا وقار کھو چکا ہے۔ پولیس حکومت کا ایک اہم ادارہ ہے۔ اگر اس پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے تو حکومت بھی اپنا اعتماد کھو دیتی ہے اور بے توقیر ہو جاتی ہے۔ آج پاکستان اسی صورتحال سے دوچار ہے۔

حکومت پولیس کی اصلاح کے لیے گیارہ کمیٹیاں اور کمشن قائم کر چکی ہے۔ ان کے علاوہ چار بین الاقوامی کمشن بھی اس مقصد کے لیے بلائے گئے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کی سفارش یا اصلاحی تجویز کو ابھی تک عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔ آخر ایسا کیوں؟ جواب واضح ہے کہ پولیس مختلف حکومتوں کی آلہ کار بنی ہوئی ہے جو حکومت بھی اقتدار میں آتی ہے وہ پولیس کو اپنے مقاصد کے لیے ہر جائز اور ناجائز طریقے سے استعمال کرتی ہے۔ ان مقاصد میں اپنے سیاسی مخالفین پر جھوٹے مقدمے بنوانا، ان کو ناجائز طریقے سے تنگ کرنا، ان کی وفاداریاں تبدیلی کرنا شامل ہے۔ چنانچہ پوری جانچ پرکھ کے بعد اقوام متحدہ کے مطالعاتی کمشن کے سربراہ نارمن ان کیسٹر (Norman Inkestar) نے جو انٹرپول کے صدر رہ چکے ہیں، اپنی رپورٹ میں لکھا:

''پولیس کے موجودہ نظام کو یکے بعد دیگرآنے والی حکومتیں تباہ کرتی رہی ہیں۔ سیاسی سرپرستی کی بنا پر اس کا غلط استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہ محکمہ ابھی تک پوری طرح تباہ نہیں ہوا کیونکہ اس میں ابھی تک فرض شناس، پیشہ ورانہ مہارت کے حامل، راست اقدام کرنے کے اہل اور محکمے سے وفادار افسران اور دیگر اہل کار موجود ہیں اور وہ ایسے ہی جانے جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کو فوری طور پر مضبوط بنیادیں فراہم نہیں کی جاتیں تو یہ نظام ان افسران اور اہل کاروں کی بہترین کوششوں کے باوجود نہ صرف کراچی بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی بہت جلد تباہ ہو جائے گا۔''

یہ پیش گوئی 19۔ اپریل 1995ء میں کی گئی تھی اور آج یہ لفظ بلفظ پوری ہو رہی ہے۔ اللہ

MashalBooks.org

تعالیٰ پاکستان کے عوام پر رحم فرمائے۔

جرم اور مجرم کے موضوع پر علمی اور نظریاتی بحث میں پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دوسرے اداروں کی استعداد اور کارکردگی کا تجزیہ بظاہر غیر متعلق سا نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نظریاتی بحث کے ساتھ جب تک ان عوامل کا جائزہ نہیں لیں گے جو جرائم کا سبب بنتے ہیں اور مجرم پیدا کرتے ہیں اس وقت تک علمی مباحث کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہم علمی اور نظریاتی بحث میں دنیا بھر کے شہروں اور نظاموں کا احاطہ کر سکتے ہیں لیکن معروضی حقائق کے لیے ہمیں اپنے اردگرد سے ہی شواہد جمع کرنا پڑتے ہیں۔ پاکستانی پولیس کی کارکردگی کا یہ جائزہ اسی قسم کی ایک شہادت ہے۔

MashalBooks.org